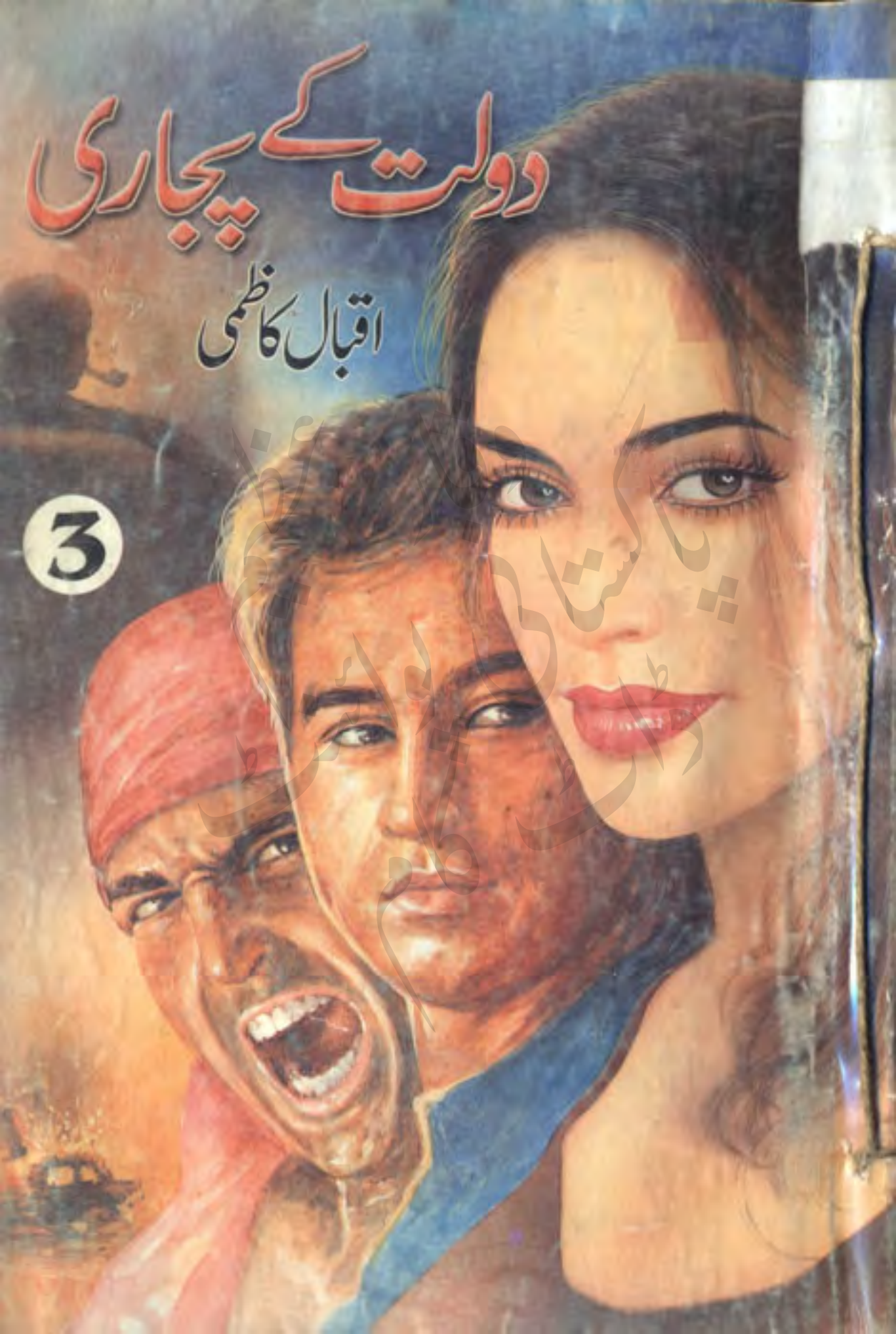


دولت کے پجاری

اقبال کاظمی

3



وہ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے کچھ دیر بعد اچھو تو سو گیا لیکن ماجھا گجر جاگتا رہا۔ وہ بار بار شارق کے بارے میں سوچنے لگتا۔ شارق ہی کی وجہ سے پچھلے چند دنوں کے دوران اسے کروڑوں کا نقصان اٹھانا پڑا تھا اور جو پانچ چھ بندے ضائع ہوئے تھے وہ اس کے علاوہ تھے۔ شارق کی حکمت عملی وہ سمجھ گیا تھا۔ وہ اسے نہ صرف مالی لحاظ سے بلکہ افرادی قوت کے لحاظ سے بھی کمزور کر رہا تھا۔ شارق کا منصوبہ واقعی بے حد خوفناک تھا وہ اسے بتدریج کمزور کر کے ختم کرنا چاہتا تھا۔ ماجھا سوچ رہا تھا کہ اگر شارق اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گیا تو ایک روزہ وہ (ماجھا گجر) سڑکوں پر بھیک مانگتا ہوا نظر آئے گا۔ وہ تو شارق کو اس کاروبار سے ہٹانا چاہتا تھا تا کہ اس کے بعد منشیات کی منڈی پر اپنی اجارہ داری قائم کر سکے۔ لیکن وہ شارق کا تو ابھی تک کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا البتہ اس کے اپنے قدم اکھڑنا شروع ہو گئے تھے۔

ماجھا گجر جیسے جیسے سوچتا اس کا ذہن الجھتا گیا۔ اور اب تو صورتحال یہ تھی کہ شارق کا خیال ذہن میں آتے ہی اس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ رات کے آخری پہر شارق ہی کے بارے میں سوچتے ہوئے دفعتاً اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اب وہ ایک نئے رخ پر سوچ رہا تھا۔

والے دروازے سے صحن میں داخل ہوا اور سیدھا باورچی خانے کی طرف چلا گیا جہاں ملازم پہلے ہی سے موجود تھی۔

تھوڑی دیر بعد عارفہ کی بیٹی سلطانہ بھی اپنے کمرے سے نکل کر آگئی۔ وہ دس گیارہ سال کی ایک پیاری سی بچی تھی۔ مانجھے گجر کو دیکھ کر وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی عارفہ اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی اور ماجھا، سلطانہ سے باتیں کرنے لگا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ماجھا اور اچھو وہاں سے رخصت ہو گئے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ لنڈا بازار کے قریب سلطان سرائے پہنچ گئے۔ یہاں زیادہ تر موٹروں کے درکشاپ تھے۔ اور انہی درکشاپوں میں چائے کی ایک دکان میں مانجھے کے ایک اجنٹ نے بھی ہیروئن کا اڈہ قائم کر رکھا تھا۔ یعقوب نائی یہ اجنٹ بھی رات کو شارق کے اڈے پر ہونے والی کارروائی میں شریک تھا۔

”کیا صورت حال ہے شریک؟“ ماجھا نے اس سے پوچھا۔

”رات کو پولیس نے شارق کے ڈیرے سے ایک لاش اٹھالی تھی۔ اس لاش کے علاوہ انہیں وہاں سے کچھ نہیں ملا تھا۔ البتہ دو سنتری وہاں کی نگرانی کے لئے کھڑے کر دیئے گئے ہیں لیکن شارق یا اس کے ساتھیوں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔“ یعقوب نے بتایا۔

”کوئی اور بات؟“ مانجھے نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ابھی تک تو کچھ پتہ نہیں چلا۔“ یعقوب نے جواب دیا۔

ماجھا گجر تقریباً دو گھنٹے تک وہاں بیٹھا رہا۔ اس دوران اس کاروبار سے تعلق رکھنے والے دو اور آدمی وہاں آئے تھے۔ مانجھے نے ان سے بھی معلومات حاصل کی تھیں لیکن کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔ شرمیں خاموشی تھی۔

ماجھا گجر جب سلطان سرائے سے رخصت ہوا تو سہ پہر کے پانچ بجتے والے تھے۔ وہ مختلف راستوں سے ہوتا ہوا چورجی کوارٹرز پہنچ گیا۔ گیٹ میں داخل ہونے کے بعد تھوڑی ہی دور جا کر اس نے سامنے سے آنے والے ایک شخص کو دیکھ کر گاڑی روک لی۔

”آپ بتا سکتے ہیں کہ شفاعت علی صاحب کہاں رہتے ہیں؟“ مانجھے نے اس آدمی سے پوچھا۔

”چوتھی لین میں دائیں طرف گراؤنڈ فلور کا آخری کوارٹر ہے۔ میرا خیال ہے وہ اس وقت گھر پر ہی ہوں گے۔ تھوڑی دیر پہلے انہیں آتے ہوئے دیکھا تھا۔“ اس شخص نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

مانجھے نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سرخ اینٹوں کی یہ لمبی لمبی عمارتیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ اس نے چوتھی لین میں گاڑی موڑ لی اور کوئے والے کوارٹر

کمرے کی کھڑکی سے دن کا ہلکا سا اجالا نظر آنے لگا تھا۔ ماجھارات بھر جاگتا رہا تھا۔ وہ ایک لمحہ کو بھی نہیں سو سکا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے سامنے آگیا اور کھڑکی کھول دی۔ تازہ ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ مکان کے پچھلی طرف سے مویشیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ماجھا گجر کی ساری زندگی گاؤں میں گزری تھی۔ بڑی دلچسپ زندگی تھی۔ صبح منہ اندھیرے اٹھنا۔ خاموش اور پرسکون فضا میں مویشیوں کے گھون میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں۔ لیکن وہ جب سے شہر آیا تھا تب کچھ بھول گیا تھا۔ شہر میں وہ رات کو دیر تک جاگتا اور صبح دیر تک سوتا رہتا۔ آج بہت عرصہ بعد وہ صبح سویرے تازہ ہوا میں سانس لیتے ہوئے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مکان کے پچھلی طرف وہ احاطہ تھا جہاں مویشی وغیرہ باندھے جاتے تھے۔ اس طرف سے مویشیوں کے ساتھ اب دو آدمیوں کے بولنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ دیہی علاقوں میں رہنے والوں کے لئے ایک نیا دن شروع ہو گیا تھا۔

ماجھا گجر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ دفعتاً اپنے عقب میں آہٹ سن کر وہ چونک گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کی بہن عارفہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے مانجھے کو دیکھ کر سلام کیا پھر بولی۔

”مجھے ابھی سوئے نے بتایا ہے۔ رات کو جب تم آئے تھے تو مجھے جگا لیا ہوتا۔“

”وہ ایسا وقت نہیں تھا کہ تمہاری نیند خراب کی جاتی۔“ مانجھے نے جواب دیا۔

”خیر تو ہے اتنی رات کو کیسے آئے تھے؟“ عارفہ نے پوچھا۔

”کسی کام سے شیخوپورہ گیا ہوا تھا۔ واپسی پر سوچا کہ یہاں کا بھی چکر لگاتا چلوں۔ رات کو دیر سے پہنچا تھا اس لئے میں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔“ ماجھا گجر نے جواب دیا پھر بولا۔

”سلطانہ کیسی ہے۔ اسکول جاتی ہے یا نہیں۔“

”دو تین دن سے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لئے اسکول بھی نہیں جا رہی۔ ابھی تو سو رہی ہے۔“ عارفہ نے جواب دیا۔ پھر قائلین پر سوئے ہوئے اچھو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ کون ہے؟“

”نوکر ہے سونے دو اسے۔ چلو۔ اندر چلتے ہیں۔“ مانجھے نے کہا اور عارفہ کے ساتھ مکان کے اندرونی حصے میں آگیا۔

برآمدے میں کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ انہی پر بیٹھ گئے۔ سامنے کشادہ پختہ صحن تھا۔ ایک دروازہ صحن کے دوسری طرف بھی تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد سودا دودھ کی باٹی اٹھائے ہوئے سامنے

کے سامنے گاڑی روک کر انجن بند کر دیا اور اچھو کو گاڑی میں بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتا ہوا نیچے اتر گیا اور دروازے پر کھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ ایک نوجوان تھا جو ابھی ہوئی نظروں سے مانجھے گجر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”شفاعت علی صاحب سے ملتا ہے۔“ مانجھے گجر نے کہا۔

وہ ٹینے کا بھائی ندیم تھا۔ وہ کچھ دیر تک ابھی ہوئی نظروں سے مانجھے کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”آپ بچپلی طرف سے آئیے۔ میں بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں۔“

ماجھا گجر کار میں بیٹھے ہوئے اچھو کو اشارہ کرتا ہوا بلاک کے اوپر سے گھوم کر پچپلی طرف آ گیا۔ اس طرف بیٹھک کا دروازہ تھا۔ ہر کوارٹر والے نے اپنے کوارٹر کے سامنے تاروں یا باڑھ سے حد بندی کر کے خوبصورت لان بنا رکھے تھے۔ اس کوارٹر کے سامنے بھی باڑھ کی حد بندی تھی اور آمد و رفت کے لئے لکڑی کے تختوں کا ایک دروازہ بھی لگا رکھا تھا۔ لان خوبصورت تھا۔ پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ لکڑی کا یہ پھاٹک غالباً لان کو بکریوں وغیرہ سے بچانے کے لئے لگایا گیا تھا۔

تقریباً ایک منٹ بعد وہی نوجوان بیٹھک کے دروازے سے باہر آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر لان والا پھاٹک کھول دیا اور مانجھے کو بیٹھک میں بٹھا کر اندر چلا گیا۔ ماجھا ایک کرسی پر بیٹھا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بیٹھک کے فرنیچر اور دیگر سامان سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔

تقریباً پانچ منٹ بعد ایک دیہڑ عمر آدمی اندرونی دروازے سے کمرے میں داخل ہوا۔ ماجھا گجر اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور آگے بڑھ کر اس شخص سے ہاتھ ملایا۔ وہ ٹینے کا باپ شفاعت علی تھا۔ وہ اجنبی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ ملا کر بیٹھ گئے اور خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ بالآخر شفاعت علی نے ہی اس خاموشی کو توڑا تھا۔

”میرا خیال ہے میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا ہے۔ بہر حال فرمائیے۔ آپ کس سلسلے میں شریف لائے ہیں؟“ شفاعت علی سوالیہ نگاہوں سے اسکی طرف دیکھنے لگا۔

”بات کچھ عجیب سی ہے۔“ ماجھا گجر کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”مجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح شروع کروں۔ میری بھی جوان بیٹی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ۔۔۔۔۔“

”آپ کھل کر بات کیجئے۔“ شفاعت علی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں آپ کی بیٹی ٹینے بی بی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“ مانجھے نے کہا۔

”آپ کا میری بیٹی کے معاملے سے کیا تعلق ہے؟“ شفاعت علی اسے گھور رہا تھا۔

”آپ شریف آدمی ہیں ٹینے بی بی کی شرافت میں بھی کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن بد قسمتی سے وہ غلط ہاتھوں میں پھنس کر خطرناک راستے پر چل نکلی ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ کون ہیں اور اس معاملے سے آپ کو کیا دلچسپی ہے۔“

”دیکھئے جی۔“ ماجھا گجر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”دلچسپی اور غرض نہ ہو تو کوئی کسی کے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاتا۔ اس معاملے سے میری بھی ایک غرض وابستہ ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ہم مل کر یہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔“

”ذرا وضاحت کیجئے۔“ شفاعت علی نے کہا۔

”ٹینے بی بی نادانستہگی میں فیصل آباد میں ایک ایسے آدمی کے جال میں پھنس گئی تھی جو منشیات کا ایک بہت بڑا اسمگلر ہے۔ وہ ایک خطرناک قاتل بھی ہے اسی وجہ سے ٹینے بی بی بعض سنگین کیسز میں ملوث ہو چکی ہے۔ وہ فیصل آباد پولیس کو قتل کے ایک کیس میں بھی مطلوب ہے۔ وہ چند روز پہلے لاہور میں بھی ایک آدمی کو قتل کر چکی ہے لیکن پولیس کو ابھی اس کے بارے میں اطلاع نہیں ملی۔ ٹینے بی بی اس وقت جس شخص کے جال میں پھنسی ہوئی ہے وہ بے حد خطرناک آدمی ہے۔ اس کی وجہ سے ٹینے بی بی بھی جرائم کی دلدل میں پھنسی جا رہی ہے۔“

شفاعت علی اس کی باتیں سنتا رہا پھر وہ ایک دم پھٹ پڑا۔ اس نے مانجھے کو پولیس کے حوالے کر دینے کی دھمکی تک دے ڈالی تھی ماجھا گجر خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ یہاں گرم مزاجی دکھانے سے معاملہ بگڑ جائے گا۔

”دیکھئے جناب۔“ وہ نرم لہجے میں بولا۔ ”میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں آپ کی مدد کرنے آیا ہوں آپ کو مزید پریشان کرنے نہیں۔ اگر آپ مجھ سے تعاون کریں تو نہ صرف آپ کی بیٹی واپس آ سکتی ہے بلکہ میں اس کے خلاف تمام کیسز بھی ختم کرا سکتا ہوں۔“

”آپ کیا چاہتے ہیں؟“ شفاعت علی نے کہا۔

”سنا ہے آپ نے ٹینے بی بی کو کسی آدمی کے ساتھ اس کالونی سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں

اس شخص کو جانتا ہوں۔ اس کا نام نوکھٹا ہے وہ فیصل آباد کا رہنے والا ہے۔ منشیات کا دھندہ کرتا

ہے اور ایک آدمی کو قتل کر کے فیصل آباد سے بھاگا ہوا ہے۔ فیصل آباد پولیس کو شبہ ہے کہ ٹینے

بی بی بھی قتل کے اس کیس میں ملوث ہے۔ وہ دونوں اس وقت لاہور میں موجود ہیں۔ ٹینے بی بی

شارق نامی ایک آدمی کی تحویل میں ہے جو روپوش ہے۔ میں یہ جانا چاہتا ہوں کہ ٹینے بی بی اور

نوکھٹا یہاں کس گھر میں ٹھہرے تھے۔ اگر اس کا پتہ چل جائے تو اس سے نوکھٹا کے بارے میں

معلوم کیا جا سکتا ہے۔

”اس کا نام ناصر علی ہے۔“ شفاعت علی نے جواب دیا۔ ”یہ ثبوت بھی مل گیا تھا کہ ٹینہ رات کو اس کے گھر میں رہی تھی۔ نوکھا اس کا رشتے دار ہے۔ پولیس نے ناصر علی کو پکڑا بھی تھا لیکن بعد میں چھوڑ دیا۔“

”کیوں... چھوڑ کیوں دیا؟“ ماجھا گجر نے پوچھا۔

”پولیس کے خیال میں وہ بے گناہ تھا اس لئے اسے چھوڑ دیا گیا۔“ شفاعت علی نے جواب دیا۔

ماجھا گجر کچھ دیر خاموش رہا پھر وہ دونوں پرسکون لمبے میں باتیں کرتے رہے۔ ماجھا گجر جب شفاعت علی کے کواٹر سے نکلا تو شام کے سات بج رہے تھے۔ واپس جاتے ہوئے اس نے ناصر علی کا کوارٹر بھی دیکھ لیا تھا۔

اس رات گیارہ بجے کے لگ بھگ ماجھا گجر کے آدمی ناصر علی کو اس کے گھر سے اٹھا لائے۔ ناصر علی کی عمر سینتالیس اڑتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دروازہ قائم دلا پتلا سا آدمی تھا ایک سرکاری دفتر میں ہیڈ کلرک تھا دفتر میں اور محلے میں بھی وہ بہت شریف آدمی سمجھا جاتا تھا۔ بائیس سالہ ملازمت میں اس نے ایک مرتبہ بھی اپنے افران یا کسی اور کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس کو آرڈر میں رہتے ہوئے بھی اسے تقریباً اٹھارہ سال ہو چکے تھے۔ محلے میں کسی سے بھی ان بن نہیں ہوئی تھی ہمیشہ دوسروں کے غم خوشی میں شریک رہتا۔ اپنے حسن سلوک سے اس نے اس کاٹونی میں بھی کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

نوکھا اس کی بیوی کلثوم کا ماموں زاد بھائی تھا۔ وہ فیصل آباد میں رہتا تھا۔ بہت شریف آدمی تھا اکثر لاہور آتا رہتا تھا اور ہمیشہ انہی کے ہاں ٹھہرتا تھا۔ لیکن پھر نجانے کیا ہوا کہ وہ نشہ کرنے لگا۔ راستے سے بھگ گیا۔ اس کی بیوی اور بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ وہ ہیروئن پیچنے لگا۔ اس نے خود تو نشہ کرنا چھوڑ دیا مگر وہ ہیروئن فروخت کر کے نوجوان نسل کو موت کے کنوئیں میں دھکیلنے لگا۔

نوکھا نے ناصر علی کے ہاں آنا جانا بہت کم کر دیا تھا۔ اور پھر چند روز پہلے وہ آدمی رات کو آیا تو اس کے ساتھ اسی کاٹونی میں رہنے والے شفاعت علی کی بیٹی بھی تھی۔ انہوں نے چوری چھپے رات یہاں گزاری اور پھر چلے گئے۔ مگر شفاعت علی نے انہیں ٹیکسی پر کاٹونی کے گیٹ سے نکلنے ہوئے دیکھا لیا تھا۔ اس نے پولیس میں بیٹی کے اغواء کی رپورٹ درج کرا دی اور نوکھا کا حلیہ بھی بتا دیا۔ پولیس کے لئے یہ معلوم کرنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا کہ ٹینہ اور نوکھا کاٹونی میں کس کے گھر سے گئے تھے۔ پولیس ناصر علی کو پکڑ کر لے گئی۔

اس کاٹونی میں چھوٹی موٹی باتیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں لیکن اس قسم کا سنگین واقعہ پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ شفاعت علی کی بیٹی فیصل آباد کے ایک کالج میں پروفیسر ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ ان دونوں فیصل آباد میں تھی۔ کاٹونی سے اس کے اغواء کی خبر سب کے لئے حیرت کا باعث بنی تھی۔ پھر یہ سوچا کہ ممکن ہے وہ اس شام فیصل آباد سے آئی ہو اور گھر پہنچنے سے پہلے ہی کسی نے اسے اغواء کر لیا ہو لیکن جب پولیس ناصر علی کو ٹینہ کے اغواء کے الزام میں پکڑ کر لے گئی تو لوگوں کو اس سے زیادہ حیرت ہوئی تھی اور پھر یہ بات بھی کسی معنی سے کم نہیں تھی کہ ٹینہ نے ایک رات کسی اور آدمی کے ساتھ ناصر علی کے گھر پر گزاری تھی۔ معاملہ بے حد پیچیدہ تھا اور لوگ اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔

ناصر علی کو تھانے لے جا کر ٹینہ اور نوکھا کے بارے میں سرسری سی باز پرس کی گئی۔ ابھی باز پرس جاری ہی تھی کہ علاقے میں کسی قتل کی اطلاع ملی اور ایس ایچ او پولیس پارٹی کو لے کر جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے محرم سے کہہ دیا تھا کہ ناصر علی کو حوالات میں بند کر دے۔ وہ واپس آکر اس سے باز پرس کرے گا۔

اور پھر رات دو ڈھائی بجے ایک آدمی اسے تھانے سے چھڑا کر لے گیا تھا۔ وہ آدمی اس کے لئے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا تھا۔ وہ اسے گھر چھوڑ کر گیا تھا۔ راستے میں نہ تو ناصر علی نے اس سے کچھ پوچھا تھا اور نہ ہی اس شخص نے خود اپنے بارے میں بتایا تھا۔ وہ اسے گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ دروازے پر اتارتے ہوئے اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ اب پولیس اسے پریشان نہیں کرے گی۔

اس واقعہ کو کئی روز گزر گئے تھے۔ پولیس نے واقعی اسے پریشان نہیں کیا تھا لیکن شفاعت علی سے اس کے تعلقات میں اچھی خاصی کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔

اور پھر آج رات وہ کلثوم کے ساتھ بیٹھائی دی دیکھ رہا تھا کہ دروازے کی کھنٹی بجی۔ وہ کمرے سے نکل کر باہر آگیا۔ اس نے جیسے ہی باہر کا دروازہ کھولا وہ آدمیوں نے اسے منہ کھولنے کا موقع دینے بغیر دبوچ کر سامنے کھڑی ہوئی کار میں بٹھا لیا۔ ان دونوں کے پاس پستول تھے۔ انہوں نے ناصر علی کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے شہر چلایا تو اسے گولی مار دی جائے گی۔ تیسرا آدمی اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی کار آگے بڑھا دی۔

یہ پولیس والے نہیں تھے۔ اگر پولیس والے ہوتے تو اسے اس طرح نہ اٹھاتے۔ وہ ان دونوں کے درمیان سینڈوچ بنا بیٹھا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا بھی تھا کہ وہ کون ہیں اور

مرضی ہی سے اس کے ساتھ مگنی تھی۔ اسے کسی نے اغواء نہیں کیا تھا۔
”نو لکھا اسے لے کر کہا گیا تھا؟“ ماجھا گجر نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ ناصر علی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس نے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔“

”اس کا کوئی ٹھکانہ تمہیں معلوم ہے؟“

”ہمارے کچھ رشتے دار ہیں جو شر کے مختلف علاقوں میں رہتے ہیں۔ لیکن نو لکھا ان میں سے کسی کے گھر نہیں جاتا۔ وہ لوگ اسے پسند نہیں کرتے۔“ ناصر علی نے جواب دیا۔

”اس کا کوئی دوست جہاں وہ رہ سکتا ہو۔“ مانجھے نے پوچھا۔

”اس کے دوست بھی منشیات بیچنے والے ہی ہیں۔ لیکن میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا۔“ ناصر علی نے کہا۔

”اس رات تمہیں تھانے سے کون چھڑا کر لایا تھا۔“ ماجھا گجر نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

”میں اس شخص کو نہیں جانتا۔ اس رات میں نے زندگی میں پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ وہ مجھے تھانے سے چھڑا کر گھر چھوڑ گیا تھا اور کہا تھا کہ پولیس اب مجھے پریشان نہیں کرے گی۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص رات دو ڈھائی بجے تمہیں پولیس سے چھڑا کر لایا ہو۔ اس کے لئے اس نے پانچ دس ہزار روپے رشوت بھی دی ہو گی اور تم اسے نہیں جانتے۔“ ماجھا گجر نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”میں قسم کھا کر کہتا ہوں میں اسے نہیں جانتا۔“ ناصر علی نے کہا۔

”اس کا حلیہ کیا تھا؟“ گجر نے پوچھا اور ناصر علی نے جو حلیہ بتایا اسے سن کر ماجھا گجر کے اونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

”چھا بھئی ناصر علی!“ ماجھا گجر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سامنے آگیا۔ ”بات یہ ہے کہ مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ نو لکھا کہاں چھپا ہوا ہے۔ اب تک تو میں تم سے بڑی محبت سے باتیں کرتا رہا ہوں۔ لیکن اب میں اپنی زبان سے بات کروں گا۔ زبان سے زیادہ میرے اور ان دونوں کے ہاتھ چلیں گے۔ میں تمہیں سوچنے کے لئے صرف ایک منٹ دے رہا ہوں۔ اگر تم نے نو لکھا کا ٹھکانہ بتا دیا تو ٹھیک ہے۔ بصورت دیگر تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہو گا تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”مم.... میں سچ کہتا ہوں۔ میں کچھ نہیں جانتا کہ نو لکھا کہاں ہے؟“ ناصر علی نے جواب دیا۔

اسے کہاں لے جا رہے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے جواب نہیں دیا تھا۔ ایک مرتبہ اس ذہن میں یہ خیال بھی ابھرا تھا کہ اسے شفاعت علی نے تو اس طرح اغواء نہیں کروایا تھا۔ شفا علی کے اس قسم کے لوگوں سے تعلقات نہیں تھے لیکن معاملہ اس کی بیٹی کا تھا اور وہ کچھ بھی سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے دل میں یہ بات آئی ہو کہ پولیس نے تو اسے شاید رشوت سے چھوڑ دیا تھا اور اب وہ اسے بد معاشوں کے ذریعے اغواء کر کے خود اس سے بیٹی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔

۱۶

کار شہر کی مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی گلبرگ والی نہر کے کنارے ایک شاندار کوشی داخل ہو گئی۔ ناصر علی کا خیال تھا کہ یہاں اسے شفاعت علی سے سامنا کرنا پڑے گا مگر شفاعت کے بجائے ایک اور آدمی اس کا منتظر تھا۔ وہ ماجھا گجر تھا۔

”اس رات نو لکھا ٹینے کو لے کر تمہارے گھر آیا تھا؟“ ماجھا گجر نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ ناصر علی نے جواب دیا۔ ”لیکن میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ ٹینے تمہارے ہی محلے میں رہنے والے ایک آدمی کی بیٹی ہے۔“ مانجھے نے اسے گھورا۔

”میں جانتا تھا۔“ ناصر علی نے کہا۔ ”پہلے میں یہ سمجھا تھا کہ نو لکھا اسے اغواء کر کے لایا ہے۔

میں نے اور میری بیوی نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے گھر چلی جائے یا ہم خود اسے چھوڑ آئے ہیں لیکن ٹینے نے ہمیں منع کر دیا تھا اور ہمارے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے کہ اس کے گھر والوں! محلے میں کسی کو بھی پتہ نہ چلے کہ وہ یہاں موجود ہے بعد میں مجھے نو لکھا نے بتایا تھا کہ وہ کسی کینس میں فیصل آباد پولیس کو مطلوب ہے اور پولیس سے بچنے کے لئے بھاگ کر آئی ہے۔“ اپنے کسی اور جاننے والے کے ہاں جانا چاہتی تھی اور نو لکھا اسے چھوڑنے آیا تھا۔

”وہ کس کے پاس جانا چاہتی تھی؟“ ماجھا گجر نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ ناصر علی نے جواب دیا۔ ”نو لکھا صبح سویرے ہی کہیں چلا گیا تھا اور پاؤں ساڑھے پانچ بجے کے لگ بھگ آکر اسے لے گیا تھا۔ لیکن ٹینے کے باپ نے راستے میں انہیں دیکھ لیا۔ اس نے پہلے انہیں روکنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور بعد میں رپورٹ لکھوا دی کہ اس کی بیٹی کو اغواء کر لیا گیا ہے۔ پولیس نے یہ معلوم کر لیا کہ وہ میرے گھر سے گئے تھے۔ پولیس والے مجھے پکڑ کر لے گئے میں نے پولیس کو سب کچھ بتا دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ ٹینے اپنے گھر نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنے مرضی سے نو لکھا کے ساتھ فیصل آباد سے آئی تھی اور اپنی

”تمہارے پاس پینتالیس سینکڈ باقی ہیں۔ اچھی طرح سوچ لو۔“ ماجھا گجر نے کلائی پر بندھ ہوئی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”مم۔ میں کچھ... نہیں جانتا۔“ ناصر علی ہکھلایا اس کے چہرے پر خوف ابھر آیا تھا۔

”تمہارے پاس وقت ختم ہو چکا ہے۔“ ماجھا گجر نے کہا۔ ”اب ہم اپنی زبان میں بات کریں گے۔“ اس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ ”گلو! جب تک یہ نوکھا کا پتہ نہ بتائے اس وقت تک اس کی ٹھکانی کرتے رہو۔ اور تم بھی ایک بات یاد رکھو۔ میں انکار نہیں سنتا چاہتا تمہیں اجازت ہے کہ جو طریقہ پسند کرو استعمال کرو۔“

”کیوں لوئے کانگری پہلوان۔ کیا ارادہ ہے؟“ گلو نے تلے قدم اٹھاتا ہوا ناصر علی کے سامنے آگیا۔

”مم۔ میں کچھ نہیں جانتا۔“ ناصر علی رو پڑا۔

گلو چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اچانک ہی اس نے ناصر علی کے منہ پر زور دار گھونہ مار دیا گھونہ منہ پر سانے لگا تھا ناصر علی کو یوں لگا جیسے کسی وزنی ہتھوڑے سے ضرب لگائی گئی ہو۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔ اس کے سامنے کا ایک دانت ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ نکلا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے گر گیا تھا۔

”ابھی صرف ایک دانت ٹوٹا ہے۔“ گلو اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں تو تمہارے سارے دانت اس طرح توڑنے کے بعد تمہارے ہاتھوں اور پیروں کے ناخن اکھاڑ دوں گا اور اگر اس کے بعد بھی تم نے زبان نہیں کھولی تو تمہارے جسم سے گوشت کے ٹکڑے کٹ کٹ کر باہر کتوں کو ڈال دیئے جائیں گے۔ اندر آتے ہوئے وہ کتے تو دیکھے تھے نا تم نے... بڑے خوشخوار ہیں۔ انسان کا گوشت بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔“

”مم۔ میں سچ کہتا ہوں۔ میں کچھ نہیں...“

”میں یہ الفاظ نہیں سنتا چاہتا۔“ گلو نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھالیا اور دوسرے ہاتھ سے ایک بار پھر اس کے منہ پر زور دار گھونہ مارا۔

ناصر علی بری طرح چیخا اس کے سامنے کا ایک اور دانت ٹوٹ گیا تھا۔ گلو نے اس کے بال چھوڑ کر اس مرتبہ اس کے کان پر گھونہ مارا۔ ناصر علی چکرا کر گرا ایک لمحہ کو اسے یوں لگا جیسے اس کے کان میں بموں کے دھماکے ہو رہے ہوں وہ فزع ہوتے ہوئے بکری کی طرح بلبلایا اور فرش پر گر کر تڑپنے لگا اس کے کان کا پردہ پھٹ گیا تھا اور خون بہہ نکلا تھا۔

اور پھر گلو کے ہاتھ پیر چلتے رہے۔ ناصر علی کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں گلو کی

ٹھوکریں اور گھونے نہ پڑ رہے ہوں ناصر علی پانی سے نکلی ہوئی پھیلی کی طرح تڑپ رہا تھا لیکن پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

”اسے ہوش میں لاؤ اور معلوم کرو نوکھا کہاں ہے۔“ ماجھا گجر نے کہا۔ ”نوکھا اس کا رشتہ دار ہے اور نوکھا یقیناً یہ جانتا ہے کہ شارق اور ثینہ کہاں ہوں گے۔“

وہ ناصر علی کو آدھے گھٹنے بعد ہوش میں لانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ تشدد کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا اس مرتبہ گلو پلاس سے اس کے ہاتھوں کے ناخن اکھاڑنے لگا۔ لیکن ناصر علی اس مرتبہ زیادہ دیر تک تشدد برداشت نہ کر سکا اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد ایک بار پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔ وہ لوگ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے لیکن اس مرتبہ کامیاب نہیں ہو سکے... وہ ختم ہو چکا تھا۔

”اس کی لاش یہاں سے دور لے جا کر نر میں پھینک دو۔“ ماجھا گجر نے کہا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ سفاکی تھی۔

کچھ دیر بعد گلو اور دوسرا آدمی ناصر علی کی لاش بوری میں ڈال کر لے گئے اور ماجھا گجر خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ نوکھا، شارق اور ثینہ کو کیسے تلاش کرے۔ اب تک اس کی ہر کوشش ناکام رہی تھی اور کم از کم چار آدمی اس چکر میں اس کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے مگر اسے مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ ہر کوشش میں ناکامی کے بعد اس کی مایوسی میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا اور اس وقت بھی اس کا چہرہ مایوسی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

○

شفاعت علی عجیب صورت حال سے دوچار تھا۔

ثینہ نے جو قدم اٹھایا تھا اس سے وہ کسی کو منہ دکھانے کے قاتل نہیں رہا تھا۔ وہ نہ صرف اس محلے میں بلکہ پورے خاندان میں کسی کو منہ دکھانے کے قاتل نہیں رہا تھا۔ جب پہلی مرتبہ کالونی کے گیٹ پر ثینہ سے آمنا سامنا ہوا تھا اس وقت اگر وہ اس کے ساتھ گھر آ جاتی تو شاید یہ بات زیادہ نہ پھیلی اور وہ کوشش کر کے دیگر مسائل پر بھی قابو پاسکتا تھا لیکن ثینہ تو اس کے ہاتھ ہی نہیں آئی تھی۔ بالآخر مایوس ہو کر اس نے پولیس میں ثینہ کے اغواء کی رپورٹ لکھوا دی۔

شفاعت علی نے رپورٹ میں واضح طور پر یہ لکھوایا تھا کہ اس کی بیٹی فیصل آباد کے ایک گریڈ کالج میں پروفیسر ہے۔ شاید وہ چھٹی پر گھر آئی تھی لیکن گھر پہنچنے سے پہلے ہی اسے اغواء کر لیا گیا۔ لیکن جب پولیس نے تحقیقات شروع کی تو معاملہ ہی کچھ اور نکلا۔ شفاعت علی کے لئے یہ انکشاف خاصا سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کہ ثینہ نے رات اسی کالونی میں ناصر علی نامی ایک شخص کے

ٹینے کے دروازے پر خون کے نشاں ملے تھے اور شبہ تھا کہ وہ زخمی مفور اس گھر میں پناہ لئے ہوئے ہے۔ لیکن ٹینے بی بی نے صاف طور پر کہہ دیا کہ یہاں کوئی نہیں آیا۔

محلے والوں کی اطلاع کے مطابق بعد میں ایک نوجوان کو ٹینے کے گھر میں دیکھا گیا جسے ٹینے نے اپنا کزن بتایا کہ وہ کاروباری سلسلے میں لاہور سے آیا ہوا ہے۔ وہ نوجوان کئی روز وہاں رہا۔ پھر ٹینے بی بی اچانک ہی وہ مکان چھوڑ کر طارق آباد کی ایک کونٹری میں منتقل ہو گئی۔

اس دوران یوسف مکینک کے قتل کی تفتیش کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ اس قتل میں ٹینے بھی ملوث ہو سکتی ہے اور اب ہم اس کو ٹیپے تو پتہ چلا کہ ٹینے ایک آدمی کے ساتھ کار میں بیٹھ کر کیس جا چکی ہے۔ یہ بات ہمیں سامنے والی کوٹھی میں رہنے والے ایک شخص نے بتائی تھی جو اتفاق سے اس وقت اپنی کوٹھی کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں اس شخص نے ٹینے کے ساتھ کار میں دوسرے شخص کو بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ فیصل آباد کا بدنام منشیات فروش نوکھا تھا۔

ہو سکتا ہے مکینک یوسف کے قتل میں ٹینے بی بی ملوث نہ ہو اور اپنے گھر میں پناہ دینے والے زخمی لڑکے کی دھمکیوں میں آکر اس نے اپنی زبان بند رکھی ہو لیکن ٹینے کا اس طرح فرار ہونا اسے قانون کی نظروں میں مشتبہ بنا رہا ہے۔ ہم نے آج صبح ہی ٹینے کے کالج سے یہاں کا ایڈریس لیا تھا لیکن جب متعلقہ تھانے میں پہنچے تو صورت حال کچھ زیادہ ہی سنگین نکلی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ سب کیا ہے؟ آپ کو اپنی بیٹی کے ان سرگرمیوں کے بارے میں پہلے سے کوئی علم تھا؟

”اگر مجھے اس پر کسی قسم کا شبہ ہوتا تو میں اس کی نوکری چھڑوا کر گھر لے آتا۔“ شفاعت علی نے جواب دیا۔ ”مجھے تو خود بھی حیرت ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ اس نے تو ہمیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ ہاں ایک بات مجھے یاد آ رہی ہے چند ہی روز پہلے اس نے مجھے خط لکھا تھا کہ میں ایک دو روز کے لئے اس کے پاس آ جاؤں وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہے۔ میں فیصل آباد گیا تھا لیکن میرے پوچھنے پر بھی اس نے کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ شاید اس نے ارادہ بدل دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اواس ہو گئی تھی، اس نے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ اس کی ایک دوست اپنے والدین کے ساتھ ملک سے باہر جا رہی ہے۔ وہ کم از کم دو سال تک ملک سے باہر رہیں گے۔ وہ اپنی کوٹھی کسی کو کرائے پر نہیں دینا چاہتے نہ ہی خلی چھوڑنا چاہتے ہیں۔ ٹینے کے بقول انہوں نے پیش کش کی تھی کہ اگر وہ چاہے تو ان کی عدم موجودگی میں اس کو ٹیپے میں رہ سکتی ہے۔ ٹینے نے مجھ سے اجازت مانگی تھی۔“

گھر میں گزاری تھی۔ ناصر علی اور اسکی بیوی نے یہ بیان دیا تھا کہ ٹینے آدمی رات کے بعد نوکھ کے ساتھ آئی تھی۔ وہ اپنے گھر جانے کو تیار نہیں تھی بلکہ اس نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ اس کلاونی میں کسی کو اس کے بارے میں پتہ نہیں چلنا چاہئے۔

پولیس ناصر علی کو لے گئی تھی لیکن آدمی رات کے بعد وہ واپس آ گیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ مقامی پولیس سے اس سلسلے میں دریافت کرتا کہ ناصر علی کو کیوں چھوڑا گیا ہے کہ فیصل آباد پولیس کے دو آدمی اس کے گھر پہنچ گئے۔ ان میں ایک اے ایس آئی تھا دو سرا کانسیبل۔ ان کے ساتھ مقامی پولیس اسٹیشن کا ایک کانسیبل بھی تھا۔ شفاعت علی نہیں سمجھ سکا تھا کہ فیصل آباد کی پولیس کیوں آئی ہے لیکن جو انکشاف ہوا وہ خاصا سنسنی خیز تھا۔

”کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی بیٹی ٹینے بی بی فیصل آباد میں بعض ناپسندیدہ سرگرمیوں میں ملوث رہی ہے۔“ اے ایس آئی نے کہا۔

”نہیں، میری بیٹی ایسا نہیں کر سکتی۔“ شفاعت علی نے کہا۔ ”وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ کالج میں پروفیسر ہے۔ اچھے برے کی تمیز کر سکتی ہے۔ وہ اس قسم کی کوئی بات نہیں کر سکتی جس سے اس کی اپنی یا اس کے ماں باپ کی عزت پر حرف آتا ہو۔“

”لیکن وہ ایسا کر چکی ہے۔“ اے ایس آئی نے کہا۔ ”چند روز پہلے پولیس نے قبرستان میں قائم منشیات کے اڈے پر چھاپہ مارا تو وہاں سے ٹینے بی بی کی ایک کتب اور ایک رجسٹر ملا تھا۔ جس پر ان کا اور کالج کا نام تحریر تھا۔ رابطہ قائم کرنے پر ٹینے بی بی نے ایک عذر پیش کر دیا جسے وقتی طور پر تسلیم کر لیا گیا لیکن آپ جانتے ہیں کہ پولیس آسانی سے کسی بات پر یقین نہیں کرتی۔ ہماری تفتیش جاری رہی اسی دوران اس منشیات کے اڈے سے متصل ایک ورکشاپ کے مالک محمد یوسف کو قتل کر دیا گیا۔ یہ قتل نوکھا نامی ایک شخص نے کیا تھا لیکن تفتیش کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ جس روز منشیات کے اڈے پر چھاپہ پڑا تھا اس وقت ٹینے بی بی اس اڈے پر موجود تھی اور اپنی کتب اور رجسٹر بھول کر اس ورکشاپ کی طرف سے فرار ہوئی تھی اور یوسف نامی اس موٹر مکینک نے فرار میں اسکی مدد کی تھی مزید تفتیش پر یہ انکشاف ہوا کہ محمد یوسف نے ٹینے کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس کے گھر گیا تھا۔ اس سے اگلے روز اسے بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔

پولیس کی تحقیقات جاری رہیں اور مزید انکشافات ہوتے چلے گئے۔ ایک یہ دلچسپ انکشاف بھی ہوا کہ اس سے کئی روز پہلے ٹینے نے ایک ایسے شخص کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی جو اس علاقے میں ایک قتل کر کے بھاگا تھا۔ وہ زخمی تھا اور پولیس اس کے تعاقب میں تھی۔ پولیس کو

”آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہ کوٹھی کسی آدمی نے ٹینے کے نام پر کرائے تھی اور ایک سال کا کرایہ بھی ایڈوانس دیا گیا تھا۔“ اے ایسی آئی نے کہا۔
”مجھے اس سلسلے میں کوئی علم نہیں۔“ شفاعت علی نے کہا۔

”دیکھئے شفاعت صاحب۔“ اے ایس آئی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔
”ہو سکتا ہے کہ ٹینہ بی بی اس شخص کی دھکیوں سے خوفزدہ ہو کر ان لوگوں کا ساتھ دے پر مجبور ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر ٹینہ بی بی اب بھی اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دے تو اس کے بچنے کے امکانات ہیں۔ اس کا دفاع کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ براہ راست کسی جرم یا ملوث نہیں ہے تو قانون اسے تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ٹینہ بی بی کے لئے بڑی کمی ہے کہ وہ خود پیش ہو جائے۔ اگر آپ کو شش کریں تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔“
”میں کیسے کو شش کر سکتا ہوں۔“ شفاعت علی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ میرے منہ پر کالک مل کر پتہ نہیں کھل چلی گئی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اے ایس آئی نے کہا۔ ”آپ اپنی طرف سے کو شش جاری رکھئے ہم اپنی کو شش جاری رکھیں گے۔ ٹینہ کے حق میں بہتر تو یہی ہے کہ وہ خود پیش ہو جائے۔ اس طرح قانونی طور پر اسے کچھ رعایتیں بھی مل سکتی ہیں۔ اگر پولیس اسے گرفتار کرے گی تو بات دوسری ہوگی۔“

شفاعت علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس والے چلے گئے تھے۔ لیکن شفاعت علی کو انگڑوں میں دھکیل گئے تھے۔ ٹینہ کے بارے میں اے ایس آئی کے اصرار و یقینا بہت سنسنی خیز تھے۔

ٹینہ نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد جب کالج میں ملازمت کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو شفاعت علی نے اس کی مخالفت کی تھی۔ لیکن ٹینہ کی ضد اور ماں کی حمایت کی وجہ سے اسے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی پڑی تھی۔ ایک سال لاہور میں ملازمت کے بعد جب ٹینہ کا تبادلہ فیصل آباد ہو گیا تو شفاعت علی نے اس وقت پھر مخالفت کی تھی۔ لاہور میں رہتے ہوئے ملازمت کرنا اور بات تھی لیکن وہ جوان بیٹی کو شہر سے باہر نہیں بھیجنا چاہتا تھا لیکن ٹینہ کی ماں پھر آڑے آئی تھی اس کا موقف تھا کہ فیصل آباد میں ان کے کئی رشتہ دار تھے۔ وہ اس کا خیال رکھیں گے۔

ٹینہ چند ہفتے بعض رشتہ داروں کے ہاں رہی پھر اس نے الگ مکان لے لیا تھا۔ کبھی شفاعت علی اور کبھی ان کا بیٹا ندیم فیصل آباد کے چکر لگاتا رہتا تھا لیکن شفاعت علی کو کیا پتہ تھا کہ

ان کی بیٹی کسی ایسے چکر میں پھنس جائے گی جو انہیں تباہی کی طرف لے جائے گا۔

کئی روز گزر گئے تھے۔ ٹینہ کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ اور نہ ہی اس آدمی کا پتہ چلا تھا جسے اس روز ٹینہ کے ساتھ ٹیکسی میں دیکھا گیا تھا۔

ٹینہ کی ماں تو رو رو کر پاگل ہو گئی تھی۔ اس نے تو گھر سے لکنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ نکلتی بھی کیسے اس صدمے نے تو اسے چارپائی پر ڈال دیا تھا۔ ٹینہ کا بھائی ندیم بھی کالج سے آنے کے بعد بہت کم گھر سے باہر نکلتا تھا۔ اس نے بھی دوستوں سے ملنا ملنا چھوڑ دیا تھا۔ ظاہر ہے اس میں کسی کی باتیں سننے کی تاب نہیں تھی۔ شفاعت علی بھی دفتر سے آنے کے بعد گھر ہی میں محدود ہو کر رہ جاتے۔

اور آج ماجھا گجربائی وہ شخص اسے ایک نئی کہانی سنا گیا تھا۔ اسکے کہنے کے مطابق ٹینہ لاہور میں تھی اور منشیات کے ایک بہت بڑے اسمگلر کے ساتھ رہ رہی تھی اور ماجھا گجر کے کہنے کے مطابق وہ ایک آدمی کو اپنے ہاتھوں سے قتل بھی کر چکی تھی۔ ماجھا گجر کی باتیں سن کر شفاعت علی کانپ اٹھا تھا۔ اگر فیصل آباد کے اے ایس آئی کے کہنے کی مطابق ٹینہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر بھی دے تو اب اس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ماجھا گجر کو شفاعت علی نہیں جانتا تھا لیکن اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی کوئی اچھا آدمی نہیں تھا اور کسی خطرناک ارادے سے ہی یہاں آیا تھا۔

اس رات شفاعت علی ایک لمحہ کو نہیں سو سکا تھا۔ وہ رات بھر ٹینہ کے بارے میں سوچتا رہا کہ وہ ان جرائم پیشہ لوگوں کے چنگل میں کس طرح پھنس گئی تھی۔ وہ تو ایسی لڑکی نہیں تھی۔ یہ بھی نہیں سوچا جاسکتا تھا کہ وہ کسی نشے کی عادی ہو گئی ہوگی۔ اسے تو ہر قسم کے نشے سے شدید نفرت تھی۔ شفاعت علی کو اچھی طرح یاد تھا کہ ایک سال پہلے ٹینہ نے اپنے چھوٹے بھائی ندیم کو سگریٹ پیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے وہ دھنبا کی تھی اس کی کہ اس کے بعد ندیم نے کبھی سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

صبح آٹھ بجے شفاعت علی دفتر جانے کے لئے تیار ہوئے تو پتہ چلا کہ موٹر سائیکل کا پچھلا پیہ پچھڑ ہے۔ ندیم کالج جا چکا تھا ورنہ وہ اس کو پچھڑ لگوانے کے لئے بھیج دیتے۔ سمن آباد موٹر پر پچھڑ لگانے والی ایک دکان تھی۔ شفاعت علی موٹر سائیکل کو گھسیٹتے ہوئے وہاں تک لے گئے۔ دکان ایک ہی تھی اور تین گاڑیاں پہلے ہی سے موجود تھیں اور کام کرنے والا بھی ایک ہی آدمی تھا۔ اس طرح جب شفاعت علی کی موٹر سائیکل تیار ہوئی تو دس بجتے والے تھے۔ دفتر سے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر چوہدری کی طرف روانہ ہو گئے۔ اے جی آفس کا راستہ چوہدری ہی سے ہو

کر گزرتا تھا۔

چوہدری کا چوک پار کر کے وہ جیسے ہی چند گز آگے نکلے ان کی بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف نظر اٹھ گئی۔ ایک لڑکی پیٹن شرٹ میں ایک آدمی کے ساتھ کھڑی تھی۔ بال مردانہ وضع کے کئے ہوئے تھے۔ دولت مند گھروں کی لڑکیاں فیشن کے نام پر نجانے کن رستوں پر چل نکلی تھیں۔ لیکن جیسے ہی وہ چند گز آگے نکلے شفاعت علی کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ پیٹن شرٹ میں ملبوس اس لڑکی کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا تھا۔ انہوں نے موٹر سائیکل روک لی اور لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے موٹر سائیکل واپس موڑ کر اس لڑکی کے طرف بڑھنے لگے۔ شفاعت علی کے چہرے پر اس وقت بڑے عجیب سے تاثرات تھے جنہیں کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ وہ اس لڑکی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

وہ ٹہینہ تھی!

○

باپ کو سامنے دیکھ کر ٹہینہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ شفاعت علی موٹر سائیکل سے اتر کر بڑی تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ اس کا جارحانہ انداز دیکھ کر ٹہینہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ شفاعت علی نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ٹہینہ کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے اپنے باپ کی شفقت بھری گرفت تو کئی مرتبہ محسوس کی تھی لیکن یہ گرفت مختلف تھی۔ لگا تھا جیسے اس کی کلائی آہنی شکنے میں کس دی گئی ہو۔

”تت... تم...“ شفاعت علی کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے غالباً غصے اور جذبات کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

شارق اس وقت ٹہینہ سے دو قدم ہٹ کر کھڑا تھا۔ وہ دائیں طرف سے آنے والے ایک خالی رکشے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن غراہٹ کی آواز سن کر وہ پیچھے پلٹا اور پھر صورت حال دیکھ کر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ شفاعت علی کو نہیں جانتا تھا لیکن ٹہینہ کو خوفزدہ انداز میں ایک آدمی کی گرفت میں دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ طے سے وہ آدمی شریف ہی نظر آ رہا تھا لیکن اس نے جس طرح ٹہینہ کو گرفت میں لیا تھا وہ انداز شریفانہ نہیں تھا۔ لیکن پھر کسی کے اٹھے پر تو نہیں لکھا ہوا تھا کہ وہ شریف ہے۔ ٹہینہ کے چہرے پر بے پناہ خوف تھا جیسے وہ موت کے فرشتے کی گرفت میں آگئی ہو شارق کو یہ صورت حال دیکھ کر فوراً ہی گڑ بڑ کا احساس ہو گیا۔

”کون ہو تم؟ تمہیں اس لڑکی کا ہاتھ پکڑنے کی جرات کیسے ہوئی؟“ شارق نے شفاعت علی

کے ہاتھ پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

”تم کون ہو؟ ہٹو پیچھے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“ شفاعت علی غرایا۔

”شش... شارق... ڈیڈی...“ ٹہینہ اس کی طرف دیکھ کر بھلائی۔ اس کی آواز یوں لگی

تھی جیسے وہ گہرے کنویں کی تہ سے بول رہی ہو۔

شارق اچھل پڑا۔ اس نے شفاعت علی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ شفاعت علی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور غصے کی شدت سے اس کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے شاید وہ خود بھی ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ شارق نے ادھر ادھر دیکھا اسٹاپ پر کھڑے ہوئے لوگ حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے دو تین آدمی تو آگے بڑھ آئے تھے۔

”شفاعت علی صاحب۔“ شارق اس کی طرف جھکتے ہوئے مدہم لہجے میں بولا۔ ”یہ بس اسٹاپ ہے۔ چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگ اس طرف دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ تماشہ بننا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن بہتر ہو گا کہ ہم کسی جگہ بیٹھ کر اطمینان سے بات کریں تاکہ کسی کو ہنسنے کا موقع نہ مل سکے۔“

”تم... تم کون ہو؟“ شفاعت علی پھنکارا۔

”میرا نام شارق ہے۔“ شارق نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ”میرا مشورہ مان لیجئے اور بیٹی کو سڑک پر اس طرح مت گھسیٹیںیے آپ ہمارے ساتھ چلے گھر زیادہ دور نہیں ہے۔ اطمینان سے بیٹھ کر بات کر لیجئے گا۔“

”میرا گھر بھی زیادہ دور نہیں ہے لیکن تم...“

”اس وقت ٹہینہ کے لئے آپ کا گھر مناسب نہیں ہے۔ اور یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ پلیز! لوگ ہمارے ارد گرد جمع ہو رہے ہیں۔ کسی کو مداخلت کا موقع نہ دیں بات بڑھ جائے گی۔“ شارق نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ چلو۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ شفاعت علی نے ٹہینہ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”ہم اس طرف چل رہے ہیں۔ آپ موٹر سائیکل لے کر ہمارے پیچھے آجائیے۔“ شارق نے نالے کے پل کی طرف اشارہ کیا۔

شفاعت علی کا دل تو اس وقت یہ چاہ رہا تھا کہ ٹہینہ کا گلا گھونٹ دے۔ لیکن شارق کی مداخلت سے اس کی ذہنی رو کا رخ بدل گیا تھا۔ ٹہینہ کی وجہ سے اسے اب تک خاصی ذلت اٹھانی پڑی تھی۔ اگر وہ اسے مار ڈالتا تو خود پکڑا جاتا۔ رہی سہی کسر پوری ہو جاتی اور اس کا گھر مکمل طور پر تباہ ہو جاتا۔ وہ ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا۔ ٹہینہ کو دیکھ کر اسے شدید غصہ تو آیا تھا لیکن غصے کی

اس کیفیت میں بھی شارق کی بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ ان دونوں کو گھورتا ہوا اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا۔ شارق اور ٹینہ نالے کا پل پار کر کے دوسری طرف جا چکے تھے۔ شفاعت علی بھی اپنی موٹر سائیکل کھینچتا ہوا ان کے پیچھے چل پڑا۔

وہ بازار میں چلتے ہوئے گلی میں مڑ گئے۔ بازار میں لوگ گھورتی ہوئی نگاہوں سے ٹینہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن ٹینہ کو شاید لوگوں کی ان نظروں کی پرواہ نہیں تھی۔

دس منٹ بعد وہ گھر پہنچ گئے گیٹ پر پہنچ کر شارق نے ٹینہ کو اشارہ کیا وہ برآمدے میں پہنچ گئی اور چوکھٹ کی مخصوص جگہ سے چابی نکال کر تالا کھولنے لگی شارق نے گیٹ کا ایک حصہ پوری طرح کھول دیا تھا۔

”موٹر سائیکل اندر لے آئے۔“ اس نے شفاعت علی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

شفاعت علی نے موٹر سائیکل اندر لا کر دیوار کے قریب کھڑی کر دی اور گھورتی ہوئی نظروں سے شارق کی طرف دیکھنے لگا۔ شارق اسے لے کر اندر آ گیا۔ ٹینہ پلنگ کی پیٹی پر بیٹھی رو رہی تھی۔ شفاعت علی ایک کرسی کے قریب کھڑا خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا تم سمجھتی ہو کہ اس طرح رونے سے تمہارے گناہ دھل جائیں گے، ہماری کھوئی ہوئی عزت واپس آ جائے گی۔“ شفاعت علی کہہ رہا تھا۔ ”مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی ٹینہ! تم تو پڑھی لکھی ہو۔ برا بھلا سمجھ سکتی ہو۔ پھر یہ سب کچھ کیوں کیا تم نے؟ کیا تمہیں ہماری عزت کا خیال نہیں آیا تھا؟“

”مم.... میں کچھ نہیں جانتی یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟“ ٹینہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔

شارق نے اس موقع پر مداخلت کی تو شفاعت علی ایک دم بھڑک اٹھا۔ شارق خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ شفاعت علی کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔

شفاعت علی کے بارے میں اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ دل کی بھڑاس نکال کر وہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ شارق نے بھی اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ شفاعت علی ٹینہ کو اپنے ساتھ گھر لے جانا چاہتا تھا۔

”میرا خیال ہے یہ مناسب نہیں ہو گا۔“ شارق نے کہا۔ ”پولیس کے بارے میں آپ خود بتا چکے ہیں۔ اس اے ایس آئی نے آپ کو شیشے میں اتارنے کے لئے بہت باتیں کی تھیں۔ ٹینہ کو تحفظ فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن آپ ان پولیس والوں کو نہیں جانتے۔ میں آج جس مقام پر کھڑا ہوں اس کے ذمہ دار بھی یہ پولیس والے ہی ہیں اور پھر آپ نے بتایا تھا کہ ماجھا گجر بھی کل آپ کے پاس آیا تھا اسے بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ اس کا ایک آدمی ٹینہ

کے ہاتھوں مارا گیا تھا وہ لوگ ٹینہ کو اٹھا کر لے گئے تھے اور ٹینہ نے اپنی عزت بچانے کے لئے اس آدمی کو قتل کیا تھا۔ ان لوگوں کو جیسے ہی پتہ چلے گا کہ ٹینہ اپنے گھر پہنچ چکی ہے وہ مردار خور مگدہ کی طرح اس پر جھپٹ پڑیں گے۔ ٹینہ میرے پاس سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ یہ جب تک میرے پاس ہے کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ویسے اگر ٹینہ آپ کے ساتھ جانا چاہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”نن.... نہیں۔“ ٹینہ ہکلائی۔ ”مم.... میں کسی کا سامنا نہیں کر سکتی۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ شارق ٹھیک کہتا ہے میں اس کے ساتھ محفوظ رہ سکتی ہوں۔“

شفاعت علی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ ”تمہاری وجہ سے ہمیں بہت ذلت اٹھانی پڑی ہے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ رہی سہی کسر اب پوری ہو جائے گی۔ یہ جگہ ہمارے گھر سے زیادہ دور تو نہیں ہے۔ جس طرح آج میری نظروں میں آگئی ہو اسی طرح کوئی اور بھی تمہیں دیکھ سکتا ہے اس لئے بہتر ہو گا کہ....“

”آپ مطمئن رہئے۔“ شارق نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ٹینہ کسی کی نظروں میں نہیں آئے گی۔ اور میرا مشورہ ہے کہ اگر آپ اپنی بیٹی کی سلامتی چاہتے ہیں تو آپ بھی اس کے راستے میں آنے کی کوشش نہ کریں۔“

”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔“ شفاعت علی نے اسے گھورا۔

”دھمکی نہیں مشورہ دے رہا ہوں۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اسی میں دونوں کی عزت اور ٹینہ کی سلامتی ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ ٹینہ اس چکر سے نکل جائے۔ اس کے بعد اسے کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔“

شفاعت علی چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر پیر پختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ شارق بھی اس کے پیچھے ہی گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر باہر کا گیٹ کھول دیا اور جب وہ موٹر سائیکل لے کر نکل گیا تو شارق نے گیٹ بند کر دیا اور اندر آ گیا۔

ٹینہ پلنگ پر بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ شارق نے اسے تسلی دینے کی کوشش نہیں کی۔ اسے معلوم تھا ایک دن یہ تو ہونا ہی تھا۔ ایک ہی شہر میں اور پھر اتنا قریب رہتے ہوئے ٹینہ زیادہ عرصہ تک اپنے گھر والوں کی نظروں سے چھپی تو نہیں رہ سکتی تھی۔

شفاعت علی چلا گیا تھا لیکن شارق کو شبہ تھا کہ وہ بعد میں پولیس کو لے کر چڑھ دڑے۔ ٹینہ آخر کار اس کی بیٹی تھی اور اس نے اس کے بارے میں اغواء کی رپورٹ بھی لکھوا

دعوے سے دستبردار ہو گیا۔

معاملات کو سدھارنے میں کچھ عرصہ اور لگ گیا اور بالاخر کمپنی نے لوگوں کو پلاٹوں پر قبضہ دینا شروع کر دیا۔ وہ جگہ چونکہ شہر سے باہر اور سڑک سے بہت ہٹ کر ہے اس لئے ابھی تک وہاں آبادی نہیں ہو سکی۔ بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے پلاٹوں پر نقشوں کے مطابق بنیادیں بھر دی ہیں۔ بعض لوگوں نے اپنے پلاٹوں کے گرد چار دیواری کھڑی کر دی ہے اور بعض لوگوں نے پلاٹ یونٹی چھوڑ دینے ہیں جبکہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ کرائے کے مکانوں سے جان چھڑانے کے لئے اپنے پلاٹوں پر جیسے تیسے مکان تعمیر کر کے وہاں رہائش اختیار کر لی ہے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ پورے علاقے میں چار چھ مکان ہی ہوں گے۔

وہ حویلی بھی جھانگے کے کاروبار کی طرح میری تحویل میں ہے۔ اس کے بارے میں قابل اعتماد قسم کے دو تین آدمیوں ہی کو معلوم ہے۔ وہ حویلی ہمارے لئے بہترین پناہ گاہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس وقت کو میں نے نوکھٹا کو وہاں بھیج دیا تھا اور میرا خیال ہے کہ چند روز کے لئے ہمیں بھی وہاں منتقل ہو جانا چاہئے۔ لیکن وہاں آمد و رفت کے لئے گاڑی کا ہونا بہت ضروری ہے۔ تمہیں یاد ہے صبح ہم گاڑی لینے کے لئے ہی گھر سے نکلے تھے لیکن تمہارے ڈیڈی سے آمنا سامنا ہو گیا اور اب میرا خیال ہے ہمیں روانہ ہو جانا چاہئے۔ خاصی دیر ہو چکی ہے۔ تم منہ ہاتھ دھو لو تاکہ فریش نظر آؤ۔“

ٹینہ اٹھ کر ہاتھ روم میں چلی گئی۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور بال سنوارتے ہوئے آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ آنکھوں میں سرخی تھی اور نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ وہ سہرا سانس لیتے ہوئے ہاتھ روم سے باہر آگئی۔ اس نے لباس نہیں بدلا تھا۔ اس مرتبہ گلی سے نکلتے ہی انہیں رکشہ مل گیا۔ شارق کو اچھرے میں کاروں کے ایک دو ایسے شوروم معلوم تھے جہاں استعمال شدہ کاریں مل سکتی تھیں۔ ایک شوروم پر انہیں سرخ رنگ کی ایک شیرازہ پسند آگئی۔ کار زیادہ استعمال نہیں ہوئی تھی۔ ظاہری کنڈیشن کے علاوہ انجن بھی بہترین حالت میں تھا۔ کئی میل تک کار کی ٹرائی کرنے کے بعد سودا ہو گیا اور وہ کار انہوں نے خرید لی۔

شارق نے کار کی خریداری کی رسید ٹینہ کے نام بنوائی تھی۔ ڈیلر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دو دن میں کنڈکٹ اس کے نام ٹرانسفر کرا دے گا۔ کار میں بیٹھ کر ٹینہ عجیب سی خوش محسوس کر رہی تھی۔

شارق نے بازار سے کچھ سامان خریدا جس میں کھانے پینے کی اشیاء تھیں پھر کار کی نیکی میں

رہی تھی۔ فیصل آباد کے اے ایس آئی نے وعدہ لیا تھا کہ اگر ٹینہ سامنے آجائے تو وہ کچھ قانونی سہولتیں حاصل کر سکتی ہے اور ایک دن پہلے مابھا گجر بھی اس سے مل کر گیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے بھی شفاعت علی کو کوئی سبزی باغ دکھایا ہو اور شفاعت علی ان میں سے کسی کی طرف جھک جائے۔

”یہ جگہ ہمارے لئے محفوظ نہیں ہے ٹینہ۔“ شارق نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے ڈیڈی اس وقت تو خاموش چلے گئے ہیں لیکن ممکن ہے بعد میں ان کے دل میں ہمارے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا خیال آجائے۔ اس لئے ہمیں پہلی فرصت میں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہئے۔“

”نہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔“ ٹینہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”وہ میرا باپ ہے میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اگر انہیں کچھ کرنا ہوتا تو ہمارے ساتھ یہاں تک نہ آتے۔ جو کچھ کرنا تھا سڑک پر ہی کر ڈالتے اب وہ کچھ نہیں کریں گے۔ اگر اتفاق سے میں کبھی ان کے سامنے آ بھی گئی تو اس طرح گزر جائیں گے جیسے ہمارا کوئی رشتہ نہ ہو۔“

”لیکن میرا خیال ہے احتیاطاً کچھ دنوں کے لئے یہ جگہ چھوڑ دینی چاہئے۔ ہمیں یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ مابھا گجر کل ہی تمہارے ڈیڈی سے مل چکا ہے تم اسے جان چکی ہو کہ وہ کس قسم کا انسان ہے۔“

”کمال لے جاؤ گے مجھے؟“ ٹینہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

”مکمل روڈ پر یتیم خانہ چوک سے آگے سڑک سے ہٹ کر ایک پرانی حویلی ہے۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”کافی عرصہ پہلے یہاں کھیت ہوا کرتے تھے۔ پھر زمیندار نے زمین بیچ دی۔ وہ زمین ایک کمپنی نے خریدی تھی۔ جس میں وہ حویلی بھی شامل تھی۔ کمپنی نے وہ حویلی جوں کی توں رہنے دی اور زمین کو پلاٹوں کی صورت میں بیچنا شروع کر دیا۔ جھانگے نے وہ حویلی اور اس کے آس پاس کی تھوڑی سی زمین خرید لی تھی لیکن پھر زمیندار کے بیٹے نے کمپنی پر مقدمہ کر دیا۔ زمیندار کا انتقال ہو چکا تھا اور کمپنی نے یہ زمین بہت سارے قانونی اخراجات سے بچنے کے لئے ناقابل تنسیخ پاور آف اٹارنی پر حاصل کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ ایسی دستاویزات پر بھی دستخط کروائے تھے جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ زمیندار اس کمپنی سے زمین کی قیمت وصول کر چکا ہے۔ زمیندار کے انتقال کے بعد وہ پاور آف اٹارنی خود بخود منسوخ ہو گئی۔ اب اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں رہی تھی۔ زمیندار کے بیٹے نے کمپنی کے خلاف زمین کی ملکیت کا دعویٰ کر دیا۔ یہ کیس کئی سال تک عدالت میں چلتا رہا اور بالاخر کمپنی سے پانچ لاکھ روپے وصول کر کے اپنے

ہو یا نہیں؟

”لے آیا ہوں شارق باؤ۔“ راجہ نے جواب دیا۔ ”راش ڈال لیا ہے۔ ایک ہفتے تک تو آرام سے بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔“

”ابھی تم لوگوں نے کھانا کھایا کہ نہیں۔“ شارق نے پوچھا۔

”ابھی نہیں شارق باؤ۔“ راجہ نے جواب دیا۔ ”تین بجنے والے ہیں۔ مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔ نوکھا سے جب بھی کہتا ہوں ایک ہی جواب دیتا ہے کہ ٹھہر کے کھالیں گے۔“

”کھانا ہم نے بھی نہیں کھایا۔“ شارق نے کہا۔ ”میں کچھ سلمان لے آیا ہوں۔ گاڑی سے نکال لو۔ کھانا بھی نکال لو۔ مل کر کھالیں گے۔“

ثینہ بھی کار سے اتر آئی تھی۔ وہ ان کی باتوں میں مداخلت کرنے کے بجائے ایک طرف کھڑی چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ شارق کے کہنے پر اس نے گاڑی میں سے سلمان نکال کر راجہ کے حوالے کر دیا۔ اس میں کھانے پینے کی بھی چیزیں تھیں۔

اوسے گھٹنے بعد وہ دیں چارپائیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد شارق، ثینہ کو ساتھ لے کر حویلی دکھانے لگا۔ یہ حویلی غالباً پچاس ساٹھ سال پہلے تعمیر ہوئی تھی بہت اچھی طرح سے دیکھ بھال ہوتی رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کم از کم مزید سو برس تک اس کے در و دیوار پر کوئی اثر نہیں ہو گا سات آٹھ کشادہ کمرے تھے۔ سب کے سب خالی تھے البتہ ایک کمرے میں تین چار بان کی چارپائیاں پڑی تھیں جو غالباً نئی خریدی گئی تھیں۔ ان پر بستر بھی رول کئے ہوئے رکھے تھے۔ گردے اور چادریں وغیرہ بھی نئی خریدی گئی تھیں۔

وہ چھت پر آ گئے۔ چاروں طرف دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ بڑا خوبصورت منظر لگ رہا تھا۔ وہ دونوں کافی دیر تک چھت پر کھڑے ادھر ادھر دیکھتے رہے پھر نیچے آ گئے۔

”تمہارے اس کباڑیے دوست کا کیا حال ہے راجہ؟“ شارق نے درختوں کے نیچے چارپائی پر بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”ٹھیک ہے جی۔“ راجہ نے جواب دیا۔ ”کہنے کو تو وہ کباڑیا ہے۔ اسکرپ کا کاروبار کرتا ہے لیکن ہم سے زیادہ کماتا ہے۔ گبرگ میں دوسری کوٹھی بنا رہا ہے۔“

”یہ بھی ایک فن ہے۔“ شارق نے کہا۔ ”میں ہر شخص فنکار ہے۔ اپنے اپنے کلم کا ماہر۔ ہم اپنے ہندے میں کما رہے ہیں وہ اسکرپ میں کما رہا ہے۔ بہر حال، مجھے اس کی ضرورت پڑ گئی ہے۔“

”کیا ضرورت پڑ گئی ہے شارق باؤ۔“ راجہ نے کہا۔ ”اسکرپ خریدنا یا بیچنا ہے؟“

پینرول بھروایا اور وہ ملتان روڈ پر آ گئے۔ ملتان روڈ پر یتیم خانہ چوک سے ذرا ہی آگے سڑک کے دونوں طرف کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ ہائی وے پر کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد شارق نے کار دائیں طرف کچے راستے پر موڑ دی۔ اس راستے کے دونوں طرف کھیت تھیں لیکن تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کھیت ختم ہو گئے اور وہ علاقہ شروع ہو گیا جو کسی کہنی نے زمیندار سے خرید کر پلاٹوں کی صورت میں فروخت کر دیا تھا۔

کہیں خالی پلاٹ تھے، کہیں بنیادیں بھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ کہیں کہیں چار دیواریاں تھیں اور کہیں مکان ہی مکان بن چکے تھے۔ اس علاقے میں بجلی پہنچائی جا چکی تھی لیکن اور کسی بھی ترقیاتی کام کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ راستے کچے تھے اور پانی کی فراہمی کا بھی ابھی تک کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ یہاں جو لوگ رہائش اختیار کر چکے تھے وہ ملحقہ کھیتوں میں لگے ہوئے ٹوب ویل سے پانی لے کر آتے تھے۔

وہ حویلی دور ہی سے نظر آ رہی تھی۔ حویلی قدرے بلندی پر تھی سرخ شیراؤ مختلف راستوں پر گھومتی ہوئی حویلی کے پھانک کے سامنے آ کر رک گئی۔ شارق نے دو تین مرتبہ ہارن بجایا۔ کچھ دیر بعد پھانک میں چھوٹا دروازہ کھلا اور ایک باریش نوجوان باہر بھاگنے لگا۔

دراز قامت اور صحت مند جسم کا مالک وہ نوجوان راجہ تھا۔ گول سیاہ داڑھی اس کے چہرے پر بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ اس نے سرخ شیراؤ کی طرف دیکھا۔ پھر شارق کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ دوڑتا ہوا کار کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی اور کندھے کے قریب چادر کا کونا اٹھا ہوا تھا۔

”راجہ! پھانک کھولو۔ میری شکل کیا دیکھ رہے ہو؟“ شارق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ابھی کھولتا ہوں جی۔“ راجہ کہتے ہوئے گیٹ کی طرف دوڑ گیا۔

اس طرح دوڑنے سے اس کے کندھے سے چادر ہٹ گئی اور ثینہ کو اس کے کندھے پر وہ رائفل نظر آ گئی جس کی وجہ سے چادر کا کونا اٹھا ہوا تھا۔ راجہ نے پھانک کھول دیا اور شارق شیراؤ کو اندر لیتا چلا گیا۔

حویلی کے وسیع و عریض کمپاؤنڈ میں ٹاہلی اور پتیل کے پانچ چھ درخت بھی تھے اور ان درختوں کے نیچے دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پر نوکھا بیٹھا ہوا تھا۔ شارق نے درختوں کے نیچے گاڑی روک لی۔ راجہ بھی پھانک بند کر کے قریب آ چکا تھا۔

”ہاں بھئی راجہ۔“ شارق نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ ”میں کوئی سلمان وغیرہ لائے

چھپ گئی تھیں کہ اسکرپ اتارے بغیر انہیں نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ رقم والا تھیلا شارق نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

ایک بجے کے لگ بھگ ٹرک ڈیرے سے نکلا۔ اسٹیرنگ کے سامنے گما تھا اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر راجہ بیٹھا ہوا تھا۔ شارق کی کار گلی کے کنارے کھڑی تھی۔ ٹرک جیسے ہی گلی سے نکلا شارق نے بھی اپنی کار اس کے پیچھے لگا دی۔

مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے وہ لوگ ملتان روڈ پر پہنچ گئے۔ شارق کی گاڑی تقریباً پچاس گز پیچھے تھی۔ یتیم خانے والے چوک سے ذرا پہلے ایک پولیس پارٹی نے ٹرک روک لیا۔ شارق نے گاڑی کی رفتار بہت ہلکی کر دی اس کی نظریں سامنے لگی ہوئی تھیں۔ گما اور راجہ ٹرک سے اتر آئے۔ پولیس والوں کی تعداد چار تھی ان میں سے ایک ٹرک کے پچھلے حصے پر چڑھ کر بھرے ہوئے اسکرپ کو دیکھ رہا تھا۔ شارق نے ٹرک کے پیچھے گاڑی روک لی اور کھڑکی سے گردن نکالتے ہوئے بولا۔

”کیا بات ہے سنتری بادشاہ۔ ان بچاروں کو کیوں پکڑ لیا ہے؟“

”باؤ جی۔“ سنتری سے پہلے گما بول پڑا۔ ”یہ اسکرپ ہم اوکاڑہ لے جا رہے ہیں۔ مال تو بالکل کا ہے مگر سنتری بادشاہ پریشان ہمیں کر رہے ہیں۔ ہم تو مزدور آدمی ہیں جی۔“

”کیوں پریشان کرتے ہو سنتری بادشاہ جانے دو ان بے چاروں کو۔“ شارق نے پولیس والے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ہیڈ کانسیبل تھا جو اس پارٹی کا انچارج تھا۔

”آپ اپنی منزل کھوئی نہ کریں سرجی۔ آپ جائیں۔“ ہیڈ کانسیبل نے کہا۔ ”میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان کے پاس راہداری بھی نہیں ہے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ چوری کا مال ہے۔“

”قسم لے لو سنتری بادشاہ۔“ گما نے کہا۔ ”یہ بادای باغ کے صوفی محمد حسین کا مال ہے۔ تم ٹیلی فون پر تصدیق کر لو۔“

”تصدیق تو تھانے جا کر ہو گی۔“ ہیڈ کانسیبل نے کہا۔

”کیوں تنگ کرتے ہو انہیں سنتری بادشاہ۔ کچھ کم مکا کر کے ختم کرو اس معاملے کو۔۔۔۔۔ یہ زور غریب آدمی ہیں۔ جانے دو۔“ شارق نے کہا۔

گمے نے جلدی سے پچاس کا ایک نوٹ جیب سے نکال لیا مگر سنتری کی بھنویں تن گئیں گمے نے پچاس کا ایک اور نوٹ جیب سے نکال لیا۔

”اب صرف میرے پاس دس پندرہ روپے رہ گئے ہیں۔ یہ سو روپیہ بھی میں تمہیں اپنی جیب

”اس کے ٹرک کی ضرورت ہے۔“ شارق نے جواب دیا۔ پھر چند لمحے خاموش رہا اور پھر اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم ابھی روانہ ہو جاؤ اور ٹرک لے کر ڈیرے پر پہنچ جاؤ۔ گمے کو سمجھا دیتا۔ رات دس بجے کے قریب میں بھی آ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے شارق باؤ۔ میں ابھی چلا جاتا ہوں۔“ راجہ نے جواب دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد راجہ حویلی سے چلا گیا۔ راجہ کے جانے کے بعد شارق نے نوکھاکو بتایا کہ آج صبح انہیں ٹینے کا باپ مل گیا تھا اور اس سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ اسے اپنے گھر لے گیا تھا اور اب ٹینے چند روز اس حویلی میں رہے گی۔

رات کا کھانا ٹینے ہی کو پکانا پڑا تھا۔ باورچی خانے میں گیس کا چولہا رکھا ہوا تھا اور گیس کا ایک بڑا سلنڈر بھی موجود تھا۔ ٹینے کے خیال میں راجہ اور نوکھاکو نے یہ تعہدی کا کام کیا تھا کہ چولہے اور گیس کا بندوبست کر لیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد دس بجے کے لگ بھگ شارق کار پر حویلی سے روانہ ہو گیا۔ وہ ٹھیک گیارہ بجے مزنگ والے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ راجہ اور گما وہاں موجود تھے۔ ایک کھٹارہ سا ٹرک بھی مزار کے قریب ہی کھڑا تھا اور اس کے قریب ہی اسکرپ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

”کیا صورت حال ہے؟“ شارق نے گما سے پوچھا۔

”سب ٹھیک ہے شارق باؤ۔“ گما نے جواب دیا۔ ”ہمارا ایک بندہ باہر گلی کے موڑ پر کھڑا ہے۔ کوئی بات ہو گی تو ہمیں اطلاع مل جائے گی۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ اب جلدی سے کام شروع کر دو۔“ شارق نے کہا۔ وہ مزار میں آ گئے۔ شارق نے میکنزم سے راستہ کھولا اور وہ تینوں قبر میں داخل ہو کر تہہ خانے میں اتر گئے۔ گما کو تو یہ سب کچھ معلوم تھا لیکن راجہ بڑی حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

”پہلے یہ پیٹیاں اٹھا کر ٹرک میں رکھو۔ میں یہ پکٹ سنبھالتا ہوں۔“ شارق نے لکڑی کی پیٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔

چھ سات پیٹیاں تھیں۔ راجہ اور گما مل کر ایک ایک پیٹی اٹھا کر باہر لے جانے لگے شارق ہیروئن کے پکٹ بوریوں میں بند کرنے لگا۔ دو بڑی بوریاں بھر گئی تھیں الماری میں ایک خفیہ رقم بھی موجود تھی جسے شارق نے تھیلے میں ڈال لیا۔

تقریباً ساڑھے بارہ بجے تک وہ لوگ اسلحہ کی ساری پیٹیاں اور ہیروئن کی بوریاں ٹرک میں لاد چکے تھے اور ان پر اسکرپ ڈال دیا گیا تھا۔ پیٹیاں اور بوریاں اسکرپ کے انبار میں اس طرح

سے دے رہا ہوں۔ اب تو مان جاؤ سنتری بادشاہ۔“

مگر سنتری بادشاہ پانچ سو سے کم پر ماننے کو تیار نہیں تھا۔ دوسری صورت میں وہ انہیں تھامے لے جانے کی دھمکی دے رہا تھا۔ گما قسمیں کھا رہا تھا کہ اس کے پاس اور پیسے نہیں ہیں۔ شارق نے اپنی جیب سے سو سو کے تین نوٹ نکال لئے اور سو روپیہ گائے والا ملا کر زبردستی ہیڈ کانسٹیبل کی مٹھی میں دبا دیا۔

”سو سو روپیہ تم چاروں کے حصے میں آ جائے گا۔ اب جانے دو ان غریبوں کو۔“ شارق نے کہا اور پھر گاما کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم لوگ بھی خیال رکھا کرو۔ راہداری لے کر کیوں نہیں چلے تھے؟“

”ہم ادھر کے پھیرے لگاتے رہتے ہیں باؤ جی۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ آئندہ ہم خیال رکھیں گے اور آپ اپنا پتہ بتا دیں جی۔ میں آپ کی رقم پہنچا دوں گا۔“ گاما نے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے انسانی ہمدردی کے تحت تمہاری مدد کی ہے۔ آئندہ خیال رکھنا۔ شہر سے باہر کہیں مل لے کر جاؤ تو کہنی کے کلغزات اور راہداری لے کر چلا کرو۔“ شارق نے ڈانٹنے والے لہجے میں کہا۔

”بڑی مہربانی باؤ جی۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔ اچھا سنتری بادشاہ۔ رب راکھا۔“ گاما کہتے ہوئے ٹرک میں بیٹھ گیا راجہ نے بھی بڑی پھرتی دکھائی تھی۔

شارق بھی ہیڈ کانسٹیبل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اور جب ٹرک آگے نکل گیا تو اس نے بھی گاڑی کا انجن اشارت کر دیا اور پولیس والوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی ایک ہلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

یہ معاملہ بڑی خوش اسلوبی سے طے ہو گیا تھا۔ اگر پولیس والے ٹرک کو تھانے لے جانے پر بضد ہو جاتے تو معاملہ گڑبڑ ہو سکتا تھا۔ شارق کا سارا مال اسی ٹرک پر تھا۔ اگر پکڑا جاتا تو وہ بھی ختم ہو جاتا۔

دوبجے کے لگ بھگ وہ حویلی پہنچ گئے۔ ٹرک کی آواز سن کر شینہ بھی جاگ گئی۔ ٹرک حویلی کے اندر لے آیا گیا تھا۔ پہلے اسکرپ اتار کر ایک طرف ڈھیر کیا گیا پھر ہیروئن کی بوریاں اور اسلحہ کی پیٹیاں اتار کر حویلی کے ایک پچھلے کمرے میں پہنچا دی گئیں۔ اسکرپ دوبارہ ٹرک پر لا دیا گیا تھا۔

”ٹرک شہر واپس لے جاؤں شارق باؤ۔“ راجہ نے کہا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“ شارق نے اسے گھورا۔ ”وہ پولیس والے اس علاقے

میں محنت کر رہے ہوں گے اور اب اگر انہوں نے پکڑ لیا تو چھوڑیں گے نہیں۔ اس وقت آرام سے سو جاؤ۔ صبح لے جانا ٹرک اور یہ اسکرپ بھی اپنے اسی دوست کو دے دینا۔“

”ٹھیک ہے شارق باؤ۔“ راجہ نے کہا۔

اس حویلی میں اگرچہ کسی کی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا لیکن وہ کسی قسم کی لا پرواہی کا مظاہرہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ رات کے لئے نوکھا کی پہرے کی ڈیوٹی لگا دی گئی تھی۔ راجہ اور گاما نے اپنی چارپائیاں کھلے صحن میں ڈال لی تھیں۔ شارق اور شینہ کی چارپائیاں برآمدے میں تھیں۔ وہ دونوں کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر سو گئے۔

شارق، شینہ اور نوکھا حویلی تک ہی محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ گاما اور راجہ شہر میں ایجنٹوں سے رابطہ کر کے دھندہ کر رہے تھے۔ شارق حویلی کے آس پاس کچے راستوں پر شینہ کو ڈرائیونگ بھی سکھا رہا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ شینہ اچھی خاصی ڈرائیونگ سیکھ چکی تھی۔ شارق یہاں بیکار نہیں بیٹھا ہوا تھا۔ گاما اور راجہ کے ذریعے شہر کی خبریں مل رہی تھیں۔ ابھا گجر اور اس کے آدمی اب بھی بڑی سرگرمی سے شارق اور شینہ کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

اور بالاخر ایک روز شارق نے شہر واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ نوکھا کو حویلی ہی میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ گاما اور راجہ ایک روز پہلے ہی سے شہر میں تھے۔ شارق رات کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہی حویلی سے روانہ ہوا تھا۔ جب وہ شام گھر والے مکان میں پہنچے تو رات کے نوچ رہے تھے۔

”تم یہیں رکھو۔۔۔ میں ڈیرے کا چکر لگا کر آتا ہوں۔“ شارق نے کہا۔

”نہیں میں یہاں اکیلی نہیں رہ سکتی۔“ شینہ نے کہا۔

”اوہ!“ شارق کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ”شاید تم ڈرتی ہو کہ تمہارے ڈیڈی نہ آجائیں۔“

”کچھ بھی کہہ لو۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ شینہ نے کہا۔

”تو ٹھیک ہے۔ چلو۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ دوبارہ گھر سے نکل گئے۔ راستے میں ایک جگہ انہوں نے کھانا کھلایا اور پھر مزنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کی گاڑی مزنگ چوک پر پہنچی تھی کہ شارق ایک طرف شعلے اٹھتے دیکھ کر چوک گیا کہیں بہت زبردست آگ لگی تھی۔ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔

شارق کی گاڑی گلی کی طرف نہیں جانے دی گئی۔ موڑ پر لوگوں کا ہجوم تھا اور پولیس نے آگے جانے کا راستہ بند کر رکھا تھا۔ چاروں طرف سے فلائیر گیٹ کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں

سنائی دے رہی تھیں۔ سڑک پر بھی ٹریفک جام ہو رہا تھا شارق گاڑی کو ہٹا کر دوبارہ چوک کی طرف لے آیا۔

”اگ کہاں لگی ہے؟“ شارق نے ایک آدمی کو روک کر پوچھا۔

”جھانگے کے طویلے میں۔“ اس آدمی نے جواب دیا۔ ”سنا ہے ماجھا گجر کی پارٹی نے طویلے پر حملہ کر دیا تھا۔ پہلے فائرنگ ہوتی رہی پھر اگ لگ گئی۔ اگ ماجھا گجر کے آدمیوں نے لگائی ہے۔“

شارق کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر کار سے اترا چاہا مگر ٹینے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”کیا اس طرف جانا مناسب ہو گا؟“ ٹینے نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے ماجھا گجر کے آدمی اب بھی اس پاس کہیں موجود ہوں۔ میرے خیال میں تو بہتر یہی ہو گا کہ ہم یہاں سے نکل چلیں۔“

شارق چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اس نے دروازہ بند کر کے کار کا انجن اشارت کر دیا۔

مین روڈ پر ٹریفک جام ہو رہا تھا۔ بسیں، ٹانگے، کاریں اور رکشے وغیرہ مختلف گلیوں میں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شارق نے بھی کار ایک گلی میں موڑ دی۔ اس کے آگے دو تین رکشے تھے۔ شارق کو ایک لمحہ کو کار روکنی پڑی۔ وہ کار کو دوبارہ آگے بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ پچھلی طرف کے دونوں دروازے بیک وقت کھلے اور دو آدمی کار میں گھس گئے۔

”شارق باؤ....“ ان میں سے ایک آدمی نے کہا۔ ”اب تم وہاں چلو گے جہاں ہم چاہیں گے۔ آرام سے کار چلاتے رہو۔ ان گلیوں سے نکلنے کے بعد ہم تمہیں راستہ بتاتے رہیں گے۔“

شارق اور ٹینے نے بیک وقت پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ شارق کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا اور ٹینے کا چہرہ مارے خوف کے دھواں ہو گیا تھا۔ ان دونوں آدمیوں نے چادریں اوڑھ رکھی تھیں اور چادروں سے جھانکتی ہوئی رائفلوں کی ٹالیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

○

مختلف گلیوں سے گھومتی ہوئی گاڑی ایک بار پھر مین روڈ پر نکل آئی۔ وہ اگرچہ مزنگ چوک سے تقریباً ایک میل دور مین روڈ پر نکلے تھے لیکن طویلے میں لگی ہوئی اگ کے شعلے وہاں سے بھی نظر آ رہے تھے۔ طویلے میں لاتعداد ٹانگے کھڑے رہتے تھے۔ ایک حصے میں توڑی بھوسے وغیرہ کے ڈھیر تھے۔ اس کے علاوہ لکڑی کا اور بھی بہت سا کاٹھ کباڑ تھا۔ اگر احاطے کی دیوار کے ساتھ گلی کے رخ پر موٹروں کے درکشپ وغیرہ بھی اگ کی لپیٹ میں آ چکے ہوں تو لاہور کے سارے فائر بریگیڈ مل کر بھی صبح سے پہلے اس اگ پر قابو نہیں پاسکیں گے۔ ڈیرے پر گلا اور راجہ بھی تھا۔ جس آدمی سے شارق نے اگ کے بارے میں پوچھا تھا اس نے بتایا تھا کہ اگ لگنے سے پہلے فائرنگ بھی ہوئی تھی۔ اس سے شارق کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ ماجھا گجر کی پارٹی نے ڈیرے پر حملہ کیا تھا اور ڈیرے کو اگ لگا دی تھی۔ شارق اب گلا اور راجہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ بچ کر کہیں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے، ان کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے یا وہ بھی اگ میں جل کر راکھ ہو گئے تھے۔

ان دونوں آدمیوں کی اس علاقے میں موجودگی سے اندازہ ہوتا تھا کہ ماجھا گجر یا اس کے آدمیوں کو یقین رہا ہو گا کہ ڈیرے کو اگ لگنے کی اطلاع پا کر شارق یہاں ضرور آئے گا۔ جس طرح اگ کے شعلے اٹھ رہے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگ کافی دیر سے لگی ہوئی تھی اور پھیل کر قابو سے باہر ہو چکی تھی۔ شارق تو محض اتفاق سے اس طرف آ نکلا تھا اور مانجھے کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ ویسے یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ چند روز پہلے ہی شارق نے اپنا سارا مال یہاں سے ہٹا دیا تھا۔ اگر وہ مال یہاں ہوتا تو سب کچھ ختم ہو چکا ہوتا۔

”کہاں جانا ہے؟“ شارق نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر ان آدمیوں سے پوچھا جو اسے اور ٹینے کو گن پوائنٹ پر لئے بیٹھے تھے۔

”بادامی باغ۔“ ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ ”وہاں پہنچنے کے بعد ہم تمہیں راستہ بتا دیں گے۔“

شارق نے جواب دینے کے بجائے کار کی رفتار کم کر دی۔ سامنے ٹریفک گسٹل کی سرخ بتی

نظر آ رہی تھی۔ قریب پہنچنے تک سگنل کھل گیا اور وہ گاڑی کو سیدھا نکال لے گیا۔

شیراؤ مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی داتا دربار کے سامنے سے ہوتی ہوئی راوی روڈ پر آگئی اور پھر اگلا ٹریفک سگنل پار کر کے اس سڑک پر آگئی جس کے ایک طرف شاہی قلعہ تھا اور دوسری طرف وسیع و عریض اقبال پارک میں مینار پاکستان۔ اس سڑک پر بسوں کی آمد و رفت کے باعث گاڑی کی رفتار زیادہ تیز نہیں کی جاسکتی تھی۔ بادامی باغ کے لاری اڈے سے ہر منٹ بعد پاکستان کے مختلف شہروں کے لئے ایک دو بسیں نکل رہی تھیں۔ بادامی باغ کے سامنے والی سڑک پر شارنق نے کار کی رفتار مزید کم کر لی۔

”رفتار ہلکی رکھو اور سیدھے چلتے رہو۔ جس طرف مڑنا ہو گا بتا دوں گا۔“ پیچھے بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے کہا۔

شارنق نے کار کی رفتار مزید کم کر دی اور پھر اس آدمی کے کہنے پر کار کو بائیں طرف موڑ لیا۔ یہ کافی کشادہ گلی تھی مگر درکشاپوں کی وجہ سے راستہ تنگ ہو گیا تھا۔ سڑک بھی ٹوٹی پھوٹی تھی۔ کار بہت ہلکی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔

یہ سڑک وسیع و عریض لاری اڈے کے پچھلی طرف چلی گئی تھی۔ اس طرف بھی زیادہ تر درکشاپ ہی تھے جو اس وقت بند پڑے تھے اور سناٹا سا تھا۔

”بس، یہاں کار روک لو۔“ پیچھے بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے کہا۔

شارنق نے کار روک کر انجن بند کر دیا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک آدمی نیچے اتر گیا۔ اس نے چار کے اندر رائفل کو اس طرح پکڑ لیا تھا کہ کسی بھی لمحہ استعمال کر سکتا تھا۔

”چلو.... نیچے اترو۔“ کار میں بیٹھے ہوئے دوسرے آدمی نے کہا۔

پہلے شارنق دروازہ کھول کر نیچے اترتا اور پھر دوسری طرف سے ٹینے بھی نیچے آگئی۔ شارنق کے انداز میں تو لاپرواہی تھی لیکن ٹینے کا چہرہ خوف کی آباگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ متوحش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

اس سڑک پر بجلی کے کھمبے تو لگے ہوئے تھے لیکن بلب ایک دو کھمبوں پر ہی جلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

”سیدھے چلتے رہو اور پھر بائیں طرف والی گلی میں مڑ جانا۔“ ایک آدمی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

شارنق اور ٹینے آگے آگے چلتے ہوئے بائیں طرف گلی میں مڑ گئے۔ اس گلی میں آخری سرے پر ایک بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی بھی اسی جگہ تک محدود تھی باقی گلی تاریکی میں ڈوبی

ہوئی تھی۔ اسی گلی میں تقریباً پچاس گز آگے بائیں طرف ایک پرانا مندر تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے اس پورے علاقے میں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی ملی جلی آبادی تھی۔ اس وقت لاری اڈہ بھی یہاں نہیں تھا۔ ٹرانسپورٹروں نے شہر کے مختلف علاقوں میں بسوں کے اڈے بنا رکھے تھے۔

پاکستان بنا تو سکھ اور ہندو ہجرت کر کے بھارت چلے گئے۔ یہاں بھارت سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کو مکان مل گئے تھے۔ کئی سال بعد جب شہر کے مختلف علاقوں سے بسوں کے اڈے ختم کئے گئے تو بادامی باغ میں ایک مرکزی لاری اڈہ بنا دیا گیا جو ضرورت کے ساتھ ساتھ پھیلتا چلا گیا۔ گلیوں میں درکشاپ بننے چلے گئے۔ لاری اڈے اور درکشاپوں کی وجہ سے اس علاقے میں رہنے والوں کا جینا دو بھر ہو گیا۔ لوگ اپنے مکان بیچ کر یا کرائے پر دے کر شہر کے دیگر علاقوں میں منتقل ہونے لگے۔ اب یہاں زیادہ تر درکشاپ تھے یا اسپرپارٹس کی دکانیں اور یا ٹرانسپورٹ کمپنیوں کے دفاتر۔ صرف چند مکان ایسے تھے جو اب بھی رہائشی مقاصد کے لئے استعمال ہو رہے تھے۔

اس تنگ سی گلی میں واقع وہ مندر کسی زمانے میں آباد ہوا کرتا تھا۔ اردگرد کی زیادہ آبادی ہندوؤں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اس مندر میں دن رات آمد و رفت رہتی تھی لیکن پھر یہ مندر بتدریج ویران ہوتا چلا گیا۔ اور اب بھی یہ مندر ویران پڑا تھا۔ لیکن بعض باپنندیدہ عناصر نے اسے اپنی غیر قانونی سرگرمیوں کا مرکز بنا رکھا تھا۔ اس مندر پر مختلف اوقات میں مختلف گروہوں کا قبضہ رہا تھا اور اب یہ ماجھا گجری پارٹی سے تعلق رکھنے والے یعقوب نامی ایک آدمی کے قبضے میں تھا۔

یعقوب لمبے قد کا ایک بھاری بھر کم آدمی تھا۔ اس کے چہرے اور جسم پر زخموں کے کئی نشان تھے جنہیں وہ بڑے فخر سے بھادری کے تمنغے کہا کرتا تھا۔ وہ باقاعدہ ہسٹری شینر تھا۔ تھانے میں باقاعدہ حاضری لگتی تھی۔ اس علاقے میں کوئی بھی واردات ہوتی تو پولیس سب سے پہلے اسی کی گردن ٹاچتی۔ یعقوب کے ہاتھوں اب تک کم از کم تین آدمی مارے جا چکے تھے لیکن پولیس اس کے خلاف قتل کا کوئی ایک کیس بھی ثابت نہیں کر سکی تھی۔

یعقوب اس علاقے کے دکانداروں، درکشاپوں اور بعض ٹرانسپورٹروں سے بھتہ وصول کرنے کے علاوہ ہیروئن کا دھندہ بھی کرتا تھا۔ وہ ماجھا گجری پارٹی میں اس وقت شامل ہوا تھا جب مانجھے نے دودھ کا کاروبار چھوڑ کر یہ دھندہ شروع کیا تھا۔ کاروباری لحاظ سے یہ ماجھا گجری کے لئے سب سے اہم علاقہ تھا۔ اس سے پہلے یہ علاقہ شیرا پهلوان کے کنٹرول میں تھا لیکن شارنق نے شیرا پهلوان کو یہ شہر تو کیا یہ ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ سرحد پار کر کے امرتسر بھاگ گیا تھا اور

یہاں کے لوگ اب اس کا نام بھی بھول گئے تھے اور پھر جب شارق نے چھانگے کی موت کے بعد اس کا کاروبار سنبھالا تو اس نے بھی اپنے آدمیوں کے ذریعے اس علاقے میں قدم جمانے کی کوشش کی لیکن یعقوب نے کسی کو بھی یہاں نکلنے نہیں دیا تھا۔

یہ مندر اب یعقوب کے قبضے میں تھا۔ طویل عرصہ سے دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث مندر کی عمارت خاصی خستہ ہو چکی تھی۔ باہر سے دیکھ کر تو یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی لمحہ ڈھیر ہو جائے گی۔ اندر سے بھی عمارت کی حالت کچھ ایسی ہی ہو رہی تھی۔

مندر کا دروازہ بند تھا۔ مرکزی گیٹ بہت اونچا اور بھاری لکڑی کا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو چھوٹے دروازے بھی تھے۔ مندر والی گلی میں مڑتے ہی ان دونوں آدمیوں نے چادروں میں چھپی ہوئی رائفلیں نکل لی تھیں اور وہ شارق اور ثینہ کو رائفلیں کی زد میں لئے مندر کے سامنے پہنچ گئے۔ مندر کے دروازے تک پہنچنے کے لئے تقریباً چار فٹ اونچا چوڑا تھا جس پر چڑھنے کے لئے اینٹوں کی دو سیڑھیاں تھیں۔ وہ چوڑے پر پہنچ کر رک گئے۔ ایک آدمی نے ان دونوں کو رائفل کی زد پر لئے رکھا اور دوسرے نے دائیں طرف والے دروازے پر مخصوص انداز میں تین مرتبہ ہلکی سی دستک دی۔ چند سیکنڈ بعد ہی دروازہ کھل گیا اور وہ لوگ اندر داخل ہو گئے۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔

یہ بہت بڑا مرکزی ہال تھا جس کی اونچی چھت پر لمبی تار سے لٹکا ہوا سواٹ کا ایک بلب جل رہا تھا۔ جس کی روشنی اس ہال کی تاریکی کو دور کرنے میں بری طرح ناکام ہو رہی تھی۔ تقریباً چودہ پندرہ فٹ اوپر چاروں طرف ایک تنگ سی بالکونی تھی جس کے سامنے حفاظتی جگہ لگا ہوا تھا۔ اس بالکونی میں پچھلی طرف چار اطراف میں دروازے بھی نظر آ رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ اوپر کمرے بھی تھے لیکن اوپر جانے کے لئے کوئی زینہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

ہال میں بالکل سامنے ایک بڑا چوڑا تھا۔ اس کے دائیں بائیں ایک ایک چھوٹا چوڑا بھی تھا۔ جب یہ مندر آباد تھا تو ان چوڑوں پر ہندوؤں کے دیوتاؤں کی مورتیاں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن یہ مورتیاں اسی وقت توڑ دی گئی تھیں جب ملک تقسیم ہوا تھا۔ چاروں طرف دیواروں میں جا بجا طاقچے نظر آ رہے تھے۔ جب بجلی نہیں تھی تو ان طاقتوں میں چراغ جلائے جاتے تھے۔

دروازہ کھولنے والا خود یعقوب تھا۔ نیم تاریک ماحول میں اس کی صورت دیکھ کر ہی ثینہ کلاپ اٹھی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی ان کے ساتھ آنے والے دونوں آدمیوں میں سے ایک نے اپنی رائفل یعقوب کے ہاتھ میں تھما دی۔ ان دونوں کو پنڈز اپ کرا دیا گیا تھا۔ یعقوب ان کے سامنے رائفل تانے کھڑا تھا۔ اس کی نظریں ثینہ کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دوسرے

آدی نے پہلے شارق کے پچھلی طرف آ کر اس کا لباس تھپتھا کر دیکھا۔ شارق کے پاس اسلحہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ آدی ثینہ کی طرف بڑھ گیا۔

”میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ مجھے ہاتھ مت لگنا۔“ ثینہ دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں بولی۔

”تمہارے پاس ہی تو سب کچھ ہے سو نہو!“ وہ شخص معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”ذرا ہاتھ لگا کر دیکھنے تو دو۔“

”نہیں، کچھ نہیں ہے میرے پاس۔ دور رہو مجھ سے۔“ ثینہ بولی۔

وہ شخص چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس نے اچانک ہی ایک بھرپور تھپڑ ثینہ کے منہ پر رسید کر دیا۔ ثینہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

شارق نے آگے بڑھنا چاہا مگر دوسرے آدمی نے رائفل سے اسے اپنی جگہ پر کھڑا رہنے کا اشارہ کیا۔ شارق جزبہ ہو کر رہ گیا۔

”اس کے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ نہیں ہے۔ اس سے دور رہو۔“ شارق بولا۔

”آرام سے اپنی جگہ پر کھڑا رہاؤ ورنہ تمہاری یہ پتلون اتار کے نا تمہارے ہاتھ میں تھا دوں گا۔“ پہلے شخص نے کہا اور ثینہ کی طرف بڑھ گیا۔

ثینہ کے چہرے پر خوف نمایاں تھا۔ اس مرتبہ اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔ وہ شخص آگے بڑھ کر اس کے جسم کو ٹٹولنے لگا۔ ثینہ جزبہ سی ہو کر بدستور پیچھے ہٹ رہی تھی۔

”انہیں اندر کمرے میں لے چلو۔“ وہ شخص تلاشی سے فارغ ہو کر بولا اور یعقوب سے اپنی رائفل لے لی۔

وہ لوگ اونچے چوڑے کے پیچھے آ گئے۔ یہاں ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ ان دونوں کو لے کر اندر آ گئے۔ یہ ایک کشادہ کمرہ تھا۔ جس میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں درمیان میں ایک میز تھی جس پر کھانے کے جوٹھے برتن پڑے تھے۔ ان برتنوں کے قریب ہی ایک گلاس اور جگ بھی رکھا ہوا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں پانی کا ایک گھڑا رکھا ہوا تھا۔ اس کمرے میں ٹیوب لائٹ جل رہی تھی اور روشنی خاصی معقول تھی۔

وہ لوگ اس کمرے میں رکے نہیں۔ یعقوب نے دائیں طرف ایک دروازہ کھول دیا اور وہ لوگ ثینہ اور شارق کو دھکیلتے ہوئے اندر آ گئے۔ پہلے یعقوب اندر آیا تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی بتی جلا دی تھی۔ یہ کمرہ بالکل خالی تھا۔ کسی قسم کا فرنیچر اور نہ ہی فرش پر کوئی دری یا پٹائی بچھی ہوئی تھی۔

کے ناک اور ہونٹوں سے اب بھی خون رس رہا تھا۔

”دیکھ لیا قوبی۔“ دونوں میں سے ایک آدی نے یعقوب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم کہتے تھے ناکہ یہ لڑکی تو ایسی خطرناک نہیں لگتی۔ اب تو ہمیں یقین آگیا ناکہ اکو کو اسی نے قتل کیا تھا۔“

”میں سمجھ گیا جیلے۔“ یعقوب نے جواب دیا۔ ”اس کو تو میں ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ ساری تیزی بھول جائے گی۔“

”اس کا اب کیا کیا جائے۔ اسی وقت مانجھے کے پاس لے چلیں؟“ جیلے نے کہا۔ ”نہیں۔“ یعقوب نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ان دونوں کو باندھ کر اوپر والے کمرے میں ڈال دو۔ مانجھے کو ان کے بارے میں صبح اطلاع دی جائے گی۔ رات کو میں اس لڑکی کا گھونٹ بھروں گا تو اس کی ساری تیزی نکل جائے گی۔“ وہ خاموش ہو کر اپنی زخمی انگلی کی طرف دیکھنے لگا۔

جیلے کا دوسرا ساتھی کہیں سے رسیاں لے کر آیا اور وہ لوگ ان دونوں کو گن پوائنٹ پر اس کمرے سے نکل کر ایک اور کمرے میں لے آئے۔ اس کمرے میں اوپر جانے کے لئے بیڑھیاں تھیں۔ وہ بیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر بالکونی میں آگئے۔ بالکونی تقریباً پانچ فٹ چوڑی تھی اور اس کا حفاظتی جینگ بھی زیادہ اونچا نہیں تھا۔

جیلے کے ساتھی نے آگے بڑھ کر ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہو کر بتی جلا دی۔ یہ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ فرش پر دھول جی ہوئی تھی اور دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اودھڑا ہوا تھا۔ پچھلی طرف ایک کھڑکی تھی جو تقریباً تین فٹ چوڑی اور اوپر کی طرف چھ فٹ لمبائی میں تھی۔

پہلے شارق کے ہاتھ پیر پشت پر باندھ کر گرد آلود فرش پر ڈال دیا گیا پھر ٹینے کو بھی باندھ دیا گیا۔

”ابھی بہت رات باقی ہے۔“ یعقوب نے ٹینے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔ پھر میں تم سے نمٹ لوں گا۔“

وہ تینوں باہر چلے گئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ کمرے میں سواٹ کالبل روشن تھا جسے جلتا چھوڑ دیا گیا تھا۔ ٹینے اور شارق فرش پر پڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ٹینے کی آنکھوں میں خوف جھلک رہا تھا۔

”مجھے افسوس ہے ٹینے۔“ شارق نے مدہم لہجے میں کہا۔ ”میری وجہ سے تم پر پے در پے مصیبتیں پڑ رہی ہیں۔“

ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ یعقوب کی کھوپڑی پر ایک گھونٹہ لگا تو وہ لڑکھاتا ہوا ٹینے سے ٹکرا گیا۔ ٹینے بھی لڑکھاکر گری۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتی ان دو آدمیوں میں سے ایک کو موقع مل گیا اس نے لپک کر ٹینے کے ہاتھ سے رائفل چھین لی اور ٹینے پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

شارق دوسری رائفل کی طرف لپکا لیکن دوسرے شخص نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھ کر اس کے سینے پر ٹھوکر مار دی۔ شارق کراہ کر پیچھے گرا۔ دوسرے شخص نے رائفل اٹھالی۔ بازی ایک بار پھر پلٹ گئی تھی۔ اب ٹینے اور شارق ان کے رحم و کرم پر تھے۔

ایک طرف ٹینے پٹ رہی تھی اور دوسری طرف شارق اس آدی کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ یعقوب ایک طرف کھڑا ہاتھ کی پشت سے ناک اور ہونٹوں سے بننے والا خون پونچھتے ہوئے خون خوار نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ٹینے لڑائی بھڑائی نہیں جانتی تھی۔ لیکن صورت حال کچھ ایسی تھی کہ وہ ہاتھ پیر چلائے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ ہاتھ پیر چلا رہی تھی اور خوب چلا رہی تھی۔ پہلے اس نے یعقوب کی مرمت کی تھی پھر دوسرے آدی کی بھی اچھی خاصی ٹھکائی کر دی تھی اور اب خود پٹ رہی تھی۔

دوسری طرف شارق بھی پٹ رہا تھا۔ ایک موقع پر اسے اپنے حریف کو زیر کرنے کا چانس مل گیا تھا لیکن ٹھیک اسی لمحہ یعقوب نے آگے بڑھ کر اس کی پسلیوں پر زور دار ٹھوکر مار دی تھی۔ اور شارق ہلبلاتا ہوا دور جاگرا تھا۔ پھر اسے سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس کے حریف نے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی تھی۔

ٹینے بھی پٹ رہی تھی۔ ایک مرتبہ ٹینے کا داؤ چل گیا۔ وہ اس وقت پشت کے بل نیچے گری ہوئی تھی۔ اس کے حریف نے جیسے ہی اس پر چھلانگ لگائی ٹینے نے لیٹے ہی لیٹے اسے زور دار ٹھوکر مار دی۔ ٹینے کے پیروں میں جاگڑ تھے۔ ٹھوکر حریف کے منہ پر لگی اور وہ ہلبلاتا ہوا ایک طرف ڈھیر ہو گیا۔ ٹینے بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنے حریف پر حملہ آور ہونا ہی چاہتی تھی کہ دوسرے آدی نے گھوم کر اسے زور دار ٹھوکر مار دی۔

ٹھوکر زور دار تھی جو ٹینے کے پیٹ پر لگی تھی۔ اس کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور وہ فرش پر گر کر ترپنے لگی۔

شارق بھی بے بس ہو چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے بھی خون بہہ رہا تھا اور وہ ایک طرف دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہاپ رہا تھا۔ وہ دونوں آدی رائفلیں اٹھا چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی رائفل شارق پر تان رکھی تھی۔

یعقوب چند قدم دور کھڑا خونخوار نظروں سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس

ڈھیل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ چند منٹ کی مزید کوشش کے بعد اس نے گرہ کھول دی۔
 ٹینے ہاتھوں کو حرکت دینے لگی۔ رسی ڈھیلی ہوتے ہی اس کے ہاتھ گرفت سے آزاد ہو
 گئے۔ وہ اپنی کلائیاں سسلانے لگی۔ رسی خاصی مضبوطی سے باندھی گئی تھی جس سے اس کی
 کلائیوں پر سفید نشان پڑ گئے تھے۔

”پہلے اپنے پیر کھول لو اور پھر میری رسیاں کھولو۔“ شارق نے سرگوشی کی۔
 ٹینے اپنے پیروں کی رسی کھولنے لگی۔ گرہیں سخت ہونے کی وجہ سے اسے خاصی دشواری
 پیش آئی تھی لیکن بہر حال اس نے اپنے پیر بھی آزاد کر لئے۔ وہ بیٹھے بیٹھے شارق کی طرف مڑ
 گئی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔
 ”پہلے دروازے کی اندر سے کنڈی لگا دو۔ اگر کوئی آ بھی گیا تو ہمیں کچھ مہلت مل جائے
 گی۔“ شارق نے ایک بار پھر سرگوشی کی۔

ٹینے دبے قدموں چلتی ہوئی دروازے کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے بڑی احتیاط سے کنڈا چڑھا
 دیا۔ دروازہ خاصا مضبوط تھا اگر کوئی آ بھی گیا تو دروازہ اندر سے بند پا کر اسے توڑنے میں خاصا
 وقت لگے گا۔

وہ شارق کے پیچھے آ کر بیٹھ گئی اور اس کے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رسی کی گرہیں کھولنے کی
 کوشش کرنے لگی۔ اس کے لئے اسے اپنے دانت بھی استعمال کرنے پڑے تھے لیکن بالاخر وہ
 گرہیں کھولنے میں کامیاب ہو گئی۔

ہاتھ کھلتے ہی شارق اپنی کلائیاں سسلانے لگا پھر اس نے اپنے پیروں کی رسی کھولی اور اٹھ کر
 کھڑا ہو گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور دبے قدموں آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی کھلتے ہی
 شور کی آواز نمایاں ہو گئی۔ سامنے دو گلیوں کے بعد لاری اڑھ تھا۔ روٹیاں جگمگا رہی تھیں۔
 لاقداد بوسوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ بوسوں کے ہارن اور انجنوں کی آوازیں اب واضح طور پر
 سنائی دے رہی تھیں۔ لاری اڑے کے علاقے میں دن کا ساہن تھا۔

شارق نے کھڑکی سے باہر جھک کر نیچے جھانکا۔ یہ کھڑکی زمین کی سطح سے تقریباً تیس فٹ
 اونچی تھی۔ اس طرف بھی تاریک گلی تھی جو اس وقت سنسان پڑی تھی۔ ظاہر ہے رات کے پچھلے
 پہر کوئی مرگشت کرنے کو تو گھر سے نہیں نکل سکتا تھا۔

شارق مڑ کر ٹینے کی طرف دیکھنے لگا پھر اس نے فرش پر پڑی ہوئی رسیاں اٹھالیں۔ یہ دو
 رسیاں تھیں۔ ایک سے ٹینے کے ہاتھ پیر باندھے گئے تھے اور دوسری سے خود اس کے۔ اس نے
 دونوں رسیوں کو باندھ کر پہلے گرہ کی مضبوطی آزمائی اور پھر اندازے سے رسی کو تپانے لگا اس کے

”اب تو یہ سب کچھ ہو گا۔“ ٹینے نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے بے
 اختیار کراہ سی نکل گئی۔ ”اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسلے تو پڑیں گے ہی۔“

”ہائش! میں ان میں سے ایک کی گردن مروڑ سکتا۔“ شارق نے گمراہ سانس لیتے ہوئے کہا۔
 ”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم ان کے شکبے سے نکلیں گے کیسے؟“ ٹینے نے کہا۔
 ”مجھے سوچنے دو۔ شاید کوئی ترکیب ذہن میں آ جائے۔“ شارق بولا۔

”ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔“ ٹینے نے کہا۔ ”ہم شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔
 آوازیں نہ کر کوئی نہ کوئی تو ہماری مدد کو آئے گا۔“
 ”کسی مددگار سے پہلے یہ لوگ پہنچ جائیں گے اور ہمیں گولی مارنے میں کسی جیل و جت کا
 مظاہرہ نہیں کریں گے۔“ شارق نے جواب دیا۔

کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور لاری اڑے کی طرف سے بوسوں کے ہارن وغیرہ کا شور سنائی دے رہا
 تھا۔

”ایک ترکیب میرے ذہن میں آتی ہے۔“ شارق نے کہا۔
 ”وہ کیا؟“ ٹینے نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”لوٹ لگاتی ہوئی میرے قریب آ جاؤ۔ میں تمہارے ہاتھ کی بندشیں کھولنے کی کوشش کرتا
 ہوں۔ اگر ہم ایک دوسرے کے ہاتھ پیر کھولنے میں کامیاب ہو گئے تو اس کھڑکی کے راستے فرار ہو
 سکتے ہیں۔“ شارق نے کہا۔

”اس کھڑکی سے چھلانگ لگا کر ہم قبرستان یا ہسپتال ہی پہنچ سکتے ہیں۔“ ٹینے بولی۔
 ”یہ رسیاں خاصی مضبوط ہیں۔“ شارق نے کہا۔ ”اس کے ذریعے ہم لٹک کر اتر سکتے ہیں۔“
 بات ٹینے کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر لوٹ لگاتی ہوئی شارق کے
 قریب آنے لگی۔ شارق بھی فرش پر لوٹ لگا کر اس کے قریب آ گیا اور وہ دونوں ایک دوسرے
 سے پشت ملا کر بیٹھ گئے۔ شارق اگلیوں سے نٹول کر ٹینے کے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رسی کی گرہ
 کھولنے کی کوشش کرنے لگا لیکن گرہ اگلیوں کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔ شارق کچھ دیر
 کوشش کرتا رہا پھر بولا۔

”گرہ اگلیوں کی گرفت میں نہیں آ رہی تم اوندمی ہو جاؤ۔ میں دانتوں سے گرہ کھولنے کی
 کوشش کرتا ہوں۔“

ٹینے بیٹھے بیٹھے اوندمی گئی۔ شارق نے بھی رخ بدل لیا اور جھک کر دانتوں سے رسی کی گرہ
 کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ تقریباً پانچ منٹ کی کوشش کے بعد وہ گرہ

بڑی تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ ٹینہ تو کچھ زیادہ ہی خوفزدہ تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر ان کا منصوبہ ناکام ہو گیا تو وہ لوگ انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

چند سیکنڈ بعد باہر سے کنڈا ہٹائے جانے کی آواز سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ یعقوب کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ شارق اور ٹینہ کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس نے شراب پی رکھی تھی۔ دو تین قدم آگے بڑھ کر وہ رک گیا اور حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ٹھیک اسی لمحہ شارق نے اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے لئے ہوئے فرش پر ڈبیر ہو گیا۔

ٹینہ بھی یعقوب کی طرف لپکی۔

صورت حال کا اندازہ کر کے یعقوب کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ وہ شراب پی کر ٹینہ کے حسن و شباب سے کھینے کے لئے آیا تھا لیکن یہاں کی صورت حال نے اسے بدحواس کر دیا تھا۔ ٹینہ اور شارق نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ شارق نے اس کی گردن بڑی مضبوطی سے بازو کی لپیٹ میں لے رکھی تھی اور اسے زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا۔

یعقوب کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ ٹینہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تاکہ وہ زیادہ مزاحمت نہ کر سکے۔ یعقوب کی مزاحمت دو منٹ سے زیادہ جاری نہیں رہ سکی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ شارق نے اس کی گردن کو ایک دو اور جھٹکے دیئے اور پھر اسے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ یعقوب جیسے دیوتاقت شخص کی گردن مروڑنے میں اسے خاصی محنت کرنی پڑی تھی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا اور وہ ایک طرف کھڑا ہاپ رہا تھا۔ ٹینہ بھی اپنے تنفس پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

دو تین منٹ اور گزر گئے۔ شارق نے یعقوب کو ہلا جلا کر دیکھا اگر وہ مرا نہیں تھا تو کم از کم ایک گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آ سکتا تھا۔

”چلو۔ جلدی کرو زیادہ دیر یہاں رکنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“ شارق نے کہا۔

وہ دونوں کھڑکی کے قریب آ گئے۔ باہر جھانکتے ہوئے ٹینہ کو ایک بار پھر جھرجھری آ گئی۔ شارق نے اسے سارا دے کر کھڑکی کی چوٹ پر چڑھا دیا۔ اور اسے بڑی آہستگی سے دوسری طرف لٹکانے لگا۔ ٹینہ نے دونوں ہاتھوں سے رسی کو بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کے جسم کے مسلم بڑی تیزی سے پسینہ اگل رہے تھے۔ ہاتھوں کی ہتیلیاں بھی پسینے میں تر ہو رہی تھیں اور رسی پر گرفت قائم رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

”نچے مت دیکھو۔“ شارق نے سرگوشی کی۔ ”دیوار پر یہ جھلتے ہوئے آہستہ آہستہ نچے

خیال میں یہ رسی پچیس گز کے لگ بھگ تھی۔ وہ اسے ہاتھ میں پکڑے کھڑکی کے قریب آ کر چوٹ کو دیکھنے لگا۔ چوٹ کے نیچے کی طرف ایک اینٹ اکھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اینٹ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر چند جھٹکے دیئے۔ اینٹ باہر آ گئی۔ اس طرح چوٹ کے نیچے ایک غار پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے رسی کے سرے کو اس غار میں سے گزار کر چوٹ پر مضبوطی سے باندھ دیا اور ٹینہ کی طرف دیکھنے لگا اور پھر باقی رسی بڑی احتیاط سے باہر لٹکا دی۔

ٹینہ کھڑکی پر جھک کر باہر جھانکنے لگی۔ دوسرے ہی لمحہ وہ ایک جھرجھری سی لے کر پیچھے ہٹ گئی۔ رسی کے ذریعے اتنی بلندی سے اترنے کے خیال ہی سے اس کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔

”پہلے تم نیچے اتر دو گی۔“ شارق نے سرگوشی کی۔

”مہ... میں؟“ ٹینہ ہلکا گئی۔ ”اگر رسی ٹوٹ گئی یا میں گر گئی تو؟“

”تو پھر دو ہی جگہیں باقی ہیں جہاں تم جا سکتی ہو۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”قبرستان یا ہسپتال لیکن میرا خیال ہے کہ اگر تم احتیاط سے کام لو تو صحیح سلامت نیچے پہنچ سکتی ہو۔ چلو۔ کھڑکی پر چڑھو میں تمہیں سہارا دیتا ہوں۔ رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر پیر دیوار کے ساتھ جھلتے ہوئے آہستہ آہستہ نیچے اترتی رہنا۔“

شارق نے ٹینہ کا بازو پکڑ لیا۔ ٹینہ کھڑکی کے فریم پر چڑھنا ہی چاہتی تھی کہ باہر بالکونی میں قدموں کی آواز سن کر وہ دونوں چونک گئے۔

”میرا خیال ہے وہ یعقوب ہے۔“ شارق نے سرگوشی کی۔ ”وہ دروازے کو اندر سے بند پا کر سمجھ جائے گا کہ ہم نے اپنی رسیاں کھول لی ہیں اور اتنی جلدی ہم نیچے بھی نہیں اتر سکتے۔ وہ فوراً ہی ہماری تلاش شروع کر دیں گے۔ سب سے پہلے ان کا دھیان اسی کھڑکی کی طرف جائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ دروازہ بھی توڑنے کی کوشش کریں۔ اس طرح ہمارا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔“

”پھر...“ ٹینہ نے متوحش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ ”میں کنڈا کھول دیتا ہوں۔“ شارق نے سرگوشی کی۔ ”ہم دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہو جائیں گے۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہو گا ہم اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔“

وہ دونوں دبے قدموں تیزی سے کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئے۔ شارق نے بڑی احتیاط سے دروازہ کا کنڈا ہٹا دیا۔ ٹھیک اسی لمحہ قدموں کی آواز دروازے کے سامنے رک گئی۔ قدموں کی آواز سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ ایک ہی آدمی تھا۔

شارق اور ٹینہ دروازے کے دائیں بائیں دیوار سے چپکے کھڑے تھے۔ ان دونوں کے دل

اترے رہو۔

ثینہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔ اس نے دیوار کے ساتھ ٹکا رکھے تھے اور رے کو ایک ایک انچ کر کے چھوڑتی جا رہی تھی۔ اس نے چہرہ منٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد نیچے جھانک کر دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ نیچے تاریکی میں اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور وہیں رک گئی۔ ہتھیلیوں پر پسینے کی وجہ سے رسی ہاتھوں سے پھسل جاتی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ پھر نیچے پھسلنے لگی۔ ایک مرتبہ تو ہاتھوں سے پسینے کی وجہ سے وہ کئی فٹ تک نیچے پھسلتی چلی گئی تھی۔ رسی میں ایک جگہ گرہ ہونے کی وجہ سے اس کی گرفت جم گئی۔

ثینہ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دیوار ٹوٹی ہوئی ہونے کی وجہ سے اسے پیر پھسلنے کا موقع بھی مل گیا تھا۔ وہ فضا میں مطلق لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اس کا چہرہ پینے میں تر ہو رہا تھا اور پسینے کی دھاریں گردن پر بھی بہ رہی تھیں۔

ثینہ چند لمبے رے کو پکڑے لٹکی رہی اور ایک بار پھر آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی اور پھر دفعتاً رے اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ثینہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ زمین کی تاریک گہرائیوں میں گرتی جا رہی ہو اور پھر وہ دھب سے نیچے گری۔ زمین پر گرنے ہوئے بھی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

زمین تقریباً چھ فٹ کے فاصلے پر رہ گئی تھی کہ رسی ختم ہو گئی تھی۔ وہ جس جگہ گری تھی وہاں کچی زمین تھی اور کچھ بھی تھا۔ ثینہ کو اگرچہ چوٹ تو نہیں لگی تھی لیکن خوف سے وقتی طور پر اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا اور جب صدمے سے سنبھل کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو منہ سے بے اختیار کراہی نکل گئی۔ اس کے دائیں نغنے میں ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔ گرنے سے اس کے پیر میں موج آگئی تھی اور وہ خود سے اٹھ کر کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔

ثینہ کے چہرے پر کرب کے تاثرات پھیل گئے۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اسے دیوار کے ساتھ ایک ہولہ سا پھسلتا ہوا نظر آیا۔ وہ شارق تھا جو رسی کے سارے پھسلتا ہوا نیچے آ رہا۔ اور پھر وہ بھی دھب سے ثینہ کے قریب ہی گرا۔

”کیا ہوا ثینہ، تمہیں چوٹ تو نہیں لگی۔“ شارق نے سرگوشی میں پوچھا۔

”میں اوپر سے گر گئی تھی۔ دائیں پیر میں موج آگئی ہے۔ میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔“ ثینہ نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

شارق نے جھک کر اس کے پیر کو ٹٹولا۔ ثینہ کے منہ سے کراہی نکل گئی۔

”ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔“ شارق نے اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر ان دونوں میں سے کوئی اوپر چلا گیا تو انہیں پتہ چل جائے گا اور پھر ہمارے لئے اس علاقے سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ میرے سہارے آہستہ آہستہ چلنے کی کوشش کرو۔“

ثینہ اس کے ساتھ دو تین قدم چلی تھی کہ کراہتے ہوئے بیٹھ گئی۔

”نہیں شارق، میں نہیں چل سکتی۔“ وہ کراہی۔

”ٹھیک ہے، تم یہاں رکھو۔ میں دیکھتا ہوں۔ اگر ہماری گاڑی اب بھی اسی جگہ موجود ہے تو میں لے کر آتا ہوں۔“ شارق نے کہا اور ثینہ کو تاریکی میں دیوار کے ساتھ بٹھادیا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔

گلی کے موڑ پر پہنچ کر وہ ایک لمحہ کو رکا۔ دوسری طرف جھانک کر دیکھا۔ اس گلی میں بھی تاریکی تھی۔ شارق تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مندر کے سامنے سے گزر گیا اور ایک اور گلی مڑ کر اس طرف آگیا جہاں اس کی کار کھڑی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کار کے قریب آگیا۔

اس نے جب گاڑی یہاں چھوڑی تھی تو انجن تو بند کر دیا تھا لیکن چابی اکٹیشن ہی میں رہنے دی تھی۔ جیلے اور اس کے ساتھی نے بھی اس بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ وہ ان دونوں کو تو گن پوائنٹ پر لے کر مندر کی طرف چلے گئے تھے مگر گاڑی کو انہوں نے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا اور اب ان کی عدم توجہی شارق کے لئے سودمند ثابت ہوئی تھی۔ وہ بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور چابی گھما کر انجن اشارت کر دیا۔

شارق گاڑی کو ہلکی رفتار سے چلاتا ہوا پچھلی گلی میں آگیا اور پھر اس نے گاڑی اس گلی میں موڑ دی جہاں اس نے ثینہ کو چھوڑا تھا۔ ثینہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ شارق کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اس نے ثینہ کو سہارا دے کر اٹھایا اور اسے آہستہ آہستہ چلاتا ہوا کار تک لے آیا۔

”اوئے جیلے! اٹھ اؤئے۔ وہ دیکھ۔ وہ دونوں بھاگ رہے ہیں۔“

شارق یہ آواز سن کر بری طرح چونک گیا اس نے مڑ کر دیکھا۔ مندر کے نچلے کمرے کی عقبی کھڑکی میں جیلے کا دوسرا ساتھی نظر آ رہا تھا۔ اس نے شاید گاڑی کی آواز سن لی تھی اور جب اس نے کھڑکی سے جھانکا تو گاڑی کے ہیڈ لمپس کی روشنی میں ان دونوں کو دیکھ کر بری طرح چیخا تھا۔

شارق نے پنجرز سیٹ کا دروازہ کھول کر ثینہ کو اندر دھکیل دیا۔ اس طرح ثینہ کے پیر کو جھٹکا لگا تو اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ شارق بڑی پھرتی سے کار کے سامنے سے گھوم کر

دو موریہ پل کے قریب سے ہوتے ہوئے شارق گاڑی کو سیدھا لیتا چلا گیا۔ ریلوے اسٹیشن وہاں سے تقریباً تین فرلانگ آگے تھا لیکن ایک فرلانگ آگے جانے کے بعد شارق نے گاڑی دائیں طرف ایک تنگ سی گلی میں موڑ لی۔

یہ نوکھا کا علاقہ تھا اور نوکھا تھانے کے عین عقب میں واقع تھا۔ یہاں گلیوں میں پرانے اور ری کنڈیشنڈ ٹائزوں کی بہت بڑی مارکیٹ تھی۔ جگہ جگہ ٹائزوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ربر کی بو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

پورے علاقے میں سناٹا تھا۔ مارکیٹ کا چوکیدار بھی کہیں دیک کر بیٹھا ہوا تھا۔ شارق نے گاڑی ایک اور تنگ سی گلی میں موڑ کر ایک تین منزلہ مکان کے سامنے روک لی۔ اس علاقے کے سارے ہی مکان بہت پرانے تھے اور بعض تو ایسے تھے جن کے کسی بھی وقت ڈھیر ہو جانے کا خدشہ تھا لیکن ان مکانوں میں بھی رہائش موجود تھی۔

شارق نے جس مکان کی سامنے کار روکی تھی وہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ نیچے دکانیں تھیں جو بند تھیں۔ اوپر کی منزل پر بھی ٹائزوں کی دکانیں تھیں اور ظاہر ہے اس وقت ساری دکانیں بند تھیں۔ نیچے والی دکانوں کے بیچ میں ایک چھوٹا لکڑی کا دروازہ تھا۔ جس کا ایک پٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ شارق نے کار کے شیشے چڑھا دیئے۔ اگنیشن سے چابی نکال کر جیب میں ڈال لی۔ نیچے اتر کر دروازہ بند کر کے لاک کر دیا۔ دوسری طرف سے آکر اس نے ٹینے کو سہارا دے کر نیچے اتارا اور کار کا دروازہ لاک کر دیا۔ وہ ٹینے کو سہارا دے کر چلاتا ہوا مکان کے دروازے تک لے گیا۔

دروازے کے اندر زینہ تنگ سا تھا اور روشنی بھی نہیں تھی۔ شارق ٹینے کو سہارا دے کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سیڑھیاں بھی ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ تارکی میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ ٹٹول ٹٹول کر قدم رکھتے ہوئے بہت آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہے تھے۔

تیسری منزل پر ایک دروازے کے سامنے وہ رک گئے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ٹینے ہانپ گئی تھی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ شارق نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ لیکن دو تین منٹ گزرنے کے بعد بھی دروازہ نہیں کھلا تو دوسری مرتبہ اس نے ذرا زور سے دستک دی۔ اس کے ایک منٹ بعد اندر سے ایک خواہیدہ سی آواز سنائی دی۔

”کون ہے؟“

”میں ہوں شارق۔ دروازہ کھولو۔“ شارق نے کہا۔

وہ آواز خاصی بھاری تھی۔ آواز سے ٹینے نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ادھیڑ عمر بھاری بھر کم آدمی ہو گا لیکن جب دروازہ کھلا تو اسے دیکھ کر چونک گئی۔ وہ کوئی مرد نہیں ادھیڑ عمر عورت تھی۔

اسٹیزنگ سائیڈ پر آگیا اور سیٹ پر بیٹھتے ہی انجن کو گئیر میں ڈال دیا۔

یہ بھی غنیمت تھا کہ مندر کی اس عقبی کھڑکی میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ کمرہ چونکر گراؤنڈ فلور پر تھا اس لئے سلاخیں لگی ہوئی تھیں اگر سلاخیں نہ ہوتیں تو جیلا یا اس کا ساتھی کھڑکی سے کود کر باہر آچکے ہوتے۔

گاڑی چند گز آگے نکلی تھی کہ فضا فائر کی خوفناک آواز سے گونج اٹھی۔ گولی پچھلی وینڈ اسکرین کو توڑتی ہوئی ٹینے کے پیچھے والی کھڑکی سے نکل گئی تھی۔ ٹینے کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ ایک دم نیچے جھک گئی تھی۔

شارق نے ایک دم ایکسپلریشن پر پیر کا دباؤ بردھا دیا۔ گاڑی کو ایک زور دار جھٹکا لگا۔ ٹینے اب بھی جھکی بیٹھی تھی ایک اور فائر ہوا۔ لیکن گاڑی اب بہت آگے نکل چکی تھی۔ اگلے موڑ پر رفتار کم کئے بغیر گاڑی گھما دی۔ یہ ایک تنگ سی گلی تھی جس میں لاتعداد درکشاپ تھے اور جگہ جگہ ٹوٹی پھوٹی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ شارق کی کار گلی میں ایک کار کے ڈھانچے سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔

شارق کار کو مختلف گلیوں میں گھماتا ہوا سڑک پر آگیا۔ اب اس کے سامنے دو راستے تھے۔ پہلا راستہ تو یہ تھا کہ وہ بائیں طرف ریلوے اسٹیشن کی طرف نکل جاتا اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ دائیں طرف شاہی قلعہ اور اقبال پارک کے درمیان والی سڑک پر سے ہوتا ہوا واپس دربار اور بھائی کی طرف نکل جاتا۔

ان دونوں کے حلے ایسے نہیں تھے کہ پورے شہر کا سفر آرام سے کر سکتے۔ دونوں کے ناک اور ہونٹ زخمی تھے۔ کپڑے خون آلود تھے۔ ٹینے کی اور شارق کی فیض بھی پھٹی ہوئی تھی۔ اٹھتے ہوئے بال اور چروں پر چوٹوں کے نشان تھے۔ راستے میں کہیں پولیس والے چیک کرنے کے لئے روک لیتے تو کسی قسم کی گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ اس لئے شارق نے لمبا راستہ اختیار کرنے کے بجائے قریبی منزل پر پہنچنے کا فیصلہ کرتے ہوئے گاڑی کو بائیں طرف گھما دیا۔

اس وقت غالباً ساڑھے تین بجے تھے۔ اک موریہ پل کے اوپر کوئی مال گاڑی گزر رہی تھی۔ پل کے نیچے دیوار کے ساتھ دو پولیس والے کھڑے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ انہوں نے کار کی طرف دیکھا تو تھا مگر توجہ نہیں دی تھی۔

یہاں سے تین اطراف میں سڑکیں نکلتی تھیں۔ ایک سڑک پل کے نیچے مصری شاہ کی طرف دوسری دائیں سمت دلی دروازے کی طرف اور ایک سڑک ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ سیدھی ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی گئی تھی۔ ریلوے لائن سڑک سے تقریباً بیس فٹ اونچی تھی۔

کمرے سے نکل گئی۔

پندرہ بیس منٹ بعد وہ پہاڑی کوے جیسی آواز والی عورت ایک کٹورے میں سرسوں کے تیل میں ہلدی ملا کر گرم کر کے لے آئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے ٹینہ کا پیر پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے ماش کرنے لگی۔ اس نے پیر کو ایک دو ایسے جھٹکے دیئے کہ ٹینہ کی چیخیں نکل گئیں۔ ماش کرنے کے بعد اس نے پیر پر پکڑا لپیٹ دیا۔

”بس اب آرام سے لیٹ جاؤ۔ پیر کو ہلانا مت۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ وہ عورت تیل والا کٹورہ اٹھا کر باہر چلی گئی۔

”یہ عورت کون ہے اور یہ گھر کس کا ہے؟“ ٹینہ نے شارق سے پوچھا۔

”بھولے کی ماں ہے۔ ر۔ شمال نام ہے اس کا۔“

”مجھے تو یہ کوئی جلاہ لگتی ہے۔“ ٹینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”کیسی بے دردی سے میرے پیر کو جھٹکے دیئے تھے۔ آواز تو اس کی پہاڑی کوے جیسی ہے اور نام ر۔ شمال۔۔۔۔۔“

”بہت اچھی عورت ہے۔“ شارق نے اس کے ریمارکس پر توجہ دیئے بغیر کہا۔ ”دو تین دن یہاں رہو گی تو تم اس کی گردیدہ ہو جاؤ گی۔ اس کی ایک بیٹی بھی ہے حمیرا۔ میٹرک میں پڑھتی ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ ملو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔“

”کہاں ہے وہ؟“

”بھولے کے ساتھ سیالکوٹ گئی ہے صبح آجائے گی تو مل لینا۔“

”یہ کون لوگ ہیں۔ تمہارا ان سے کیا تعلق ہے؟“ ٹینہ نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بھولے کا باپ میرے گروہ میں تھا۔ چند ہفتے پہلے پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ یہ مکان ان کا اپنا ہے۔ نیچے کی دونوں منزلیں کرائے پر دے رکھی ہیں۔ بھولا انٹر پاس ہے۔ کوئی نوکری نہیں ملی تو ہمیں ٹائر مارکیٹ میں ایک دکان پر کام کرنے لگا۔ اسے کاروبار کی کچھ سمجھ بوجھ آگئی ہے۔ میرے مشورے پر اب اپنی دکان کھول رہا ہے۔ اپنی بی بی بلڈنگ کے ایک دکاندار کو دکان خالی کرنے کا نوٹس دے رکھا ہے۔ دس بارہ دن تک وہ دکان خالی ہو جائے گی تو بھولا اپنا کام شروع کر دے گا۔ اسے کبوتروں کا شوق ہے۔ باہر پنجرہ دیکھا ہے تم نے۔ یہ کبوتر اسی نے پال رکھے ہیں۔ کبوتروں کے ساتھ چنگ بازی کا بھی شوق ہے۔ صبح آئے گا تو دیکھنا کتنی چنگیں اور ڈوزیں جمع کر رکھی ہیں اس نے۔“

”معلوم ہوتا ہے تم لوگ کسی سے لڑ کر آئے ہو۔ کیا حالت ہو رہی ہے تم دونوں کی۔ تم ان

سامنے کشادہ محن تھا۔ آخر میں تین کمرے تھے۔ ایک دیوار پر بلب روشن تھا۔ بائیں ایک کمرے کے برابر کبوتروں کا بہت اونچا پنجرہ تھا اس کے دائیں بائیں کبوتروں کے لئے دو اونچی چھتریاں لگی ہوئی تھیں۔ پنجرے میں لاتعداد کبوتر بھرے ہوئے تھے۔

شارق، ٹینہ کو لے کر اندر آ گیا۔ وہ عورت ٹینہ کو دیکھ کر چوٹکے بغیر نہیں رہ سکی وہ اس نے دروازہ بند کر دیا اور ابھی ہوئی نظروں سے شارق کی طرف دیکھنے لگی۔

”بھولا گھر پر نہیں ہے کیا؟“ شارق نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

”سیالکوٹ گیا ہوا ہے آج آتا تھا مگر آیا نہیں شاید صبح سویرے آ جائے۔“ اس عورت جواب دیا۔ اس کی آواز پہاڑی کوے جیسی بھاری تھی۔

”کمرے کا دروازہ کھولو۔ اس کے پیر میں موج آگئی ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے شارق نے کہا۔

اس عورت نے آگے بڑھ کر ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہو کر بتی بھی دی۔ شارق، ٹینہ کو لے کر کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں ایک چارپائی تھی جس پر صاف ستھرا بچھا ہوا تھا۔ ایک چھوٹی سی میز تھی۔ دو کرسیاں تھیں اور کھوئی پر کچھ زنانہ کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ لیکن ٹینہ کے خیال میں یہ کپڑے اس عورت کے نہیں ہو سکتے تھے۔ میز پر کچھ کاپیاں اور کتابیں بھی پڑی تھیں جو ٹینہ کے اس خیال کی تصدیق کر رہی تھیں۔

شارق نے ٹینہ کو چارپائی پر بٹھا دیا۔

”کون ہے یہ؟ کیا ہوا اسے؟“ اس عورت نے ٹینہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ ٹینہ ہے۔ اس کے پیر میں موج آگئی ہے۔“ شارق نے جواب دیا۔

”اے۔۔۔۔۔ یہ ہے ٹینہ۔“ وہ عورت بولی۔ ”موج کا علاج تو بہت آسان ہے۔ اپنا پیر دکھا مجھے۔“

ٹینہ اس وقت پینٹ شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس نے پانچہ اوپر اٹھا دیا۔ اس کا ننھ سو جھٹ تھا۔ اس عورت نے اس کے پیر کو ٹٹول کر دیکھا تو ٹینہ کے منہ سے کراہ سی نکل گئی۔

”اس پیر میں پہلے بھی موج آئی تھی؟“ اس عورت نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ٹینہ نے جواب دیا اسے فیصل آباد کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب قبرستان میں نوکھٹا اڑنے پر پولیس پارٹی نے چھاپہ مارا تھا اور وہاں سے بھاگتے ہوئے اس کے اسی پیر میں موج آگئی تھی۔

”میں ماش کر دیتی ہوں۔ تین چار دن میں تمہارا پیر ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ عورت کہتی ہوئی

میں سے کوئی کپڑے پہن لو۔“ اس نے ثینہ کو مخاطب کرتے ہوئے کھوٹی پر ہنکے ہوئے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور شارق بیٹا..... تم بھی بھولے کے کمرے میں جا کر کپڑے بدل لو۔ مگر لوگوں کی یہ حالت ہوئی کیسے؟“

”کچھ لوگوں کے ہتھ چڑھ گئے تھے۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا پھر ثینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم کپڑے بدل کر سو جاؤ..... صبح دیکھا جائے گا۔“

شارق اور ریشم کمرے سے نکل گئے۔ ثینہ نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور کھوٹی سے ایک جوڑا اتار کر اپنے کپڑے بدلنے لگی۔

کپڑے بدلنے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے جسم میں کئی جگہوں سے ٹیسس سی اٹھ رہی تھیں اس وقت کی لگی ہوئی چوٹیں اب اپنا رنگ دکھا رہی تھیں۔ ثینہ دانت بھینچے لیٹی رہی اور بالاخر نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

یعقوب اوپر چلا گیا۔

جیلا اور اس کا ساتھی رحمت اسی کمرے میں درمی پر بیٹھے رہے۔ ان کے سامنے گلاس اور شراب کی دو بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ پانی کا جگ بھی تھا۔ ایک بوتل بالکل خالی ہو چکی تھی اور دوسری میں کچھ شراب باقی تھی۔ یعقوب اس مندر میں ہیروئن کے علاوہ چرس اور دسی شراب بھی فروخت کرتا تھا۔ اس کے گاہکوں میں زیادہ تعداد موٹر سائیکلوں، تھیلے والوں اور اسی قسم کے لوگوں کی تھی بیشتر نوجوان بھی آتے تھے مگر ان کی آمد و رفت زیادہ تر شام سے پہلے ہی رہتی تھی۔ نوجوان ہیروئن کے شوقین تھے۔ شام سات سے رات دس، ساڑھے دس بجے تک موٹر سائیکل قسم کے لوگ آتے تھے اور ان لوگوں کو زیادہ دلچسپی شراب سے تھی۔

ماجھا گجر نے آج شام سے پہلے ہی شارق کے ڈیرے پر حملہ کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا ڈیرے کو آگ لگانا بھی اس کے منصوبے میں شامل تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی تھی کہ اگر شارق ہاتھ لگ جائے تو اسے پکڑ کر یعقوب کے اس ڈیرے پر لے آئیں۔

ماجھے نے بارہ بجے تک یہاں انتظار کیا تھا پھر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ اس نے یعقوب کو ہدایت کر دی تھی کہ اگر کوئی بہت ہی اہم اطلاع ملے تو اسے فوراً اندرونی کھڑکی پر مطلع کر دیا جائے۔ جیلا، یعقوب کا آدمی تھا اور رحمت، ماجھا گجر کا۔ شارق کے ڈیرے کو آگ لگانے کے بعد ان کے دوسرے ساتھی تو تتر بتر ہو گئے تھے اور جیلا اور رحمت وہیں ٹپکتے رہے تھے۔ جیلے کا خیال تھا کہ ڈیرے کو آگ لگنے کی اطلاع پا کر شارق وہاں ضرور آئے گا اور وہ لوگ اسے گرفت میں لینے

کی کوشش کریں گے۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ شارق، ثینہ کے ساتھ محض اتفاق سے اس طرف آ نکلا تھا اور بڑی آسانی سے وہ دونوں ان کے ہاتھ بھی لگ گئے تھے۔ وہ لوگ انہیں مندر میں لے آئے تھے۔

رحمت کا خیال تھا کہ ماجھا گجر کو ان کے بارے میں فوراً ہی اطلاع دے دی جائے لیکن ثینہ کو دیکھ کر یعقوب کی رال ٹپک پڑی تھی۔ یعقوب کا شاید یہ خیال تھا کہ ثینہ اس کے لئے تر نوالہ ثابت ہو گی لیکن ان دونوں نے مار مار کر یعقوب کا حلیہ ہی بگاڑ دیا تھا اور اگر جیلا اور رحمت مداخلت نہ کرتے تو شاید وہ دونوں اسے ختم ہی کر دیتے۔ شارق اور ثینہ کو قابو میں کرنے کے لئے انہیں بڑی محنت کرنا پڑی تھی۔ رحمت نے اس وقت بھی مشورہ دیا تھا کہ ماجھا گجر کو اطلاع دے دی جائے مگر یعقوب نے سختی سے منع کر دیا۔ اب وہ ثینہ سے اپنی توہین کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

وہ تینوں اس کمرے میں آ گئے۔ یعقوب نے اپنی زخمی انگلی شراب میں تر کر کے اس پر پٹی باندھ لی تھی اور وہ تینوں بیٹھ کر شراب پینے لگے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد یعقوب اٹھ گیا۔ اس نے ان دونوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں بھی ثینہ سے اپنی توہین کا بدلہ لینے کا موقع دے گا۔

یعقوب کے جانے کے بعد وہ دونوں بیٹھے شراب پیتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ دس پندرہ منٹ بعد ہی انہوں نے ایک ہلکی سی نسوانی چیخ سنی تھی۔ رحمت کا خیال تھا کہ چیخ کی آواز عقبی گلی سے آئی تھی۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا بھی تھا۔ لیکن تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ دوبارہ جیلے کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

تقریباً دس منٹ اور گزر گئے۔ پھر ایک کار کے انجن کی آواز سنائی دی۔ آواز سے بالکل ایسا لگا تھا جیسے وہ کار پچھلی گلی میں رکی ہو۔ رحمت ایک بار پھر اٹھ کر کھڑکی سے جھانکنے لگا۔ کھڑکی میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ گردن باہر نہیں نکال سکتا تھا لیکن کھڑکی سے قدرے بائیں طرف گلی میں ایک کار کو دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ کار کے ہیڈ لیمپس روشن تھے لیکن اس کے اندر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا اور پھر دفعتاً ”وہ چونک گیا بائیں طرف سے ایک آدمی کسی عورت کو سارا دے کر کار کی طرف لا رہا تھا۔ وہ عورت لنگڑا رہی تھی۔ وہ اگرچہ براہ راست کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں نہیں تھے لیکن ان کے چہرے صاف نظر آ رہے تھے۔ دوسرے ہی لمحہ وہ اچھل پڑا۔ اس نے شارق اور ثینہ کو پہچان لیا تھا وہ مڑ کر جیلے کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا۔

”اوئے جیلے..... اٹھ اوئے..... وہ دیکھ..... وہ دونوں بھاگ رہے ہیں۔“

”بھاگنے دے یار۔“ جیلے نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش

تھی۔ ”کہاں تک بھاگیں گے۔ تھک کر خود ہی گر جائیں گے۔“

”لوئے میں ٹینہ اور شارق کی بات کر رہا ہوں۔“ رحمت نے قریب آ کر جیلے کو جھنجھوڑ دیا۔ ”وہ دونوں کار میں بھاگ رہے ہیں۔“

”ٹینہ اور شارق....“ جیلا بڑبڑایا پھر ایک دم جیسے ہوش میں آ گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کہاں ہیں وہ دونوں.... کہاں بھاگ رہے ہیں....“

”بچھلی گلی میں کار پر بیٹھ رہے ہیں۔“ رحمت نے جواب دیا۔ جیلا کھڑکی کی طرف لپکا۔ وہ شاید کھڑکی سے چھلانگ لگانا چاہتا تھا مگر سلاخوں سے سر ٹکرا گیا۔ اس ٹکرمے ساتھ ہی اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

رحمت بھی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اگر وہ مندر سے نکل کر بچھلی گلی میں جا کر انہیں روکنے کی کوشش کریں گے تو انہیں بہت دیر ہو جائے گی۔ شارق اور ٹینہ نکل جائیں گے۔ انہیں روکنے کی ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے لپک کر رانفل اٹھالی اور کھڑکی کی سلاخوں سے نال باہر نکال کر گولی چلا دی۔ گولی کار کی بچھلی وڈ اسکرین پر لگی لیکن شاید ان دونوں میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اس نے دوسرا فائر کیا لیکن اس دوران کار آگے نکل گئی تھی۔ کھڑکی میں سلاخوں کی وجہ سے وہ رانفل کی نال کو زیادہ نہیں گھما سکتا تھا۔

”وہ نکل گئے.... بھاگو ان کے پیچھے۔“ رحمت چیخا۔

وہ دونوں دوڑتے ہوئے کمرے سے نکلے۔ ان کا رخ مندر سے باہر جانے والے دروازے کی طرف تھا۔ مندر کے مرکزی ہال میں بلب روشن تھا۔ وہ دروازے کے قریب رک گئے۔ دروازے کو اندر سے کنڈالگا ہوا تھا۔

”دروازہ تو بند ہے۔“ جیلا بڑبڑایا۔ ”وہ لوگ باہر کیسے جاسکتے ہیں۔ تمہیں کار والوں کو پہچانے میں غلطی تو نہیں ہوئی۔“

”میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ وہی دونوں تھے۔ میرے ساتھ آؤ۔“ رحمت نے کہہ اور وہ دونوں اس کمرے میں آ گئے جس میں اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ وہ دونوں دوڑتے ہوئے سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے، بالکونی میں بھی رکے بغیر وہ اس کمرے کی طرف دوڑے جمال شارق اور ٹینہ کو باندھ کر ڈالا گیا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے اندر گھس گئے لیکن دوسرے ہی لمحہ انہیں ٹھک کر رک جانا پڑا۔ سامنے فرش پر یعقوب آڑا ترچھا بے حس و حرکت پڑا تھا اور ٹینہ اور شارق غائب تھے۔ جیلا بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر یعقوب پر جھک گیا۔ پہلے اسے ہلایا جلا یا پھر ار

کی ٹانگیں کے سامنے ہاتھ رکھ دیا۔ سانس کی آمد و رفت جاری تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ زندہ تھا۔

”یہ.... یہ دیکھو.... وہ لوگ اس کھڑکی کے راستے فرار ہوئے ہیں۔“

جیلا، رحمت کی آواز سن کر اس کے قریب آ گیا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ کھڑکی کی چوٹ سے بندھی ہوئی رسی نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ وہ دونوں اس کھڑکی کے راستے کس طرح فرار ہوئے تھے۔ رحمت نے رسی اوپر کھینچ لی تھی۔

”اس کا مطلب ہے کہ یعقوب کے اوپر آنے سے پہلے وہ لوگ اپنے ہاتھ پیر کھول چکے تھے۔“ جیلا قیاس آرائی کرتے ہوئے بولا۔ ”یعقوب جیسے ہی اندر داخل ہوا انہوں نے اس پر حملہ کر دیا اور اسے بے بس کرنے کے بعد اس رسی کے ذریعے کھڑکی کے راستے فرار ہو گئے۔“

”یقیناً ایسا ہی ہوا ہو گا۔“ رحمت نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

”ان کے پیچھے جانا بے کار ہے۔“ جیلے نے کہا۔ ”اب تک وہ بہت دور نکل چکے ہوں گے۔ اسے نیچے لے کر چلو.... اس کی حالت تو بری ہے شاید بچ جائے۔“ اس نے یعقوب کی طرف اشارہ کیا۔

یعقوب دیو قامت تھا۔ وہ دونوں اسے کسی نہ کسی طرح نیچے والے کمرے میں لانے میں کامیاب ہو گئے اور پھر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

یعقوب ہوش میں نہیں آ سکا تھا وہ ہوش میں آئے بغیر ہی ختم ہو گیا۔

”اب کیا ہو گا؟“ جیلے نے عجیب سی نگاہوں سے رحمت کی طرف دیکھا۔

”ہونا کیا ہے؟ اس کی لاش کو یہیں رہنے دو اور نکل چلو یہاں سے۔“ رحمت نے جواب دیا۔

”تین بچ رہے ہیں۔ راستے میں پولیس نے روک لیا تو جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔ دن

چڑھنے دو پھر نکلنے ہیں یہاں سے....“ جیلے نے جواب دیا۔

رات کا باقی حصہ بھی انہوں نے جاگتے ہوئے ہی گزارا تھا۔ اور پھر جیسے ہی دن کی روشنی ظلوع ہوئی وہ دونوں مندر سے نکل آئے۔ انہوں نے چادریں اوڑھ رکھی تھیں جن کے اندر رانفیل چھپی ہوئی تھیں۔ انہیں مندر سے نکلے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ محتاط انداز میں چلتے ہوئے لاری اڑے میں داخل ہو گئے اور پھر دوسری طرف سے سڑک پر نکل آئے۔ وہاں سے انہیں فوراً ہی رکشہ مل گیا اور وہ رکشے پر بیٹھ کر ماجھا گجر کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئے۔

جب وہ لوگ ماجھا گجر کی کوٹھی پر پہنچے تو سورج ابھی ظلوع نہیں ہوا تھا۔ ماجھا گجر سو رہا تھا اسے جگا دیا گیا۔ جیلا اور رحمت، ماجھا گجر کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لئے اس کے

جسوں پر گھومتا ہوا سلطان سرائے آگیا۔ یہاں وہ اپنے ایجنٹ کی چائے کی دکان کے سامنے بیٹھ کر بیٹھا ایک اور آدمی سے باتیں کر رہا تھا کہ دو آدمی سامنے والے بیٹھ پر آکر بیٹھ گئے۔ ان میں ایک بے تحاشہ موٹا داڑھی والا آدمی تھا۔ اسے ماجھا گجر بھی جانتا تھا۔ وہ صوفی کے نام سے مشہور تھا اور سلطان سرائے ہی میں اس کی کباڑی کے دکان تھی۔ ماجھا گجر سے کبھی کبھار اس کی علیک سلیک ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے مانجھے کو دیکھ کر سلام کیا تھا۔ دوسرا آدمی اس کا مہمان تھا جسے وہ چائے پلانے کے لئے لایا تھا۔

”تمہارا ٹرک ٹھیک ہوا یا نہیں؟“ صوفی کے مہمان نے پوچھا۔

”ورکشاپ میں کھڑا ہے۔“ صوفی نے جواب دیا۔ ”پتہ نہیں راجہ نے کیا کیا ہے اس کا انجن ہی بیٹھ گیا ہے۔ اب اس پر اچھی خاصی رقم لگے گی۔“

”راجہ کو ٹرک کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟“ مہمان نے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ صوفی نے جواب دیا۔ ”اس دن میرے پاس آیا اور ٹرک پر اسکرپ لودا کر لے گیا تھا لیکن دوسرے دن وہ ٹرک پر اسکرپ بھی واپس لے آیا تھا۔ اس وقت تو ٹرک ٹھیک ٹھاک تھا لیکن شام کو جب ڈرائیور نے اشارت کرنے کی کوشش کی تو اشارت نہیں ہوا۔“

”راجہ جیسے آدمی کا اسکرپ سے کیا کام؟“ مہمان نے پوچھا۔

”پتہ نہیں مجھے کچھ گزربو لگتی ہے۔“ صوفی نے کہا۔ ”اس دن کے بعد راجہ سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ ورنہ اس سے پوچھتا کہ ٹرک کے ساتھ اس نے کیا کیا ہے۔“

ان کی باتوں میں راجہ کا نام سن کر ماجھا گجر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ راجہ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ لنڈے کے علاقے میں گھوم پھر کر ہیروئن فروخت کرتا تھا۔ وہ کسی ایک پارٹی سے وابستہ نہیں تھا۔ مختلف پارٹیوں سے مال لیتا تھا۔ کئی مرتبہ مانجھے سے بھی مال لے چکا تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ شارق سے مال لیتا تھا یا نہیں لیکن صوفی اور اس کے مہمان میں ہونے والی گفتگو سے اس کا ذہن کچھ الجھ گیا تھا۔ راجہ منشیات فروش تھا اس کا اسکرپ سے کیا کام؟ اور پھر وہ ٹرک پر اسکرپ لودا کر لے گیا اور دوسرے دن اسکرپ بھی واپس لے آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے اسکرپ سے لے ہوئے ٹرک کی ضرورت تھی۔ ہو سکتا ہے وہ اسکرپ کی آڑ میں کوئی چیز کہیں لے کر گیا ہو۔

صوفی جب اپنے مہمان کے ساتھ اٹھ کر جانے لگا تو مانجھے نے اسے روک لیا۔

”صوفی یار میری ایک بات سننا ذرا۔“

”فرماؤ استاذ جی۔“ صوفی اس کے قریب آگیا۔ اس کا مہمان دور ہی کھڑا رہ گیا۔

غصے سے بچنے کے لئے انہوں نے راستے ہی میں ایک فرضی کہانی گھڑ لی تھی تاکہ انہیں مانجھے کے غصے کا نشانہ نہ بننا پڑے۔

”شارق کا مزنگ والا ڈیرہ جل کر راکھ ہو گیا ہے۔“ جیلا اسے بتا رہا تھا۔ ”رات ایک بجے شارق کی دوست ٹینہ ہمارے ہاتھ لگ گئی تھی۔ ہم اسے مندر لے گئے تھے۔ ہم مندر پہنچے ہی تھے کہ ہمیں اطلاع ملی کہ شارق اپنے تین آدمیوں کے ساتھ آپ کے نسبت روڈ والے ڈیرے کی طرف جا رہا ہے۔ ہم نے سوچا کہ اچھا موقع ہے۔ ہم شارق کو بھی گرفت میں لے سکتے ہیں۔ ہم ٹینہ کو یعقوب کے حوالے کر کے نسبت روڈ کی طرف روانہ ہو گئے لیکن وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ ہمیں غلط اطلاع ملی تھی میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ ہمارے ساتھ دھوکا تو نہیں ہوا۔ ہم فوراً واپس دوڑے۔“

جب ہم مندر میں پہنچے تو میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی۔ ٹینہ غائب تھی اور یعقوب بے ہوش پڑا تھا۔ اسے بڑی مشکل سے ہوش میں لایا گیا اس کی حالت بہت ابتر تھی۔ وہ زندگی کی آخری سانس لے رہا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے بتایا کہ شارق اور اس کے دو ساتھی وہاں آئے تھے اور وہ ٹینہ کو چھڑا کر لے گئے۔ یعقوب نے مزاحمت کی تو انہوں نے اس کی گردن مروڑ دی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ اس وقت تک زندہ کیسے رہا تھا۔“

”شارق کو کیسے پتہ چلا کہ ٹینہ کو وہاں لے جایا گیا ہے؟“ ماجھا گجر بولا۔

”پتہ نہیں۔“ جیلے نے کندھے اچکا دیئے۔ ”ویسے ہو سکتا ہے شارق کے کسی آدمی نے ہمارا پیچھا کر کے اس ٹھکانے کا پتہ معلوم کر لیا ہو اور پھر شارق کو اطلاع دے دی ہو اور شارق نے ہمیں وہاں سے ہٹانے کے لئے کسی آدمی تک اطلاع پہنچا دی ہو کہ وہ آپ کے نسبت روڈ والے ڈیرے پر جا رہا ہے۔ اس طرح موقع پا کر وہ مندر سے ٹینہ کو نکال لے گیا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہمارا کوئی اوڈہ بھی شارق کی نگاہوں سے محفوظ نہیں رہا۔“ ماجھا گجر نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش نمایاں تھی۔

”اگر تم اجازت دو تو ہم شارق کے دو تین آدمیوں کو اٹھالیں۔ ان میں سے کسی سے تو شارق کا پتہ چل جائے گا۔“ جیلے نے کہا۔

”کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“ مانجھے نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کے کتنے آدمی ہمارے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ مگر کسی نے بھی اس کے خلاف زبان نہیں کھولی تھی۔ اب میں خود معلوم کروں گا کہ وہ بزدل چوہا کہاں چھپا ہوا ہے۔“

ماجھا گجر سارا دن اپنی کونٹھی میں رہا۔ شام سے ذرا پہلے وہ کونٹھی سے رخصت ہو کر مختلف

بہوں پر گھومتا ہوا سلطان سرے آگیا۔ یہاں وہ اپنے ایجنٹ کی چائے کی دکان کے سامنے بیچ پر بیٹھا ایک اور آدمی سے باتیں کر رہا تھا کہ دو آدمی سامنے والے بیچ پر آکر بیٹھ گئے۔ ان میں ایک بے تحاشہ موٹا داڑھی والا آدمی تھا۔ اسے ماجھا گجر بھی جانتا تھا۔ وہ صوفی کے نام سے مشہور تھا اور سلطان سرے ہی میں اس کی کباڑیے کی دکان تھی۔ ماجھا گجر سے کبھی کبھار اس کی علیک سلیک ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے ماتھے کو دیکھ کر سلام کیا تھا۔ دوسرا آدمی اس کا مہمان تھا جسے وہ چائے پلانے کے لئے لایا تھا۔

”تمہارا ٹرک ٹھیک ہوا یا نہیں؟“ صوفی کے مہمان نے پوچھا۔

”درکشاپ میں کھڑا ہے۔“ صوفی نے جواب دیا۔ ”پتہ نہیں راجہ نے کیا کیا ہے اس کا انجن ی بیٹھ گیا ہے۔ اب اس پر اچھی خاصی رقم لگے گی۔“

”راجہ کو ٹرک کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟“ مہمان نے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ صوفی نے جواب دیا۔ ”اس دن میرے پاس آیا اور ٹرک پر اسکرپ لودا کر لے گیا تھا لیکن دوسرے دن وہ ٹرک پر اسکرپ بھی واپس لے آیا تھا۔ اس وقت تو ٹرک ٹھیک ٹھاک تھا لیکن شام کو جب ڈرائیور نے اشارت کرنے کی کوشش کی تو اشارت نہیں ہوا۔“

”راجہ جیسے آدمی کا اسکرپ سے کیا کام؟“ مہمان نے پوچھا۔

”پتہ نہیں مجھے کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔“ صوفی نے کہا۔ ”اس دن کے بعد راجہ سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ ورنہ اس سے پوچھتا کہ ٹرک کے ساتھ اس نے کیا کیا ہے۔“

ان کی باتوں میں راجہ کا نام سن کر ماجھا گجر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ راجہ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ لنڈے کے علاقے میں گھوم پھر کر ہیروئن فروخت کرتا تھا۔ وہ کسی ایک پارٹی سے وابستہ نہیں تھا۔ مختلف پارٹیوں سے مال لیتا تھا۔ کئی مرتبہ ماتھے سے بھی مال لے چکا تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ شارق سے مال لیتا تھا یا نہیں لیکن صوفی اور اس کے مہمان میں ہونے والی گفتگو سے اس کا ذہن کچھ الجھ گیا تھا۔ راجہ منشیات فروش تھا اس کا اسکرپ سے کیا کام؟ اور پھر وہ ٹرک پر اسکرپ لودا کر لے گیا اور دوسرے دن اسکرپ بھی واپس لے آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے اسکرپ سے لدے ہوئے ٹرک کی ضرورت تھی۔ ہو سکتا ہے وہ اسکرپ کی آڑ میں کوئی چیز کہیں لے کر گیا ہو۔

صوفی جب اپنے مہمان کے ساتھ اٹھ کر جانے لگا تو ماتھے نے اسے روک لیا۔

”صوفی یار میری ایک بات سننا ذرا۔“

”فرماؤ استاذ جی۔“ صوفی اس کے قریب آگیا۔ اس کا مہمان دور ہی کھڑا رہ گیا۔

غصے سے بچنے کے لئے انہوں نے راستے ہی میں ایک فرضی کہانی گھڑ لی تھی تاکہ انہیں ماتھے کے غصے کا نشانہ نہ بننا پڑے۔

”شارق کا مزنگ والا ڈیرہ جل کر راکھ ہو گیا ہے۔“ جیلا اسے بتا رہا تھا۔ ”رات ایک بجے شارق کی دوست ٹینہ ہمارے ہاتھ لگ گئی تھی۔ ہم اسے مندر لے گئے تھے۔ ہم مندر پہنچے ہی تھے کہ ہمیں اطلاع ملی کہ شارق اپنے تین آدمیوں کے ساتھ آپ کے نسبت روڈ والے ڈیرے کی طرف جا رہا ہے۔ ہم نے سوچا کہ اچھا موقع ہے۔ ہم شارق کو بھی گرفت میں لے سکتے ہیں۔ ہم ٹینہ کو یعقوب کے حوالے کر کے نسبت روڈ کی طرف روانہ ہو گئے لیکن وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ ہمیں غلط اطلاع ملی تھی میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ ہمارے ساتھ دھوکا تو نہیں ہوا۔ ہم فوراً واپس دوڑے۔“

جب ہم مندر میں پہنچے تو میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی۔ ٹینہ غائب تھی اور یعقوب بے ہوش پڑا تھا۔ اسے بڑی مشکل سے ہوش میں لایا گیا اس کی حالت بہت ابتر تھی۔ وہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے بتایا کہ شارق اور اس کے دو ساتھی وہاں آئے تھے اور وہ ٹینہ کو چھڑا کر لے گئے۔ یعقوب نے مزاحمت کی تو انہوں نے اس کی گردن مروڑ دی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ اس وقت تک زندہ کیسے رہا تھا۔“

”شارق کو کیسے پتہ چلا کہ ٹینہ کو وہاں لے جایا گیا ہے؟“ ماجھا گجر بولا۔

”پتہ نہیں۔“ جیلے نے کندھے اچکا دیے۔ ”ویسے ہو سکتا ہے شارق کے کسی آدمی نے ہمارا پیچھا کر کے اس ٹھکانے کا پتہ معلوم کر لیا ہو اور پھر شارق کو اطلاع دے دی ہو اور شارق نے ہمیں وہاں سے ہٹانے کے لئے کسی آدمی تک اطلاع پہنچا دی ہو کہ وہ آپ کے نسبت روڈ والے ڈیرے پر جا رہا ہے۔ اس طرح موقع پا کر وہ مندر سے ٹینہ کو نکال لے گیا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہمارا کوئی اڈہ بھی شارق کی نگاہوں سے محفوظ نہیں رہا۔“ ماجھا گجر نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش نمایاں تھی۔

”اگر تم اجازت دو تو ہم شارق کے دو تین آدمیوں کو اٹھالیں۔ ان میں سے کسی سے تو شارق کا پتہ چل جائے گا۔“ جیلے نے کہا۔

”کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“ ماتھے نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کے کتنے آدمی ہمارے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ مگر کسی نے بھی اس کے خلاف زبان نہیں کھولی تھی۔ اب میں خود معلوم کروں گا کہ وہ بزدل چوہا کہاں چھپا ہوا ہے۔“

ماجھا گجر سارا دن اپنی کونھی میں رہا۔ شام سے ذرا پہلے وہ کونھی سے رخصت ہو کر مختلف

”ٹوٹے کو آگ کیسے لگی تھی؟“

”آگ لگی نہیں لگائی گئی تھی۔“ دکان والے نے جواب دیا۔ ”پہلے آپس میں فائرنگ ہوئی پھر چٹان پارٹی نے آگ لگا دی۔ ایک لحاظ سے تو بہت اچھا ہوا۔ یہ طویلہ منشیات کا بہت بڑا اڈہ تھا۔ چٹان پارٹیوں سے آئے دن اس کا جھگڑا رہتا تھا۔ فائرنگ سے پورے علاقے میں خوف و ہراس پھیل جاتا تھا اب تک یہاں کئی لوگ مارے جا چکے ہیں اب ذرا سکون ہو گا لیکن اس کے ساتھ آگ سے اور لوگوں کا بھی نقصان ہوا ہے اس کا افسوس ہے۔“

”کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا؟“ مانجھ نے پوچھا۔

”کوئی انسان تو نہیں البتہ تین گھوڑے جل کر ختم ہو گئے ہیں۔“ دکاندار نے جواب دیا۔ ”گھوڑوں کی خیر ہے۔ بندے تو بچ گئے۔“ مانجھ نے کہا اور سیون اپ کی بوتل خالی کر کے جب سے پانچ کا ایک نوٹ بھی نکال کر دکاندار کے سامنے رکھ دیا۔

”کوئی پکڑا نہیں گیا؟“ مانجھ نے پھر پوچھا۔

”ایسے لوگ پکڑے تو نہیں جاتے۔“ دکاندار نے کہا۔ ”کئی سالوں سے یہاں منشیات کا اڈہ چل رہا ہے۔ علاقے کے لوگ اس کے خلاف حکام کو درخواستیں دیتے رہتے ہیں پولیس بھی سب کچھ جانتی ہے مگر پولیس کو بہت ملتا ہے اس لئے ان کے خلاف کبھی کوئی کارروائی نہیں ہوتی اور اوپر سے دباؤ پڑتا ہے تو پولیس کے مخبر پہلے منشیات فروشوں کو اطلاع کر دیتے ہیں پھر چھاپہ مارتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ چھاپہ پڑنے سے پہلے ہی بھاگ جاتے ہیں۔“

”اب تو یہ اڈہ ختم ہو گیا نا۔“ مانجھ گجبر نے کہا۔ ”اب تو علاقے کے لوگ سکون کا سانس لے سکیں گے۔“

”دو چار دن کی بات ہے۔“ دکاندار نے کہا۔ ”میں پھر دھندہ شروع ہو جائے گا۔ کون روک سکتا ہے ان لوگوں کو؟“

”ہاں“ یہ بات تو ہے کون روک سکتا ہے ان لوگوں کو۔“ مانجھ گجبر نے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”یہاں ایک گنا کوچوان بھی ہوا کرتا ہے۔ اسے جانتے ہو وہ آج کل کہاں ہے؟“

”کل رات وہ بھی یہیں تھا۔ بھاگ گیا۔“ دکاندار نے کہا۔ ”ویسے وہ تانگہ چلاتا چھوڑ چکا ہے۔ اب تو وہ بھی یہی دھندہ کرتا ہے۔ یہ اڈہ وہ ہی چلا رہا تھا۔“

”لیکن میں نے تو سنا تھا کہ یہ اڈہ شارق کا تھا؟“ مانجھ نے کہا۔

”ہے تو شارق کا ہی مگر اسے چلا گیا ہی رہا تھا۔ اب پتہ نہیں بھاگ کر کہاں گیا ہو گا۔“

”تم ابھی راجہ کے بارے میں کوئی بات کر رہے تھے کیا چکر ہے؟“ مانجھ نے پوچھا۔

صوفی نے ایک بار پھر ساری بات دہرا دی، آخر میں وہ بولا۔ ”یہ بات تو میری سمجھ میں ہے نہیں آ سکی کہ وہ اسکرپ لے کر کیوں گیا تھا اور پھر دوسرے دن اسکرپ واپس کیوں لے آیا اور نے مجھ سے اسکرپ کے پیسے بھی واپس نہیں لئے تھے۔“

”راجہ آج کل کہاں بیٹھ رہا ہے؟“ مانجھ گجبر نے پوچھا۔

”عام طور پر لنڈے میں بابو ہوٹل کے آس پاس پھرتا رہتا ہے لیکن اس دن کے بعد سے نظر نہیں آیا۔“ صوفی نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے جاؤ، یہی معلوم کرنا تھا۔“ مانجھ نے کہا۔

صوفی اس سے ہاتھ ملا کر چلا گیا مانجھ گجبر کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا پھر اٹھ کر لنڈا بازار کی طرف آ گیا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی بتیاں جل چکی تھیں۔ مانجھ گجبر ٹھٹھا ہوا بابو ہوٹل میں آ گیا۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھا راجہ نظر نہیں آیا۔ ہوٹل سے ذرا آگے وہ پان سگریٹ کے ایک کھوکھے پر رک گیا۔

”راجہ کہاں ہے؟“ اس نے پان والے سے پوچھا۔

”کئی دن سے یہاں نظر نہیں آیا۔“ پان والے نے اسکی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ مانجھ کو پہچان گیا تھا۔ ”سنا ہے آج کل گلے کے ساتھ اس کی بڑی گاڑھی چھن رہی ہے۔“

گلے کے نام پر مانجھ گجبر چونک گیا۔ ”گلا“ شارق کا خاص آدمی تھا۔ راجہ سے گلے کے تعلق کا مطلب یہ تھا کہ وہ شارق تک پہنچ گیا ہے۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ اسکرپ کا ٹرک کسی ڈرامے ہی میں استعمال کیا گیا تھا۔

”اس کا گھر کہاں ہے۔ رات کو کہاں رہتا ہے؟“ مانجھ نے پوچھا۔

”گھر کا پتہ نہیں ویسے وہ آج کل گلے کے ساتھ ہی رہ رہا ہے۔“ پان والے نے کہا۔

مانجھ گجبر زیادہ دیر وہاں نہیں رکا۔ وہ ٹھٹھا ہوا دوبارہ سلطان سرائے آ گیا۔ اس کی گاڑی یہیں کھڑی تھی وہ گاڑی میں بیٹھ کر مزنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس نے مزنگ میں شارق کے ڈیرے کے آس پاس کی گلیوں کا چکر لگایا۔ اس کا ڈیرہ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ اس سے ملحق کئی درکشاپ بھی تباہ ہو گئے تھے۔ اس نے ساتھ والی گلی میں پرچون کی ایک دکان کے سامنے گاڑی روک لی اور اتر کر دکان میں آ گیا۔ دکان کے باہر ڈیپ فریزر بھی رکھا ہوا تھا اور ڈیپ فریزر دیکھ کر ہی اس نے کار روکی تھی۔ اس نے سیون اپ کی ایک بوتل لی اور دکاندار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

دکاندار نے جواب دیا۔

ماجھا گجر کچھ دیر مزید ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اسے گما یا شارق کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ وہ کار میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ اس نے کار ایک گلی میں موڑی ہی تھی کہ چونک گیا۔ گما ایک پولیس ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ آ رہا تھا۔ وہ سڑک کے دوسرے کنارے پر تھے۔ اس لئے گما اسے نہیں دیکھ سکا تھا۔ ماجھا گجر نے کچھ آگے جا کر کار روک لی پچھلی سیٹ پر بڑی ہوئی چادر اٹھائی اور گاڑی کے دروازے بند کر کے گما کے پیچھے چل پڑا۔ اس نے چادر اس طرح اوڑھ لی تھی کہ اگر گما مڑ کر بھی دیکھ لے تو اس کی شکل نہ دیکھ سکے۔ وہ کچھ فاصلہ دے کر ان دونوں کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ تھانے کی طرف جا رہا ہے۔

ماجھا گجر کا خیال درست نکلا۔ گما ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ تھانے ہی میں داخل ہو تھا۔ ماجھا تھانے کے گیٹ سے تقریباً پچاس گز دور تاریکی میں کھڑا رہا۔ گما تقریباً آدھے گھنٹے بعد تھانے سے نکلا۔ اس مرتبہ وہ اکیلا ہی تھا۔ اس نے گیٹ سے باہر آ کر ادھر ادھر دیکھا پھر اسی طرف آنے لگا جہاں ماجھا کھڑا تھا۔

ماجھا گجر دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ گما اس کے قریب سے نکل گیا۔ وہ جیسے ہی قدم آگے نکلا ماجھا بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کچھ فاصلہ دے کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ گما نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

دو تین گلیاں گھومنے کے بعد گما اس سڑک پر نکل آیا جس کے ایک طرف سڑک کے ساتھ ساتھ بہت بڑا چھپر تھا۔ آس پاس کے علاقوں کا گندہ پانی اسی جوڑ میں آ کر گرتا تھا۔ آبادی کے وسط میں اتنا بڑا چھپر محکمہ صحت اور بلدیہ کی بے حسی کی منہ بولتی تصویر تھا۔ یہ چھپر کئی سال سے تھا۔ چھپروں کی افزائش کی بہترین جگہ۔ گندے پانی کی وجہ سے کئی بیماریاں بھی جنم لیتی رہتی تھیں لیکن متعلقہ حکام نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی تھی۔

گما سڑک کے دائیں طرف مکانوں کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس سڑک پر تقریباً سناٹا تھا۔ ماجھا گجر بھی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گما کے قریب پہنچ گیا۔ قدموں کی آہٹ پا کر گما نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔ ماجھا گجر جب سے پستول نکال چکا تھا۔

”خاموشی سے سیدھے چلتے رہو گما۔“ مانجھے گجر کے منہ سے غراہٹ سی نکلی۔ ”مگر تم نے کوئی حرکت کی تو گوولی مار دوں گا۔“

”اوہو۔“ گما کے منہ سے بے اختیار مگرا سانس نکل گیا۔ وہ چلتے چلتے رک گیا تھا۔ ”دیکھو بھ۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے جو کچھ کرنا تھا کر لیا کل رات تم نے یا ہمارے آدمیوں نے جو کچھ بھی کیا ہی وہ کینسکی کی انتہا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس معاملے کو ہمیں تم کو رو دینا۔۔۔“

”ورنہ کیا۔۔۔“ ماجھا گجر غرایا۔ ”ورنہ کیا کر لو گے تم لوگ۔ کیا بگاڑ لو گے میرا؟“ ”ہم نے ابھی تک تمہارے خلاف کوئی بڑا قدم نہیں اٹھایا۔ شارق نے اپنے تمام آدمیوں کو ہتھیاروں سے کھینچ کر رکھا ہوا ہے۔ لیکن قوت برداشت کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ اب کوئی بھی شارق کے کنٹرول میں نہیں رہے گا۔ سب بھرے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ گما نے کہا۔

”فی الحال تو تم اپنی زندگی کی فکر کرو۔“ مانجھے نے کہا۔ ”اس وقت تم میرے سامنے کھڑے ہو اور میرے ہاتھ میں پستول ہے۔ بہتر ہے خاموشی سے میرے ساتھ چلو اگر تم چاہو تو مجھ سے تعاون کر کے شارق کے اڑے کے مالک بن سکتے ہو اور انکار یا ضد کی صورت میں تمہارے جسم میں ہت بھی آ سکتی ہے۔“

”موت تو ایک دن آتی ہی آتی ہے۔“ گما نے کہا۔ ”لیکن مجھے یقین ہے کہ میں تمہارے فوں نہیں مروں گا۔“

گما نے جملہ مکمل کرتے ہی اس کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ مار دیا۔ مانجھے نے اگرچہ اسے کو پستول کی زد میں لے رکھا تھا لیکن گما سے اسے اس اقدام کی توقع نہیں تھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر تاریکی میں کہیں دور جا گرا۔ اس سے پہلے کہ ماجھا صورت حال کو سمجھ سکا گما نے آگے جھٹکتے ہوئے اس کے سینے پر سر سے ٹکرا دی۔

ماجھا گجر کراہ اٹھا۔ وہ لڑکھڑا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ جسم پر اوڑھی ہوئی چادر اس کے منہ مسئلہ بن گئی تھی۔ جب تک وہ چادر سے نجات حاصل کرتا اس وقت تک گما اسے تین چار باروں سے رسد کر چکا تھا۔

چادر سے نجات ملنے ہی ماجھا گجر پھرے ہوئے سائڈ کی طرح گما پر حملہ آور ہوا۔ گما اگرچہ اس حملے کے لئے تیار تھا مگر وہ اپنا دفاع کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ مانجھے نے اس پر گولہوں کی بارش کر دی تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل گر گیا۔ مانجھے نے اس پر چھلانگ لگا دی۔

مانجھے کو اپنے اوپر آتا دیکھ کر گما بڑی پھرتی سے لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ ماجھا منہ کے

”تم کون ہو..... کہاں رہتے ہو؟“ دوسرے آدمی نے پوچھا۔
 ”میری چوک پر چھوٹی سی دکان ہے جی۔ دکان بند کر کے گھر جا رہا تھا قریب ہی رہتا ہوں۔
 گھر زیادہ دور نہیں ہے۔“ مانجھے نے جواب دیا۔

”وہ یقیناً شروع ہی سے تمہارے پیچھے لگا ہو گا۔“ پہلے آدمی نے کہا۔ ”تمہیں تھانے میں اس کی رپورٹ کرانی چاہئے۔ اگر چاہو تو ہم تمہارے ساتھ تھانے جا کر گواہی دیں گی۔“
 ”کوئی فائدہ نہیں جی۔“ مانجھے نے چھڑ سے نکتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ تو بھاگ گیا۔ پولیس والے اسے تلاش کرنے کے بجائے مجھے ہی پریشان کریں گے۔ اس لیئرے سے تو میں بچ گیا ہوں لیکن پولیس والے میری جھپٹیں خالی کرا دیں گے۔“

”ٹھیک ہے، تمہاری مرضی۔“ اس شخص نے کہا۔ ”ہم تمہاری کوئی اور مدد کر سکتے ہیں؟“
 ”شکریہ جی، میرا گھر قریب ہی ہے میں چلا جاؤں گا۔“ ماجھا گجر نے جواب دیا۔
 ”ٹھیک ہے ہم تو تمہاری مدد کے خیال سے رک گئے تھے۔“ اس شخص نے کہا اور اپنے ساتھی کو اشارہ کرتا ہوا کار کی طرف بڑھ گیا۔

وہ لوگ کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ ماجھا گجر سڑک کے کنارے کھڑا اپنی صورت حال کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کا لباس گندے پانی سے تر ہو رہا تھا۔ ہاتھ پیروں اور منہ پر بھی کچڑ لگا ہوا تھا۔ اسے اپنے آپ سے بدبو سی آ رہی تھی۔

جہاں اس نے گاڑی کھڑی کی تھی وہ جگہ وہاں سے خاصی دور تھی۔ اور وہاں دوکانیں بھی تھیں۔ ظاہر ہے دوکانیں کھلی ہوں گی۔ لوگوں کی آمد و رفت بھی ہو گی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر لوگ یقیناً چونکیں گے۔

وہ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ پھر سڑک پار کر کے سامنے تاریک گلی میں گھس گیا۔ ظاہر ہے وہ رات بھر یہاں کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔

وہ اس سڑک پر پہنچ گیا جہاں اس نے گاڑی کھڑی کی تھی۔ بائیں طرف اسکول کے میدان کی دیوار تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

○

رہنما واقعی بہت اچھی خاتون ثابت ہوئی تھی۔ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے اس نے ان دونوں کو ناشتہ کرایا تھا پھر ٹینے کے پیر کی باش کی تھی۔

دس بجے کے قریب شارٹ وہاں سے جانے کے لئے تیار ہو گیا۔
 ”جب تک تمہارا پیر ٹھیک نہیں ہو جاتا تم یہیں رہو گی۔“ شارٹ نے ٹینے کی طرف دیکھتے

بل نیچے گرا۔ اگر وہ دونوں ہاتھ زمین پر نہ نکالیتا تو اس کا منہ زمین پر لگتا اور ایک آدھ دانر ضرور ٹوٹ جاتا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر گمانے اسے موقع نہیں دیا اور اسے پے در پے ٹھوکریں مارنے لگا۔

ماجھا گجر اس کی ٹھوکریں برداشت کرتا رہا لیکن پھر اس کا داؤ پھل گیا۔ اس نے گامے کا پیر کر زور دار جھٹکا دیا۔ گاما چکرا کر گرا۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے ستم گتھا ہو گئے کبھی گمانے آ جاتا اور کبھی ماجھا گجر۔ طاقت اور دونوں ایک دوسرے کے برابر تھے۔ اور ایک دوسرے کو رگیتے ہوئے سڑک پر آگئے اور با دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔

سڑک کے کنارے کا کھ حصہ کچا اور ڈھلوان تھا۔ اس ڈھلوان کے ساتھ ہی چھپر کا گندہ تھا۔ وہ ڈھلوان پر لڑھکتے ہوئی چھپر کے بالکل کنارے پر پہنچ گئے۔

ٹھیک اسی وقت بائیں طرف سے کوئی گاڑی آتی دکھائی دی۔ وہ دونوں ہیڈ لیمپس کی روش میں تھے۔ اس وقت گمانے تھا اور ماجھا گجر اس کے سینے پر سوار تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ گاما گلے پر دبا رکھے تھے۔

گمانے نے مانجھے کو اپنے دونوں پیروں پر اٹھاتا شروع کیا اور بالا خیر پیروں کو زور دار جھٹکا دیا۔ اور ماجھا گجر اس کے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا پشت کے بل ٹرپ کی آواز سے چھپر کے گندے پانی پر گرا۔

گاڑی قریب آتی جا رہی تھی گاما اٹھ کر سڑک پار کر کے گلی کی طرف دوڑا اور پھر دیکھتے دیکھتے تاریکی میں غائب ہو گیا۔

ماجھا گجر چھپر کے گندے پانی میں تر ہو گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ پیر پھسلا اور پھر میں گرا۔ اسی دوران وہ گاڑی وہاں آ کر رک گئی۔ دو آدمی گاڑی سے اتر کر اس کی طرف لپے ماجھا ہیڈ لیمپس کی روشنی میں تھا۔

”کیا ہوا... کون ہو تم اور وہ دوسرا آدمی کون تھا؟“ کار سے اترنے والے ایک آدمی پوچھا۔

”پتہ نہیں کون تھا۔“ ماجھا گجر نے جواب دیا۔ ”میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ وہ اچانک ہی گلی سے نکل کر سامنے آ گیا اور پتول دکھا کر کہنے لگا کہ جو کچھ ہے میرے حوالے کر دو۔ میں سے بھڑ گیا۔ اور پھر گاڑی کو آتے دیکھ کر اس نے مجھے چھپر میں گرا دیا اور اس طرف بھاگ گیا۔ اس نے گلی کی طرف اشارہ کیا۔“

لئے کچھ نہ کچھ لے کر آتے۔ پہلے مجھے شارق کے بارے میں شبہ تھا پھر یقین ہو گیا کہ وہ بھی یہی دھندہ کرتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ بھولا کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرے گا لیکن میرا یہ شبہ غلط نکلا۔ بھولا ٹائزوں کی ایک دکان پر ملازم تھا۔ شارق نے اس سے کہا کہ وہ نوکری چھوڑ دے اور اپنی دکان کھول لے۔ اس نے بھولے کو اتنی بڑی رقم بھی دی ہے کہ وہ آسانی سے دکان کھول سکتا ہے۔ بھولے نے ایک کرائے دار کو نوٹس دے رکھا ہے۔ وہ چند روز میں دکان خالی کر دے گا اور پھر بھولا وہیں اپنی دکان کھول لے گا۔ اس نے ہاڑ مرمت کرنے والے کچھ کاریگروں سے بھی بات کر لی ہے۔

شارق کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ اسمگلر ہے۔ غیر قانونی دھندہ کرتا ہے وہ خود بھی بہت برا آدمی ہو گا لیکن میں اسے دیکھ چکی ہوں۔ وہ ایک شریف آدمی ہے۔ تمہارے بارے میں دو تین مرتبہ سنا تھا تم کہاں کی رہنے والی ہو؟“ ر-شمال خاموش ہو کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”لاہور ہی کی رہنے والی ہوں۔ میرا پورا خاندان یہاں ہے لیکن مقدر نے مجھے ایک ایسے چکر میں پھنسا دیا ہے کہ میں کسی کا سامنا نہیں کر سکتی۔“ ثینہ نے جواب دیا۔

ر-شمال کچھ دیر بیٹھی رہی پھر کمرے سے نکل کر گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ تقریباً بارہ بجے بھولا اور حمیرا بھی آگئے۔ وہ سیالکوٹ اپنے ماموں کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ ثینہ کو دیکھ کر وہ دونوں حیران ہوئے تھے اور جب ر-شمال نے انہیں ثینہ کے بارے میں بتایا تو حمیرا اس کے پاس ہی بیٹھ گئی اور بھولا باہر جا کر اپنے کبوتروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

شام سے ذرا پہلے حمیرا نے ایک کتاب اور ایک کاپی اٹھائی اور چادر اوڑھتے ہوئے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ماں! میں ذرا عارفہ کے گھر جا رہی ہوں۔ ایک دو سوال اس سے سمجھنے ہیں۔“

ثینہ بھی صحن میں ر-شمال کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ حمیرا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”لاؤ... مجھے دکھاؤ کون سے سوال ہیں۔“

حمیرا الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کے قریب آگئی اور کاپی اس کی طرف بڑھا دی۔ ثینہ نے وہ سوال دیکھے اور حمیرا کو قریب بٹھا کر سمجھانے لگی۔

”آپ نے تو بڑے اچھے طریقے سے سمجھا دیا۔ کتنی جماعتیں پڑھی ہیں آپ نے؟“ حمیرا نے پوچھا۔

ہوئے کلمہ۔ ”یہ جگہ تمہارے لئے زیادہ محفوظ ہے۔ یہاں تمہیں آرام کا بھی موقع ملے گا۔ آج کسی وقت آجائے گی۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوگی اور تمہارا خیال رکھے گی۔“

شارق چلا گیا۔ ثینہ اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔ پھر ر-شمال بھی اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ”تمہارا نام تو کئی مرتبہ سنا تھا۔ آج دیکھا پہلی مرتبہ ہے۔“ ر-شمال اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”شارق کو کیسے جانتی ہو؟ اس کے ساتھ کیوں رہ رہی ہو کیا تمہارے ماں باپ نہیں ہیں؟“

”مجھ جیسی لڑکیوں کے ماں باپ ہوتے ہوئے بھی ان کا کوئی نہیں ہوتا۔“ ثینہ نے افسر سے لہجے میں جواب دیا۔ ”میں شارق کے ساتھ کیوں رہ رہی ہوں؟ یہ ایک لمبی داستان ہے۔ لیکن میں کچھ بتا نہیں سکتی لیکن تم لوگوں سے شارق کا کیا تعلق ہے؟“ ثینہ سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”بھولے کا باپ نشہ پیچا کرتا تھا۔“ ر-شمال نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے اس کا پتہ نہیں تھا۔ پتہ تو اس وقت چلا جب پہلی مرتبہ پولیس نے یہاں چھاپہ مارا۔ یہاں سے پولیس کو کچھ نہیں ملا تھا لیکن وہ بھولے کے باپ کو پکڑ کر لے گئے۔ وہ دوسرے دن گھر آیا تو اس کے ساتھ یہ شارق بھی تھا۔ اس نے ہمیں تسلی دی کہ پولیس والے آئندہ بھولے کے باپ کو نہیں ستائیں گے۔ میرا خیال تھا کہ شارق ایک شریف آدمی ہے جس نے بھولا کے باپ کی ضمانت دی ہوگی اور بھولا کے باپ نے نشہ پیچنا چھوڑ دیا ہو گا۔“

”میری سمجھ میں نہیں آیا کہ بھولا کے باپ نے یہ دھندہ شروع ہی کیوں کیا تھا۔ یہ مکان اپنا ہے۔ نیچے کی دونوں منزلیں کرائے پر چڑھی ہوئی ہیں۔ ہر مہینے معقول رقم مل جاتی ہے وہ خود بھی اسٹیشن کے سامنے جی ٹی ایس کے اڑے پر پھلوں کی دکان لگاتا تھا۔ اللہ کا شکر ہے سب کچھ تھا۔ اسے یہ دھندہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

میرا خیال تھا کہ اس روز پکڑے جانے کے بعد جب دوسرے دن چھوٹ کر آیا تھا تو اس نے یہ دھندہ چھوڑ دیا ہو گا لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ اس روز کے بعد تو وہ اکثر گھر سے بھی غائب رہنے لگا تھا۔ کبھی پشاور کبھی کہاں کہاں.... اور پھر ایک روز اس کی لاش گھر آئی۔ وہ شاہ عالی پولیس کی گولی لگنے سے مر گیا تھا۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ بھولا کے باپ نے وہ دھندہ چھوڑا نہیں تھا بلکہ وہ اس دلدل میں اور بھی آگے بڑھ گیا تھا اور بالاخر پولیس کے ہاتھوں مارا گیا۔

شارق دوسرے دن ہمارے گھر آیا۔ اس نے مجھے بھی تسلی دی اور بچوں کو بھی۔ اس کے بعد وہ اکثر آتا رہا۔ بھولا اور حمیرا اس سے بہت زیادہ مانوس ہو گئے۔ شارق جب بھی آتا ان کے

”میں نے انگلش میں ایم اے کیا ہے۔“ ثینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
حمیرا کے علاوہ ر-شمال نے بھی بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔
بھولا اب اپنے کمرے سے دُور کا پنا اور پتنگ نکال لایا تھا۔ اس نے پنا حمیرا کے ہاتھ میں
دیا اور پتنگ اڑانے لگا۔ اس وقت آسمان پر اور بھی بہت سی چنگیں نظر آ رہی تھیں۔
”تم دُور کا پنا پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ پڑھو گی کب؟“ ثینہ نے کہا۔

”یہ بھولا روز ہی ایسے کرتا ہے۔ مجھے پنا تھا دیتا ہے اور خود پتنگ اڑانے لگتا ہے اور جب
اس کی پتنگ کٹ جاتی ہے تو مجھے ڈانٹتا ہے کہ میں نے دُور روک لی تھی۔“ حمیرا نے جواب دیا۔
ثینہ مسکرا کر رہ گئی۔

ر-شمال کے مکان سے نکلنے کے بعد شارق ریلوے اسٹیشن اور میکلیوڈ روڈ سے ہوتا ہوا
مال روڈ پار کر کے اے جی آفس کی طرف نکل آیا۔ چورجی کی طرف جانے سے پہلے اس نے
پیٹرول پمپ سے گاڑی میں پیٹرول بھرا دیا تھا اور پھر چورجی سے ہوتا ہوا ملتان روڈ کی طرف نکل
گیا۔

جب وہ حویلی پہنچا تو بارہ بجتے والے تھے۔ نو لکھا کے علاوہ راجہ اور گاما بھی وہاں موجود تھے۔
ان کے چروں پر بارہ بج رہے تھے۔ حویلی کے اندر درخت کے نیچے گاڑی کھڑی کر کے شارق بچہ
ہی نیچے اترا گا گا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔
”غضب ہو گیا شارق باؤ....“

”مجھے معلوم ہے۔“ شارق نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”لیکن یہ سب کچھ کیسے ہوا؟“
”کل رات دس بجے کے قریب میں اور راجہ وہاں کمرے میں بیٹھے روٹی کھا رہے تھے کہ
انہوں نے اچانک ہی حملہ کر دیا۔ وہ پانچ چھ آدمی تھے۔ وہ فائرنگ کرتے ہوئے اندر گھے آ رہے
تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان میں سے دو آدمیوں نے جگہ جگہ پیٹرول چھڑک کر آگ لگانا شروع
دی۔ ہمارے لئے مقابلے کا موقع نہیں تھا۔ ہم پچھلے راستے سے بھاگ نکلے۔ اگر رک کر مقابلہ
کرنے کی کوشش کرتے تو وہ ہمیں بھون ڈالتے۔“

”چھا کیا تم لوگ وہاں سے نکل آئے۔“ شارق نے کہا۔ ”ویسے کیا تمہیں معلوم ہے کہ
میں کون کون شامل تھے؟“

”رحمت کو تو میں نے دیکھا تھا وہ آج کل مانجھے کا بڑا چچہ بنتا پھر رہا ہے۔“ اس مرتبہ راجہ

نے جواب دیا۔

”رحمت کے علاوہ یعقوب کا چچہ جیلا بھی تھا۔“ شارق نے کہا۔

”تمہیں کیسے پتہ چلا شارق باؤ۔“ گامے نے چونک کر پوچھا۔

”اگ لگانے کے بعد بھی یہ دونوں وہاں موجود تھے۔“ شارق نے کہا اور پھر اپنے ساتھ پیش
آنے والے واقعہ کی تفصیل بتانے لگا آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”قسمت اچھی تھی کہ ہم لوگ وہاں
سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور اگر ماجھا گجر اس وقت وہاں ہوتا تو کل کی رات ہماری زندگی کی
آخری رات ہوتی۔“

”ثینہ بی بی کہاں ہے شارق باؤ۔“ نو لکھا نے پوچھا۔

”بھانگنے کی کوشش میں اس کے پیر میں موج آگئی تھی۔ میں لانا مناسب نہیں تھا اسے میں
ایک محفوظ جگہ پر چھوڑ آیا ہوں۔“ شارق نے جواب دیا اور پھر گامے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
”تم ابھی مزنگ چلے جاؤ اور تھلانے میں طویلے میں آتش زدگی کی رپورٹ لکھوا دو۔ اس رپورٹ
میں ماجھا گجر، جیلا اور رحمت کا نام ضرور ہونا چاہئے۔ اگر ایس ایچ او رپورٹ لکھنے میں جیل و جت
سے کام لے تو کچھ رقم لگا دینا ایسے موقعوں پر یہ لوگ کچھ اڈل ضرور کرتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے شارق باؤ۔ میں ابھی چلا جاتا ہوں۔“ گامے نے کہا اور کچھ ہی دیر بعد حویلی سے
رخصت ہو گیا۔

شارق شام تک حویلی میں رہا اور پھر راجہ کو حویلی میں رہنے کی ہدایت کر کے دوبارہ شہر آ
گیا۔ وہ سیدھا گواٹھنڈی آیا تھا۔ گاڑی اس نے مولوی حمید کے ہوٹل سے دور ہی چھوڑ دی تھی۔
یہ علاقہ اب مکمل طور پر مولوی حمید کے کنٹرول میں تھا۔ مانجھے گجر کے آدمی یہاں سے دھندہ چھوڑ
کر بھاگ نکلے تھے۔

شارق نے ہوٹل کے سامنے رک کر مولوی حمید کو اشارہ کیا اور آگے چلتا ہوا بجلی کے ایک
کھمبے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کھمبے کا لمب یا تو فیوز تھا یا ٹوٹا ہوا تھا۔ بہر حال یہ نسبتاً
تاریک جگہ شارق کو مناسب لگی تھی۔ چند منٹ بعد ہی مولوی حمید بھی وہاں آ گیا۔

”کیا ہو گیا شارق باؤ۔ طویلے کو آگ کس نے لگائی تھی؟“ اس نے آتے ہی پوچھا۔

”ہمارا ایک ہی دشمن ہے۔ اس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”تم
سنو۔ کیا صورت حال ہے؟“

”ہر طرف گزرو ہی نظر آ رہی ہے۔“ مولوی حمید نے جواب دیا۔ ”طویلے میں آگ لگنے کے
بارے میں مجھے رات ہی کو پتہ چل گیا تھا۔ آج صبح گیارہ بجے کے قریب یہ پتہ چلا کہ یعقوب
مندو والے کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس کی لاش پولیس کو مندر کے ایک کمرے میں ملی تھی۔
پولیس کو اس کے چلے جیلے کی تلاش ہے جو لاپتہ ہے۔“

”اور کوئی خاص بات؟“ شارق نے پوچھا۔

”خبریں تو بس ایسی ہی ہیں۔“ مولوی حمید نے جواب دیا۔

”آج کل میں پولیس سرگرمی دکھانے والی ہے۔ تم ایک دو دن ذرا محتاط رہنا۔“ شارق کہتے ہوئے مڑ کر اس طرف چل پڑا جہاں اس کی کار کھڑی تھی۔

گواہمنڈی سے نکل کر وہ انارکلی کی طرف آگیا۔ سہیل کے ریٹورنٹ والی گلی میں داخل ہوتے ہی اس نے گاڑی روک لی۔ شیشے چڑھا دیئے اور دروازے لاک کرنے کے بعد چابیاں جیب میں ڈالتا ہوا سہیل کے ریٹورنٹ کی طرف چلے لگا۔

اس وقت ساڑھے نو بجے تھے۔ ریٹورنٹ میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سہیل کاؤنٹر پر نہیں تھا۔ کاؤنٹر پر جو لڑکا بیٹھا ہوا تھا اس نے شارق کو دیکھ کر اوپر اشارہ کر دیا۔ شارق سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر والے کمرے میں آگیا۔ سہیل وہاں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔

”تم کہاں غائب تھے؟“ سہیل اسے دیکھتے ہی بولا۔ ”میں تو سمجھا تھا کہ تم یہ شہر تو کیا یہ ملک ہی چھوڑ کر جا چکے ہو۔“

”یہ ملک چھوڑنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ شارق نے اس کے سامنے بیٹھ کر بے تکلفی سے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”جب کبھی باہر جانے کا پروگرام بنا تو تمہیں بتا دوں گا بلکہ تمہیں ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔“

”ایک منٹ۔“ سہیل اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں پہلے تمہارے لئے کھانے کو کہہ دوں۔ لگتا ہے تم دو تین دن سے بھوکے ہو۔“

اس نے دروازے کے قریب جا کر لڑکے کو آواز دی اور اسے کھانے کا کہہ کر دوبارہ کمرے میں آگیا۔

”کہاں غائب تھے اتنے روز سے؟“ سہیل کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”گھر کی بھی خبر نہیں لی۔“

اب اس نے رو کر برا حال کر رکھا ہے۔

”غلطی ہو گئی کہ اتنے روز سے میں نے انہیں اپنے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی، بہرحال آج میں گھر جاؤں گا۔ تم اس دوران گئے تھے یا نہیں؟“ شارق نے پوچھا۔

”دو تین مرتبہ جا چکا ہوں۔ جب بھی جاتا ہوں وہ دونوں تمہارے بارے ہی میں پوچھتی ہیں۔ اب تو کئی روز سے میری بھی ہمت نہیں پڑی وہاں جانے کی۔“ سہیل نے جواب دیا۔

اسی دوران ہوٹل کا ملازم لڑکا کھانا لے کر آگیا۔ اس نے میز پر جگہ بنا کر پلیٹیں رکھ دیں اور فریج میں سے پانی کی ایک بوتل بھی نکال کر رکھ دی اور واپس چلا گیا۔

شارق دیر تک سہیل سے باتیں کرتا رہا۔ وہ جب ریٹورنٹ سے نکلا تو ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ یہی فیصلہ کر کے نکلا تھا کہ یہاں سے سیدھا باغبانپورہ جائے گا اور دو تین دن گھر پر ہی رہے گا۔ ٹینے کی طرف سے اسے پریشانی نہیں تھی۔ وہ محفوظ جگہ پر تھی۔

اس نے کار کے قریب آ کر چابی سے اسٹیرنگ سائیڈ کا دروازہ کھولا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر انجین میں چابی لگائی ہی تھی کہ ایک ہلکی سی غراہٹ اس کی ساعت سے ٹکرائی۔

”گاڑی اشارت کر کے لکشی چوک کی طرف لے چلو شارق باؤ۔“

اس کے ساتھ ہی پستول کی ٹال شارق کی گردن سے لگ گئی۔ شارق کے منہ سے بے اختیار گھرا سانس نکل گیا۔ حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے انجین میں چابی گھمادی۔



شارق کے خیال میں وہ مابھا گجر کا آدمی تھا۔ وہ کار کو گھما کر ہسپتال روڈ پر لے آیا اور اپنے سامنے لگا ہوا عقبی منظر پیش کرنے والا آئینہ درست کرنے لگا۔ اس دوران اس آدمی نے اس کی گردن سے پستول ہٹا لیا تھا کیونکہ سڑک پر ٹریفک تھا اور لوگ اس طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔

”پستول میرے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو بلا جھجک گولی مار دوں گا۔“ اس شخص نے شارق کو وارننگ دی اور سیٹ پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”تم کون ہو اور گاڑی میں کیسے بیٹھے تھے جبکہ دروازے لاک تھے؟“ شارق نے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ شخص سرخ شرٹ اور جینز پہنے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ بھی شارق کو اجنبی سا لگا تھا اور بھر پینٹ شرٹ..... مابھا گجر کے گروہ میں ایسا کوئی آدمی نہیں تا جو پینٹ شرٹ پہنتا ہو۔ وہ سب تو دھوئی باندھنے والے لوگ تھے!

”کسی گاڑی کا لاک کھولنا ہم جیسے لوگوں کے لئے مشکل نہیں ہوتا۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے سے گاڑی میں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ اتفاق سے تمہیں یہاں گاڑی سے اترتے اور ریٹورنٹ میں جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بہت دیر لگا دی تم نے ہوٹل میں۔“

”ایک دوست سے ملاقات کے لئے آیا تھا۔ اسی سے گپ شپ ہو رہی تھی۔ لیکن تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا کہ تم کون ہو؟ مابھا گجر کے گروہ کے تو نہیں لگتے۔“ شارق کہتے ہوئے ایک بار پھر سامنے آئینے کی طرف دیکھنے لگا۔

”مابھا گجر... وہ چور واپتر؟“ وہ شخص مسکرا دیا۔ ”دودھ بیچنے والا وہ تھڑ ریٹ غنڈہ لیا جانے کہ یہ دھندہ کیا ہے؟ اس جیسے لوگوں کو تو ہم گھاس بھی نہیں ڈالتے۔“

”تو پھر تم کون ہو؟ پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں تمہیں۔“ شارق نے کہا۔ اسے اس شخص کا لہجہ

ایک سینما ہال کے سامنے گاڑی روک لینے کو کہا اور سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کھڑکی سے گردن نکال کر ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر گیٹ کے قریب کھڑے ہوئے آدمی کو آواز دے کر بلا لیا۔

”حاجی صاحب سے جا کر کہو کہ رحمن، شارق کو لے آیا ہے۔ اسے دفتر میں لے آؤں یا کہیں اور ملاقات کریں گے۔“ رحمن نے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ اس شخص نے کن انکھیوں سے شارق کی طرف دیکھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سینما کے گیٹ میں داخل ہو گیا۔ اس کی واپسی میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

”حاجی صاحب نے کہا ہے کہ انہیں سمن آباد والی کوٹھی پر لے چلو۔ وہ خود بھی یہاں سے نکل رہے ہیں۔“ اس شخص نے پچھلی کھڑکی پر جھکتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ رحمن نے کہا پھر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے شارق سے مخاطب ہوا۔ ”چلو مسٹر شارق۔۔۔ سمن آباد۔۔۔ میرا خیال ہے پرسکون ماحول میں لمبی گفتگو ہوگی۔ ویسے ٹھیک بھی ہے کاروباری گفتگو پرسکون ماحول ہی میں ہونی چاہئے۔ یہاں سینما کے دفتر میں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ آرام سے کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔“

شارق نے کندھے اچکا دیئے اور انجن اشارت کر کے یوٹرن لیتے ہوئے گاڑی کو دوبارہ لکشی چوک کی طرف گھما دیا۔ لکشی چوک سے اس نے گاڑی بائیں طرف میکلوڈ روڈ پر موڑ دی۔

سمن آباد موڈ پر رحمن کی ہدایت کے مطابق شارق نے گاڑی بائیں طرف موڑ لی اور پھر وہ اس کے اشارے پر گاڑی کو مختلف سڑکوں پر گھماتا رہا۔ شروع میں شارق کی دل میں جو خوف پیدا ہوا تھا وہ اب ختم ہو گیا تھا۔ رحمن کا تعلق مابجھا گجر کے گروہ سے نہیں تھا نہ ہی وہ اس کا دشمن تھا۔ اس کا انداز دوستانہ تھا۔ لیکن شارق کے ذہن پر ایک سوالیہ نشان سا بنا ہوا تھا۔ رحمن کون ہے اور کس کے لئے کام کر رہا ہے؟

دفعۃً اس کے ذہن میں ایک جھمکا سا ہوا۔ رحمن اسے ایبٹ روڈ پر ایک سینما کے سامنے لے گیا تھا اور سینما میں کسی حاجی صاحب کے نام پیغام بھجوایا تھا۔

اب بت شارق کی سمجھ میں آرہی تھی۔ حاجی عبداللہ کا نام اس کے ذہن میں واضح ہو رہا تھا۔ یہ نام اس کے لئے اگرچہ اجنبی نہیں تھا لیکن اس نے بہت عرصہ سے اس کے بارے میں کچھ سنا نہیں تھا۔

شارق جیسے جیسے سوچ رہا تھا صورت حل واضح ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے اخبارات میں ڈرگ مافیا کی چند بڑی پھیلیوں کا بڑا چرچا رہا تھا۔ قومی اسمبلی میں بھی ڈرگ مافیا کی ان بڑی پھیلیوں کے ناموں کی بازگشت سنی گئی تھی۔ اخبارات میں ان کے بارے میں بڑی لمبی لمبی کہانیاں

بھی کچھ مذہب سا لگ رہا تھا۔ ”اس دھندے میں شاید نئے آئے ہو؟“

”میری تو عمر ہی گزر گئی ہے اس کاروبار میں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”مگر تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو جبکہ میرا تمہارا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔“ شارق بولا۔ ”میوہ ہسپتال کے سامنے پہنچ کر اس نے گاڑی نسبت روڈ کی طرف موڑ دی تھی۔

”تمہیں اس طرح اپنے ساتھ لے جانے پر میں معذرت چاہتا ہوں۔ لیکن اس کے سوا کچھ چارہ بھی نہیں تھا اگر میں ویسے تمہیں اپنے ساتھ چلنے کو کہتا تو تم صاف انکار کر دیتے۔ بہر حال اب میں نے پتول جیب میں رکھ لیا ہے۔ ہماری اور تمہاری چونکہ کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تجربہ اس طرح ساتھ لے جانا ایک مجبوری تھی۔ لیکن بہر حال، اب ہم دوستوں کی طرح باتیں کریں گے۔ امید ہے کہ تم بھی کوئی گزربز نہیں کرو گے۔ تمہارا یہ اغواء تمہارے فائدے کے لئے ہے۔“

”بہت خوب!“ شارق نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”پہلی مرتبہ سنا ہے کہ اغواء کی کوئی واردات مغوی کے فائدے کے لئے ہو۔“

”آج اس کا عملی تجربہ بھی ہو جائے گا۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”اس اغواء میں تمہارے لئے فائدے ہی فائدے ہیں اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ تمہیں مابجھا گجر جیسے چور و دہانت سے نجات مل جائے گی۔ لاہور اور اس کے گرد و نواح کی منشیات کی پوری منڈی تمہارے کنٹرول میں ہوگی۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ شارق بولا۔ اس کے لہجے میں الجھن تھی۔ ”سمجھ جاؤ گے۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”ویسے میرا خیال ہے کہ مجھے اپنا تعارف بھی کرانا چاہئے۔ میرا نام رحمن ہے اور میری رہائش بھی مرنگ ہی میں ہے۔ لیکن گھر جانے کا اتفاق کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔“

گاڑی اس وقت مابجھا گجر کے اڈے کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ مابجھے کا یہ ڈیرا ویران تھا۔ جب سے یہاں پولیس نے بڑی کارروائی کی تھی اس کے بعد سے اس اڈے پر مابجھے کا دھندا بند تھا۔ اس کا بیٹا دن میں ورکشاپ کھولتا تھا اور شام ہوتے ہی بند کر دیتا تھا۔

”کس طرف جانا ہے مسٹر رحمن؟“ شارق نے سامنے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایبٹ روڈ کی طرف لے چلو۔“ رحمن نے جواب دیا۔

شارق نے کار کی رفتار کم کر دی۔ چوک کے قریب پہنچ کر ادھر ادھر دیکھا اور گاڑی کو سیدھے ایبٹ روڈ کی طرف نکال لے گیا۔ اس سڑک کے دونوں طرف لاتعداد سینما ہالز تھے۔ رحمن نے

مجھی تھیں۔ بعض بڑی مچھلیوں کی تو باقاعدہ سوانح حیات شائع کی گئی تھی۔

اخبارات کی ان کمائیوں کے مطابق ڈرگ مافیا کے ان پاکستانی ڈانز کے ہاتھ پیر ہشت پائی طرح پوزی دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ منشیات کے حوالے سے دنیا کے ہر ملک میں ان کا نام و ہشت کی علامت بن گیا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ پاکستان میں موت کے ان سوداگروں کو حکومت اور اسمبلیوں میں شامل بعض اہم ترین شخصیات کی پشت پناہی حاصل تھی اور حقیقت یہ تھی کہ یہ شخصیات انہی کے پیسے پر الیکشن میں کامیابی حاصل کر کے اسمبلیوں تک پہنچتی تھیں۔

حاجی عبداللہ کا نام بھی ان بڑی مچھلیوں میں شامل تھا جن کے بارے میں ان دنوں اخبارات میں بڑا چرچا رہا تھا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق حاجی عبداللہ لاہور میں ایک سینما ہاؤس اور ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک تھا۔ اس کی بیس ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کرتی تھیں۔ امریکہ اور کینیڈا میں ڈرگ مافیا کے علاوہ برطانیہ، فرانس، جرمنی اور دنیا کے تمام بڑے ممالک میں منشیات فروشوں کے بڑے بڑے گروہوں سے اس کے تعلقات تھے۔

پاکستان کی پولیس اور اعلیٰ حکام اس کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے لیکن آج تک اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی اور اب رحمن نامی یہ نوجوان شارق کو اسی حاجی عبداللہ کے پاس لے جا رہا تھا۔ شارق کو یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی کہ حاجی عبداللہ خود اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اور اس کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ اسے گن پوائنٹ پر اغوا کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں رحمن نے اس کی وضاحت کر دی تھی کہ اگر سیدھے ساڑھے طریقے سے بات کی جاتی تو شاید شارق انکار کر دیتا اس لئے اسے گن پوائنٹ پر اغواء کیا گیا تھا لیکن اب پستور رحمن کی جیب میں تھا اور وہ دونوں دوستانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔

رحمن کے کہنے پر شارق نے گاڑی ایک کوٹھی کے سامنے روک لی۔ شارق نے انجن بنا کرتے ہوئے کوٹھی کی طرف دیکھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا اور اسٹول پر ایک گن مین بیٹھا سگریٹ کش لگا رہا تھا۔ گھروں میں گن مینوں کے پاس عام طور پر ڈبل بیل گن ہوتی ہے مگر اس گن کے پاس جدید ترین آٹومٹک رائفل تھی۔ ایک میگزین رائفل میں فٹ تھا اور دوسرا اس کے ساتھ اسکلج ٹیپ سے بڑا ہوا تھا۔ تاکہ استعمال کے دوران ایک میگزین خالی ہو جائے تو فوری طور پر دوسرا لگایا جاسکے۔ گن مین اسٹول پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگاتا ہوا کار کی طرف دیکھ رہا تھا رحمن کو کار سے اترتے دیکھ کر وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور پھر شارق کی طرف دیکھنے لگا جو کار سے اتر کر دروازے وغیرہ لاک کر رہا تھا۔

وہ دونوں گیٹ میں داخل ہوئے تو گن مین نے انہیں سلام کیا تھا۔ کوٹھی میں آمد و رفت

کے دو گیٹ تھے لیکن ایک گیٹ مستقل طور پر بند تھا۔ اندر کی طرف دونوں گیٹوں کے درمیان خوبصورت لان تھا۔ جس کے چاروں طرف پوٹز پر مرکزی ٹیوب لائیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ گیٹ میں داخل ہو کر برآمدے کی طرف بڑھے۔ اسی لمحہ برآمدے والا دروازہ کھلا اور ایک لمبا ترنگا آدمی برآمد ہوا۔ اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ بایں پہلو پر قمیض قدرے ابھری ہوئی تھی جس سے شارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ قمیض کے نیچے پستول یا ریلوور موجود تھا۔ اس آدمی نے دروازہ کھول دیا اور رحمن، شارق کو لے کر برآمدے والے دروازے میں داخل ہوتے ہی بایں طرف والے دروازے میں داخل ہو گیا۔

یہ وسیع و عریض کمرہ ڈرائنگ روم کے طور پر آراستہ تھا۔ فرش پر دبیز قالین اور قیمتی فرنیچر آراستہ تھا۔ ڈیکوریشن کی چیزیں غیر ملکی اور خاصی قیمتی تھیں۔ ایک طرف اسٹینڈ پر ٹیلی فون سیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ دروازہ کھولنے والا دروازہ آدی بھی ان کے ساتھ ہی اندر آ گیا تھا۔

”حاجی صاحب کا فون آیا تھا رحمن بھائی۔“ وہ شخص رحمن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ کوئی چائے ٹھنڈا کیں تو لے آؤں۔“

”ہاں... ٹھنڈا لے آؤ۔ چائے پی پی کر تو سینہ جل گیا ہے۔“ رحمن نے جواب دیا پھر شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بیٹھو مسٹر شارق، تھوڑا سا انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔“

وہ دونوں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ آدمی کولڈ ڈرنکس کی ٹھنڈی بوتلیں لے آیا۔ اس نے ایک ایک بوتل ان دونوں کے سامنے رکھ دی اور باہر نکل گیا۔ شارق اور رحمن نے اپنی اپنی بوتل اٹھالی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگے۔

”امیر علی۔“ رحمن نے بوتل میں سے چند گھونٹ لینے کے بعد کسی کو آواز دی۔ فوراً ہی لمبا ترنگا آدمی اندر آ گیا۔ ”حاجی صاحب اکیلے آ رہے ہیں یا ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہو گا؟“

”یہ نہیں بتایا انہوں نے۔“ امیر علی نے جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ رحمن نے کہا۔

امیر علی کمرے سے باہر نکل گیا۔ شارق جس صوفے پر بیٹھا تھا وہاں سے کھڑکی سے لان اور کوٹھی کا وہ گیٹ نظر آ رہا تھا جہاں اسٹول پر گن مین بیٹھا ہوا تھا لیکن اب گن مین بیٹھا ہوا نہیں تھا۔ اس نے اسٹول ایک طرف رکھ دیا تھا اور خود بڑی مستعدی سے کھڑا تھا۔ شاید اسے پتہ چل گیا تھا کہ حاجی عبداللہ آنے والا ہے۔

”حاجی صاحب کی رہائش ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں ہے۔“ رحمن نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ کوٹھی مہمانوں کے لئے ہے۔ پشاور، کوئٹہ اور کراچی سے ان کے جو مہمان آتے

بھی ہے اور نقصان برداشت کرنا چاہئے۔ وہ تمہارے ساتھ جو کچھ بھی کر رہا ہے غلط کر رہا ہے۔ اس نے تمہارے ذمے کو آگ لگائی جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔

”یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہتا ہے حلی صاحب۔“ شارق نے کہا۔ ”آپ فرمائیے مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے تھے۔“

”ہاں یہ ہے کہ ہم لوگوں کا بزنس تو ایک ہی ہے۔ ہم میں کوئی رابطہ بھی تو ہونا چاہئے۔“ حلی صاحب نے جواب دیا پھر چند لمحوں کی خاموشی کی بعد بولا۔ ”مجھے ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو نہ صرف دیانت دار ہو بلکہ ذہین بھی ہو اور اس بزنس کے شیب و فراز کو سمجھتا ہو۔ میں نے اس سلسلے میں کوئٹہ، پشاور، کراچی اور لاہور کے لوگوں کو چیک کیا بعض نوجوان میری نظروں میں تھے لیکن میں ان سے مطمئن نہیں ہو سکا۔ تمہارا نام جب سامنے آیا تو میں نے تم پر توجہ مبذول کر دی۔ اور طویل عرصے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم پر نہ صرف اعتماد کیا جا سکتا ہے بلکہ تم بڑے سے بڑے معاملے کو بھی ہینڈل کر سکتے ہو۔ اس لئے میں نے تم سے معاملہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”لیکن حلی صاحب! آپ جانتے ہیں کہ میرا اپنا دھندہ ہے۔ اپنے بندے ہیں اور۔“

”تمہارا دھندہ یہاں چلتا رہے گا۔“ حلی نے اس کی بات کٹ دی۔ ”مگنا بھی ایک ذہین آدمی ہے وہ تمہارے سارے کام کی دیکھ بھال کر سکتا ہے۔ ہم بھی اسے تحفظ دیں گے۔ اس سلسلے میں ہمیں پریشانی ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”کیا معاملہ کرنا چاہتے ہیں؟“ شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”لاہور سے باہر جانا ہو گا اور شاید ملک سے بھی باہر۔“ حلی نے کہا۔ ”لیکن ایک بات ذہن میں رکھو کہ جتنا تم ایک ٹرپ میں کما لو گے اتنا تم یہاں رہ کر ایک مہینے میں بھی نہیں کما سکو گے۔“

”میں کے لئے مجھے سوچنا پڑے گا۔ اپنے ساتھیوں سے بھی مشورہ کرنا ہو گا۔“ شارق نے کہا۔

”اتنی جلدی بھی نہیں ہے۔ دو چار دن سوچ لو۔ قسلی سے پھر بات کر لیں گے۔“ حلی نے کہا۔

اس کے بعد وہ کلنی دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر شارق جب دہلی سے نکلا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس نے گھر جانے کا پروگرام ترک کر دیا اور موٹر پر آکر گاڑی کا رخ ملتان روڈ کی طرف موڑ دیا۔

ہیں انہیں اسی کوٹھی میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ غیر ممالک سے بھی حلی صاحب کے بڑے مہمان آتے ہیں لیکن انہیں یہاں نہیں گلیبرگ ولی کوٹھی میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ وہ کوٹھی اس سے بھی زیادہ بڑی اور شاندار ہے۔

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ حلی صاحب مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“ شارق نے پوچھا۔

”ظاہر ہے کوئی کاروباری معاملہ ہی ہو گا۔“ رحمن نے جواب دیا۔ ”ویسے ایک بات ہے۔ حلی صاحب جس بندے پر مہمان ہو جاتے ہیں تاہ تو بس ترعی جاتا ہے، وارے نیارے ہو جاتے ہیں اس کے اور اگر حلی صاحب کسی سے ناراض ہو جائیں تو اسے دنیا کے کسی کونے میں پناہ نہیں ملتی۔ مجھے یاد ہے چند مہینے پہلے ایک آدمی نے حلی صاحب کے ساتھ دھوکا کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ڈر کر افغانستان بھاگ گیا تھا لیکن ایک ہفتے بعد اس کی لاش کی تصویر حلی صاحب کو مل گئی تھی۔“

شارق خاموش بیٹھا رحمن کی باتیں سنتا رہا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ رحمن اسے حلی عبداللہ کی شخصیت سے مرعوب کرنا چاہتا تھا۔

تقریباً بیس منٹ بعد شارق کی نظر کڑکی کی طرف اٹھ گئی۔ باہر کھڑا ہوا گن مین گیٹ کھول رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی گرے رنگ کی ایک مریڈ بڑگیٹ میں داخل ہو کر برآمدے میں رک گئی۔

مریڈ بڑ میں چار آدمی تھے۔ ایک ڈرائیور، دوسرا پنجرز سیٹ پر جس کے چہرے پر چھوٹی گول واڈھی اور سر پر دھلا گے دلی سفید ٹوپی تھی۔ دو آدمی پچھلی سیٹ پر تھے۔ ان دونوں کے پاس آٹو جیک رائفیں تھیں۔ شارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا واڈھی والا حلی عبداللہ تھا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں آدمی اس کے محافظ تھے۔

محافظ اور ڈرائیور تو باہر ہی رک گئے۔ حلی اندر داخل ہوا تو رحمن اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ شارق بھی اٹھ گیا۔ حلی عبداللہ نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔

”بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر مسٹر شارق۔“ حلی عبداللہ کے انداز میں گرجوٹی تھی۔

”میں تو کئی روز سے تم سے ملنا چاہتا تھا لیکن تمہارا کچھ پڑے ہی نہیں چلا۔“

”کیا کریں جی۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ اس دھندے میں بیسیوں دشمن ہوتے ہیں۔ ان سے تو چھپ کر رہنا ہی پڑتا ہے۔“

”آج کل تو تمہارا سب سے بڑا دشمن بھاجا گجر ہے۔“ حلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وہ کاروبار کرنا نہیں جانتا۔ پیسہ کھینچنا چاہتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس بزنس میں قائمہ ہے تو نقصان

سنبھلی ہے تو میں یونیورسٹی جانے کے لئے نکلی تھی لیکن.....

”لیکن کیا؟“ شارق نے مریم کی طرف دیکھتے چلتے ہوئے رضیہ کی طرف دیکھا۔

”لیکن اب نہیں جاؤں گی۔“ رضیہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ کمرے میں داخل ہوئے تو شارق مریم کو دیکھ کر چونک گیا۔ وہ واقعی برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ شارق کو دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ شارق جلدی سے آگے بڑھ کر پٹنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

”یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو ماں جی.... کیا حالت بنا رکھی ہے آپ نے؟“ وہ بولا۔

”اب تم آگئے ہو.... میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ مریم نے کمزور سی آواز میں جواب دیا۔ ”تم کہیں چلے جاتے ہو نا تو لگتا ہے میرے جسم کا کوئی حصہ مجھ سے الگ ہو گیا ہو۔“

”ڈاکٹر کو دکھایا تھا؟“ شارق نے پوچھا۔

”ڈاکٹر کیا کرے گا۔“ مریم نے کہا۔ ”تم آگئے ہو۔ اب مجھے ان دواؤں کی بھی ضرورت نہیں رہی۔“ اس نے تپائی پر رکھی ہوئی دواؤں کی طرف اشارہ کیا۔

”کون سے ڈاکٹر کو دکھایا تھا رضیہ؟ کیا بتایا ہے اس نے؟“ شارق نے رضیہ کی طرف دیکھا۔

”ڈاکٹر بخاری کو۔“ رضیہ نے جواب دیا۔ ”کئی دنوں سے علاج ہو رہا ہے اب تو پہلے سے بہتر ہیں۔“

”میں آج شام کو خود ڈاکٹر سے بات کروں گا۔“ شارق نے کہا۔

”رضیہ!“ مریم نے رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا، بھائی کے ناشتہ وغیرہ کا بندوبست کرو۔ مجھے یقین ہے اس نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا۔“

”ابھی تک میں نے واقعی ناشتہ نہیں کیا۔“ شارق نے جواب دیا۔

”میں ناشتہ بناتا ہوں جی۔“ دروازے میں کھڑے ہوئے شاہد نے پوچھا۔ ”کیا کھائیں گے شارق بھائی... ڈبل روٹی کے سلاٹس یا پراٹھا؟“

”پراٹھا بنا لو یا۔“ شارق نے کہا۔

”میں بناتی ہوں ناشتہ۔ تم اپنا کام کرو۔“ رضیہ نے شاہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ کمرے سے نکل کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی اور شارق وہیں بیٹھا مریم سے باتیں کرتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد رضیہ ناشتہ تیار کر کے وہیں لے آئی۔ گرم گرم پراٹھا کھاتے ہوئے شارق کو دالنی بڑا مزہ آ رہا تھا۔ کئی روز بعد اسے گھر کی کچی ہوئی کوئی چیز ملی تھی۔

ناشتے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک مریم کے پاس بیٹھا رہا پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے

رات کا کچھ حصہ اس نے حویلی میں جاگتے ہوئے ہی گزارا۔ راجہ، گاما اور نوکھا بھی موہر تھے۔ شارق نے حاجی کی تجویز ان کے سامنے رکھی اور ان سے مشورہ طلب کیا۔

”میں حاجی عبداللہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“ گامے نے کہا۔ ”میرے خیال میں تو تمہیں اس کی پیشکش قبول کر لینی چاہئے۔ اس طرح ہمیں مانجھ سے بھی نجات مل جائے گی۔“

”ٹھیک ہے میں بھی اس سلسلے میں ذرا کچھ سوچ لوں۔“ شارق نے جواب دیا۔

وہ کچھ دیر مزید باتیں کرتے رہے پھر سو گئے۔

شارق صبح سویرے ہی اٹھ گیا تھا۔ اس نے نوکھا کو جگا دیا۔ نوکھا چائے بنانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد چائے پیتے ہی شارق گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس نے نوکھا وغیرہ کو بتا دیا تھا کہ وہ دو تین دن بعد آئے گا۔

حویلی سے نکلنے کے بعد شارق پورے شہر کے فاصلے طے کرتا ہوا باغبانپورہ پہنچ گیا۔ اس نے جیسے ہی گاڑی روکی مکان کا دروازہ کھلا اور رضیہ باہر نکلی۔ وہ شاید یونیورسٹی جا رہی تھی۔ اس نے کار کی طرف دیکھا ضرور تھا مگر توجہ نہیں دی تھی لیکن دو قدم آگے بڑھتے ہی وہ ٹھنک کر رک گئی اور گہری نظروں سے اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے شارق کی طرف دیکھنے لگی۔

شارق مسکرا رہا تھا۔ وہ شیشے چڑھانے کے بعد نیچے اتر آیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے رضیہ کی طرف دیکھنے لگا۔ رضیہ کچھ کسے بغیر تیزی سے مڑ کر دروازے میں داخل ہو گئی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ شارق کو رضیہ کے اس رویے پر بڑی حیرت ہوئی تھی۔ وہ گاڑی لاک کر کے جیسے ہی مکان میں داخل ہوا رضیہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

”بہت سنگدل ہیں آپ بھیا۔“ رضیہ کی آواز بھی بھرائی ہوئی تھی۔ ”آپ تقریباً بیس بائیس روز بعد واپس آئے ہیں۔ ہم سے رشتہ ختم کر دیا آپ نے؟“

”نہیں میری بہن۔“ شارق اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ”ہمارا یہ رشتہ تو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔“

”تو پھر.... ہمیں اس طرح چھوڑ کر اچانک کہاں غائب ہو جاتے ہیں کہ کوئی اطلاع تک نہیں ہوتی۔ ہم سولی پر ٹنگے رہتے ہیں ہر وقت۔ اماں تو بیمار پڑی ہیں ہر وقت تمہارا انتظار کرتی ہیں۔“

”بات یہ ہے رضیہ کہ میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا اور جانے سے پہلے اطلاع کرنے کا موقع نہیں ملا اور جہاں گیا تھا وہاں بھی اتنا مصروف رہا کہ خط تک نہیں لکھ سکا۔ اماں کہاں ہے؟“ شارق بولا۔

”اپنے کمرے میں ہیں۔“ رضیہ نے جواب دیا۔ ”کئی دن سے بیمار پڑی ہیں۔ آج طبیعت کچھ

دروازہ بند کر کے لباس بدلا اور پھر دروازہ کھول دیا۔ کچھ ہی دیر بعد رضیہ آگئی اور گلے شکوہ کرنے لگی۔ پھر بولی۔

”یہ گاڑی کس کی ہے۔ کسی سے مانگ کر لائے ہیں یا؟“

”اپنی خریدی ہے۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”کیسی ہے؟“

”اس میں بیٹھ کر دیکھوں گی تو پتہ چلے گا۔“ رضیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کہاں جاؤ گی بیٹھ کر؟“ شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کہیں بھی چلے جائیں گے۔“ رضیہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”راوی کا کنارہ ہے

جہانگیر کا مقبرہ ہے۔ گلشن اقبال ہے۔ بہت سی جگہیں ہیں۔ چھانگا مانگا بھی جایا جاسکتا ہے۔“

”بڑے لمبے پردگرم ہیں۔“ شارق نے اسے گھورا۔ ”چلو ٹھیک ہے۔ جمعہ کے دن تمہیں

چھانگا مانگا لے چلوں گا۔ اب تو خوش؟“

”بالکل خوش۔“ رضیہ نے قہقہہ لگایا۔

اسی شام شارق ڈاکٹر بخاری کو گھر پر لے آیا۔ ڈاکٹر بخاری پچھلے پندرہ دن سے مریم کا علاج

کر رہا تھا۔ اس وقت بھی اس نے مریم کا تفصیلی معائنہ کیا اور پھر شارق کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگیا۔

”کوئی تشویش کی بات؟“ شارق نے سوالیہ نگاہوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

”ان کا پتا متاثر ہوا ہے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”مکمل علاج کی ضرورت ہے۔“

”اوہ!“ شارق چونک گیا۔ ”خطرے کی کوئی بات؟“

”خطرے کی بات تو ہے۔ آپریشن کرنا پڑے گا۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”اوہ!“ شارق کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔ ”کیا آپریشن کے بغیر علاج ممکن نہیں؟“

”انہیں کچھ عرصہ میڈیسن پر رکھا تو جاسکتا ہے لیکن آپریشن ضروری ہو گا۔ ویسے میرا

خیال ہے کہ آپ انہیں میو ہسپتال میں ڈاکٹر ہاشمی کو دکھا دیں۔ وہ پتے کی بیماریوں کے ماہر ہیں۔

دن کے وقت تو وہ آپ کو میو ہسپتال میں ملیں گے اور شام کو سات سے دس بجے تک اپنے

پرائیویٹ کلینک میں بیٹھتے ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو مریضہ کو وہاں لے جا کر چیک اپ کروائیں۔“

”ان کا کلینک کہاں ہے؟“ شارق نے پوچھا۔

”گڑھی شاہو میں۔“ ڈاکٹر بخاری نے جواب دیا۔ ”میں آپ کو ڈاکٹر ہاشمی کے نام لیٹر لکھ

ہوں اور مریضہ کی ہسٹری بھی۔ آپ چاہیں تو انہیں ابھی لے جائیں۔“

”ٹھک ہے۔ میں ابھی لے جاؤں گا۔ آپ لکھ دیجئے۔“ شارق نے کہا۔

ڈاکٹر نے اپنے بیگ میں سے پیڈ نکالا اور اس پر مریضہ کی ہسٹری لکھنے لگا۔ شارق اٹھ کر اندر

آگیا۔

”رضیہ! ماں جی کو تیار کر دو۔ میں انہیں ڈاکٹر ہاشمی کے پاس لے جا رہا ہوں۔“

”کیوں بھیا! خیریت تو ہے؟“ رضیہ ایک دم پریشان ہو گئی۔

”تشویش کی کوئی بات نہیں صرف چیک اپ کروانا ہے۔“ شارق نے کہا۔ ”میں کپڑے بدل

لوں۔۔۔۔۔ تم ماں جی کو تیار کر دو۔“

شارق دوبارہ ڈرائنگ روم میں آگیا۔ ڈاکٹر نے مریضہ کی ہسٹری اور ڈاکٹر ہاشمی کے نام تعارفی

خط لکھ دیا۔ شارق نے دونوں کاغذ اس سے لے لئے اور ڈاکٹر کو رخصت کر کے اپنے کمرے میں آ

کر لباس تبدیل کرنے لگا۔

آدھے گھنٹے بعد مریم کو بھی تیار کر دیا گیا شارق جب اس کے سامنے آیا تو وہ اسے دیکھتے ہی

بولی۔

”مجھے کس ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے ہو بیٹا۔ ڈاکٹر بخاری نے کیا کہا۔ خیر تو ہے نا؟“

”بالکل خیر ہے ماں جی۔“ شارق نے کہا۔ ”ڈاکٹر بخاری ہی نے کہا ہے کہ آپ کا ڈاکٹر ہاشمی

سے چیک اپ کروا لیا جائے۔ اس میں پریشان ہونے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ اچھا ہے۔ چیک

اپ ہو جائے تو تسلی ہو جائے گی۔“

رضیہ بھی ان کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔ شارق اسے ساتھ لے جانا نہیں چاہتا تھا اسے

ڈر تھا کہ اگر رضیہ نے مریم کے بارے میں باتیں سن لیں تو وہ بھی پریشان ہو جائے گی۔ لیکن وہ

اسے ساتھ لے جانے سے منع بھی نہیں کر سکا تھا۔

ڈاکٹر ہاشمی اپنے پرائیویٹ کلینک میں ان مریضوں کو دیکھتا تھا جنہوں نے پہلے سے وقت لے

رکھا ہو۔ لیکن اتفاق سے اس وقت صرف ایک مریض تھا۔ اس کے جاتے ہی شارق مریم کو لے

کر اس کے کمرے میں گھس گیا۔ پہلے اس نے ڈاکٹر بخاری کا تعارفی خط اور مریم کی کیس ہسٹری

والا کاغذ دیا جسے پڑھنے کے بعد ڈاکٹر مریم سے کچھ باتیں پوچھتا رہا پھر اسے اسکرین کے پیچھے کوچ پر

لٹا دیا اور اسٹیمسکوپ سے اس کا معائنہ کرنے لگا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر نے مریم اور رضیہ کو دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھنے کو کہا اور پھر

شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ڈاکٹر بخاری کی تشخیص درست ہے۔ آپریشن ضروری ہے اور اس میں زیادہ تاخیر خطرناک

ثابت ہو سکتی ہے۔“

”آپ کے خیال میں آپریشن کب تک ہو جانا چاہئے؟“ شارق نے پوچھا۔

”آٹھ دس دن میں۔“

”کامیابی کے چانسز؟“ شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”جیسے جیسے دیر ہوگی چانسز کم ہوتے چلے جائیں گے۔“ ڈاکٹر ہاشمی نے کہا۔ ”میرا مشورہ“

یہی ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو آپریشن ہو جانا چاہئے۔“

”تو پھر میں کل آپ کو بتا دوں گا۔“ شارق نے کہا۔

جب وہ لوگ گھر واپس پہنچے تو دس بج چکے تھے۔ مریم کو اس کے کمرے میں لٹانے کے بعد

شارق، رضیہ کو اشارہ کرتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔

”خیریت.... کیا خاص بات ہے؟“ رضیہ نے پوچھا۔

”ہاں، خاص بات ہی ہے۔“ شارق نے کہا اور پھر اسے مریم کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر

میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آپریشن میں تاخیر ماں جی کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی

ہے۔ چند روز بعد میں بھی ملک سے باہر جانے والا ہوں۔ میرے ذہن پر بھی بوجھ رہے گا اس لئے

میں چاہتا ہوں کہ یہ کام ہو ہی جائے تو بہتر ہے۔“

رضیہ اس کی باتوں سے ایک دم پریشان ہو گئی تھی۔ شارق اسے تسلی دیتا رہا پھر آپس میں

مشورہ کرنے لگے۔

”میرا خیال ہے امی کو بتا دینا چاہئے کہ ان کا آپریشن ہو گا۔“ رضیہ نے کہا۔

”ہاں، تم آج رات ہی کسی طرح انہیں بتا دینا۔ میں کل صبح ہی ڈاکٹر ہاشمی سے مل کر

پروگرام بنالیتا ہوں۔“

”آپریشن میں خطرے کی تو کوئی بات نہیں؟“ رضیہ بولی۔

”ہسپتالوں میں روزانہ بیسیوں لوگوں کے آپریشن ہوتے ہیں۔“ شارق نے جواب دیا۔

زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ویسے ہمیں بہتری کی امید رکھنی چاہئے۔ ڈاکٹر ہاشمی نے

بھی کہا تھا کہ ابھی ایسی کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ البتہ تاخیر کی صورت میں کچھ مسائل پیدا ہو سکتے

ہیں۔“

”ٹھیک ہے، میں آج امی کو بتا دوں گی۔ آپ کل جا کر ڈاکٹر سے مل لیں۔“ رضیہ نے

جواب دیا۔

شارق دوسرے دن صبح ہی میو ہسپتال پہنچ گیا۔ ڈاکٹر ہاشمی سے ملنے میں اسے زیادہ دشواری

پیش نہیں آئی تھی۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک ڈاکٹر ہاشمی کے پاس بیٹھا رہا اور پھر یہ طے پایا کہ مریم کو کل ہسپتال میں داخل کرا دیا جائے اور اس کے دو چار دن بعد آپریشن ہو جائے گا۔

ایک ہفتے بعد مریم کا آپریشن ہو گیا۔ آپریشن کامیاب رہا تھا۔ چند روز مزید ہسپتال میں رکھنے

سے بعد ڈاکٹر نے اسے گھر منتقل کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کی دیکھ بھال کے لئے شارق نے

ایک نرس کا بھی انتظام کر لیا تھا جسے چوبیس گھنٹے گھر میں ہی رہنا تھا۔

اس دوران شارق ایک مرتبہ حاجی عبداللہ سے بھی ملا تھا اور اسے بتا دیا تھا کہ اسے اس کی

پیش کش قبول ہے لیکن ماں کے آپریشن کی وجہ سے وہ چند روز تک کہیں بھی نہیں جاسکتا تھا۔

یوں تو شارق اس دوران ٹھینے سے بھی ملتا رہا تھا لیکن جس دن مریم ہسپتال سے گھر آئی تھی

اس سے اگلے روز وہ ٹھینے کو بھی وہیں لے آیا تھا۔

”تمہیں میری ماں اور بہن سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔“ شارق نے کہا۔ ”اب تم چند روز

ان کے ساتھ رہو گی۔ ماں جی کی طبیعت ذرا سنبھل جائے تو ہم کراچی چلیں گے۔“

مریم اور رضیہ، ٹھینے سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ رضیہ تو اس سے لپٹی جا رہی تھی۔

شارق نے انہیں ٹھینے کے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ اس کے کاروبار کی جگہ دار ہے اور

پشاور سے آئی ہوئی ہے۔ ٹھینے کو بھی اس نے یہاں لانے سے پہلے اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔

مریم کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد شارق نے ایک بار پھر حاجی عبداللہ سے ملاقات کی

اور اسے بتا دیا کہ اب وہ اس کے کام کے لئے تیار ہے۔

”دیکھو شارق۔“ حاجی نے اس کی چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”یہ کام بہت ذمے

داری کا ہے اور اس کے لئے میں نے بہت سوچ سمجھ کر تمہارا انتخاب کیا ہے۔ معاملہ لاکھ دو لاکھ

کا نہیں، پانچ سو کلویروٹن کا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے کہ اپنا اعتماد بتاتے ہو یا اتنی بڑی

دولت لے کر کہیں غائب ہونے کی کوشش کرتے ہو۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا کہ دنیا کے

کسی کو نے میں تم میری نگاہوں سے چھپے نہیں رہ سکو گے۔“

”مجھے کوئی لالچ نہیں ہے۔“ شارق نے کہا۔ ”محض ایک ایڈوانس سمجھ کر آپ کی یہ پیشکش

قبول کر رہا ہوں۔ ویسے میرے پاس بھی اتنی دولت ہے کہ میں چاہوں تو کسی ملک میں جا کر

سینٹرل ہو سکتا ہوں اور مجھے زندگی بھر کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔“

”جانتا ہوں.... سب کچھ جانتا ہوں۔“ حاجی عبداللہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اسی لئے تو میں نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ تم دو تین دن میں اپنے یہاں کے معاملات

سمیٹ لو۔ گامے کو بھی ایک مرتبہ میرے سامنے لے آنا۔ تمہیں یہاں کے بارے میں پریشان

ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”ٹھیک ہے“ شارق نے جواب دیا۔ ”میں ایک دو دن بعد مکمل طور پر تیار ہو کر آپ لوں گا۔“

شارق نے گامے کو نہ صرف سب کچھ سمجھا دیا بلکہ اسے حلتی عبداللہ سے بھی ملوا دیا تو لکھا کو وہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اس لئے اسے بھی تیار رہنے کو کہہ دیا تھا۔ مریم اور کو بھی بتا دیا تھا کہ دو چار روز بعد وہ ٹینے کے ساتھ ملک سے باہر جانے والا ہے۔

سب سے آخر میں وہ سہیل سے اس کے ریسٹورنٹ میں ملا تھا۔ صورت حال سے کرنے کے بعد وہ سیاہ رنگ کا ایک بھاری بریف کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یہ بریف کیس میری لانت سمجھ کر اپنے پاس رکھ لو۔ اگر میں واپس آ گیا تو ٹھیک ہے لانت واپس لے لوں گا اور اگر کسی اخبار میں میرے مرنے کی خبر پڑھ لو تو یہ بریف کیس بلا فور رضیہ کے حوالے کر دینا اور میرے بعد تم لوں کا خیال رکھنا۔ دوسرے تیسرے دن گھر آ لگتے رہنا۔“

اسی رات شارق نے حلتی عبداللہ سے سن آبلو والی کوٹھی میں آخری ملاقات کی۔ عبداللہ نے اسے اپنا سارا منصوبہ سمجھا دیا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔

”کراچی میں تم مسٹر ڈی کوٹا نا ہی ایک شخص سے ملو گے۔ وہ گور کا میسلٹی ہے۔ تمہارے پاس زرد رنگ کا ٹکونہ رومل تمہاری شناخت بنے گا اور کوڈ ورڈز کے بدلے کے بعد تم اطمینان لو گے کہ تم صحیح آدمی سے ملے ہو۔ وہ نہ صرف مل تمہارے حوالے کرے گا بلکہ بعض دیگر معاملات میں بھی تمہاری تھوڑی بہت مدد کرے گا۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی کرنا ہو گا جہیز خود کرنا ہو گا۔“ حلتی عبداللہ نے ایک زرد رنگ کا ٹکونہ رومل اس کے حوالے کر دیا اور شناخت کے لئے کوڈ ورڈز بھی بتا دیئے۔

حلتی عبداللہ کا منصوبہ اچھی طرح سمجھنے کے بعد شارق وہاں سے رخصت ہو گیا اور جب گھر پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے۔

پھر اس کے اگلے روز آدمی رات کے بعد شارق، ٹینے اور نو لکھا جہاز میں کراچی طرف پرواز کر رہے تھے۔

○

ڈی کوٹا کی عمر بیسٹائیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ درمیانے قد کا ایک بھاری بھر کم آدمی تھا۔ آنسوئی رنگت اور چمکتے ہوئے سفید دانت۔ آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

شارق سے اس کی ملاقات ایک شاندار ریسٹورنٹ میں ہوئی تھی۔ ملاقات کا وقت اور مقام پہلے ہی سے طے تھا۔ لاہور سے روانگی سے ایک روز پہلے حاجی عبداللہ نے ہی شارق کو بتایا تھا کہ ڈی کوٹا کراچی میں کہاں اور کب ملے گا۔ حاجی عبداللہ نے ڈی کوٹا کا جو حلیہ بتایا تھا وہ اتنا آسان تھا کہ ایک بچہ بھی اسے آسانی سے شناخت کر سکتا تھا۔ اس لئے ڈی کوٹا جیسے ہی ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تھا شارق نے اسے فوراً ہی پہچان لیا تھا۔

شارق، ٹینے کے ساتھ ایسی میز پر بیٹھا تھا جہاں سے ریسٹورنٹ میں آنے جانے والے ہر شخص پر نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔ ڈی کوٹا ریسٹورنٹ میں داخل ہو کر دروازے کے قریب ہی رک گیا اور مجلس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ حاجی عبداللہ کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق شارق نے فوراً ہی اسے پہچان لیا۔ اس کے گلے میں زرد رنگ کا ایک ٹکونہ رومل بندھا ہوا تھا۔ شارق نے بھی جیب سے اسی رنگ کا ٹکونہ رومل نکال لیا۔ پہلے اسے ایک دو مرتبہ ہولے سے جھٹکا پھر میز پر رکھ کر اس کی تہ لگانے لگا۔ ٹینے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے شارق کے پاس یہ رومل پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

ڈی کوٹا چند لمحوں دروازے کے قریب ہی کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نظریں شارق کی نیبل کی طرف اٹھ گئیں۔ شارق کے ہاتھ میں زرد رنگ کا رومل دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ کر اپنے تلے قدم اٹھاتا ہوا ان کی میز کی طرف آ گیا۔

”کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے شارق اور ٹینے کی طرف دیکھا۔ ٹینے کچھ جڑبڑ ہو گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ دو تین میزیں خالی تھیں۔

”یہ سامنے والی نیبل خالی ہے آپ۔۔۔“

”نہیں ٹینے۔“ شارق نے اسے ٹوک دیا۔ ”ہمیں اچھے ایٹری کیٹ کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔“ وہ ڈی کوٹا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”ضرور ضرور۔۔۔ تشریف رکھئے محترم۔۔۔“

”شکریہ۔“ ڈی کوٹا ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ”آدمی اکیلا ہو تو بڑی بوریٹ محسوس کرتا ہے۔ اگر اچھی کپہنی مل جائے تو وقت اچھا گزر جاتا ہے۔“

”جی ہاں۔“ شارق نے کہا۔ ”آپ کی جگہ میں بھی ہوتا تو میں بھی اچھی کپہنی کی تلاش کرتا۔“

ٹینے اب بھی جڑبڑ سی ہو رہی تھی۔ دراصل شارق نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ اس نے ٹینے کو ابھی تک حالات سے بالکل بے خبر رکھا

کیسے بھی بنے ہوئے تھے۔ بعض کیسوں کے سامنے پردے کھینچے ہوئے تھے اس ریسٹورنٹ میں زیادہ تر نوجوان جوڑے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ جو ہال کی مدہم روشنی میں سر جوڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔

”یہ میری دوست ہے مس ٹینے۔“ شارق نے ٹینے کا تعارف کرایا۔

شارق اور ڈی کوٹا باتوں ہی باتوں میں کوڈ ورڈز کے تبادلے سے اطمینان کر چکے تھے کہ وہ دونوں وہی ہیں جو انہیں ہونا چاہئے۔

”تو چلیں مسٹر شارق؟“ ڈی کوٹا نے کہا۔

”ٹھیک ہے چلو۔“ شارق نے کہا اور وہ تینوں میز سے اٹھ گئے۔ کافی کا بل شارق پہلے ہی ادا کر چکا تھا۔ وہ تینوں ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔

ٹینے جینز اور نی شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ پیروں میں جوگرز تھے۔ اس لباس میں وہ بڑی اسارٹ لگ رہی تھی۔ ڈی کوٹا بار بار کن انٹیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ابھی ساڑھے گیارہ ہی بجے تھے۔ سڑک پر بڑی رونق تھی۔ ڈی کوٹا کی کار وہاں سے تقریباً پچاس گز دور ایک سائڈ اسٹریٹ میں کھڑی تھی۔

ڈی کوٹا نے اسٹیرنگ سنبھال لیا اور ٹینے اور شارق پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ٹینے اب بھی پریشان تھی کہ یہ مسٹر ڈی کوٹا کون ہے اور وہ انہیں کہاں لے جا رہا ہے۔ اس نے شارق سے کچھ پوچھنا چاہا مگر پھر خاموش ہو گئی تھی۔

گاڑی شہر کے بارونق علاقے سے نکل کر سبزی منڈی کی طرف آگئی اور پھر سبزی منڈی کے درمیان ایک تنگ سی سڑک سے ہوتی ہوئی پچھلی طرف نکل آئی۔ گلے سڑے پھلوں اور سبزیوں کی سرائند سے فضا متعفن ہو رہی تھی۔ ٹینے نے ناک پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

گاڑی جہاں رکی تھی وہ ایک احاطہ تھا۔ لکڑی کی خالی پیٹیوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ گھاس پھوس بھی بکھرا ہوا تھا۔۔۔۔۔ اس احاطے کی دیوار بھی لکڑی کے تختوں کی تھی۔ لکڑی بکے تختوں ہی کا ایک عارضی سا گیٹ لگا ہوا تھا۔

اس طرف تاریکی تھی۔ اور زیادہ تر اسی طرح پیٹیوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ کیس کیس ہلکی روشنی کا کوئی بلب جل رہا تھا۔ وہ تینوں کار سے اتر آئے اور احاطے والے پھانک کی طرف چلے گئے۔ ڈی کوٹا ان میں سب سے آگے تھا۔ لکڑی کے پھانک کے سامنے پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس نے ٹوٹے ہوئے تختوں میں ہاتھ ڈال کر اندر سے مڑی ہوئی تار کا کٹڑا ہٹا دیا اور پھانک کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ ٹینے اور شارق بھی اس کے پیچھے ہی پھانک میں داخل ہو گئے۔

تھا۔ وہ تو اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ لوگ سیر و تفریح کے لئے یہاں آئے ہیں۔ کراچی پہنچ کر انہوں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ وہ دن بھر ہوٹل میں پڑے سوتے رہے تھے اور رات کا کھانا کھانے کے بعد شارق اور ٹینے ہوٹل سے نکل آئے تھے۔ نوکھانے ہوٹل ہی میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔

یہ دونوں مختلف جگہوں پر گھومتے ہوئے اس ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے کافی پی تھی۔ ویٹر برتن اٹھا کر لے گیا تھا۔ اس وقت گیارہ بجتے والے تھے اور ٹینے کا خیال تھا کہ وہ لوگ جلد ہی یہاں سے اٹھ جائیں گے لیکن اسی دوران وہ اجنبی ٹپک پڑا تھا اور وہ اور شارق اس طرح باتیں کرنے لگے تھے جیسے پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں حالانکہ ٹینے جانتی تھی کہ شارق پہلی مرتبہ کراچی آیا تھا۔ اور لاہور میں بھی اس شخص کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن پھر یہ خیال بھی آیا کہ وہ شارق کے سارے ہی جاننے والوں سے تو واقف نہیں تھی شارق کئی کئی روز غائب رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے اس شخص سے بھی اس کے تعلقات رہے ہوں۔

”میں گاڑی کھڑی کر کے اس طرف آ رہا تھا کہ دو تین کتے میرے پیچھے لگ گئے۔“ ڈی کوٹا کہہ رہا تھا۔ ”میں انہیں ہشکارنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ کسی طرح میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ اتفاق سے ایک بلڈنگ کی پہلی منزل کے فلیٹ سے کسی عورت نے نیچے کچھ پھینکا وہ شاید بچا کھپا کھانا تھا اس میں کچھ ہڈیاں بھی تھیں کتے ہڈیاں چچوڑنے لگے اور مجھے آگے آنے کا موقع مل گیا۔“

”ہڈی کتوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ کتوں سے بچنے کے لئے جیب میں ہڈی رکھنا بہت ضروری ہے۔“

”اب یہ تو ہونے سے رہا کہ آدمی ہر وقت جیب میں ہڈی لئے پھرتا رہے۔“ ڈی کوٹا نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”البتہ کتوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے دوسرے طریقے بھی ہو سکتے ہیں اور ہمیں ان طریقوں پر زیادہ توجہ دینی چاہئے۔“

”میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں مسٹر ڈی کوٹا۔“ شارق نے کہا۔

”ویل!“ ڈی کوٹا بولا۔ ”تم نے اس لیڈی کا تعارف نہیں کرایا۔“

ٹینے چونک گئی۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا تھا اور اب وہ ایک دوسرے کو اس کے نام سے مخاطب کر رہے تھے۔ ٹینے کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ریسٹورنٹ کا ہال خاصا بڑا تھا اور مناسب فاصلوں پر میزیں لگی ہوئی تھیں آمنے سامنے کی دو دیواروں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے

”کون ہو تم لوگ رک جاؤ۔“ دائیں طرف تاریکی سے ایک بھاری آواز ابھری۔
 ”میں ہوں سمندر خان۔“ ڈی کوٹا نے جواب دیا۔
 ”او۔۔۔۔۔ کوٹہ۔“ تاریکی سے جواب ملا اور پھر ایک لمبا ترنگا آدی سامنے آگیا۔ اس نے ڈی کوٹا کا نام خوب بگڑا تھا۔

”لاہور کے مہمان آئے ہیں۔ انہیں پیچھے لے کر جانا ہے۔“ ڈی کوٹا نے کہا۔
 سمندر خان نے پھانک بند کر دیا اور انہیں لے کر پیٹیوں کے انبار کے پیچھے آگیا۔ یہاں ایک بہت اونچا اور بہت بڑا شید تھا۔ اس شید کے نیچے بھی خالی پیٹیوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ سمندر خان نے لکڑی کے ایک ستون کے ساتھ لگا ہوا سوچ آن کر دیا۔ شید سے لٹکا ہوا سواٹ کا ایک بلب روشن ہو گیا۔ چاروں طرف پیٹیوں کے انبار ہونے کی وجہ سے روشنی اس شید تک ہی محدود تھی۔ شید کے نیچے لکڑی کی خالی پیٹیاں بڑے سلیقے سے نیچے اوپر جنی ہوئی تھیں۔ زمین پر گھاس پھوس تھی جو گیلی تھی اور چلنے سے بچ بچ کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ چاروں طرف ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔

وہ ایک جگہ رک گئے۔ ٹیمنے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ وہ اب تک نہیں سمجھ سکی تھی کہ ڈی کوٹا انہیں یہاں کیوں لایا تھا۔

ڈی کوٹا نے سمندر خان کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر نیچے اوپر پڑی ہوئی خالی پیٹیوں میں سے ایک پیٹی بڑی احتیاط سے کھینچ لی اور پھر تین چار پیٹیاں اور نکال لیں۔ پیٹیاں ایک دوسرے کے اوپر اس طرح جتی ہوئی تھیں کہ بچ کی چند پیٹیاں نکال لینے سے انبار کی دوسری پیٹیاں اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تھیں۔ سمندر خان نے اپنے لباس سے ایک پنسل خارج نکال کر ڈی کوٹا کے ہاتھ میں تھما دی۔ ڈی کوٹا نے شارک کو اشارہ کیا اور وہ ٹارچ کی روشنی میں پیٹیوں کے درمیان اس خلا میں جھانکنے لگا۔

اندر نیلے پولیٹر کی بوریاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک بوری کا منہ کھلا ہوا تھا۔ شارک نے ہاتھ ڈال کر اس میں سے سفید پلاسٹک کی ایک تھیلی نکال لی۔ یہ ہیروئن تھی اور تھیلی پر نمایاں طور پر پانچ کے جی چھپا ہوا تھا۔ شارک کچھ دیر تک اس تھیلی کا جائزہ لیتا رہا پھر تھیلی دوبارہ اسی بوری میں رکھ دی اور پیچھے ہٹ گیا۔ سمندر خان نے بڑی احتیاط سے وہ تمام پیٹیاں دوبارہ اسی طرح سیٹ آ دیں۔

ٹیمنے یہ سب کچھ بڑی حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ اب اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ شارک اسے محض سیر و تفریح کے لئے کراچی لے کر نہیں آیا تھا۔ ہیروئن کا وہ پیکٹ دیکھ کر

سمجھ گئی تھی کہ یہ اس کا کاروباری دورہ تھا اور ڈی کوٹا نامی اس شخص کی ملاقات محض اتفاق نہیں تھی۔ یہ ملاقات ایک باقاعدہ پروگرام کے تحت ہوئی تھی اور یہ پروگرام غالباً لاہور سے روانہ ہونے سے پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا۔

لکڑی کی پیٹیوں والے اس احاطے سے نکل کر وہ دوبارہ کار میں آ گئے۔ سمندر خان پھانک بند کر کے دوبارہ تاریکی میں غائب ہو چکا تھا۔ کار سبزی منڈی کی حدود سے نکلی تو ٹیمنے نے اطمینان کا سانس لیا۔ گلے سڑے پھلوں اور سبزیوں کی سرائند سے تو اس کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔
 ”مجھے تمہاری تھوڑی سی مدد کی ضرورت پڑے گی ڈی کوٹا۔“ شارک نے کہا۔ وہ اس وقت ڈی کوٹا کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور ٹیمنے پچھلی سیٹ پر تھی۔

”کس قسم کی مدد چاہتے ہو؟“ ڈی کوٹا نے پوچھا۔
 ”ایک دو ایسے آدمیوں سے ملو دو، جن سے میں کچھ کام لے سکوں لیکن وہ آدی ہر لحاظ سے قابل اعتماد اور پڑھے لکھے ہونے چاہئیں۔“ شارک نے کہا۔
 ”ٹھیک ہے۔ میں کل ایک آدی کو تم سے ملا دوں گا۔ وہ تمہارے مسئلے حل کر دے گا۔“

مسٹر ڈی کوٹا نے جواب دیا۔
 کار شہر کے اس علاقے میں پہنچ گئی جہاں ان کا رہائشی ہوٹل تھا۔ ڈی کوٹا نے کار ہوٹل سے دور ہی روک لی۔

”ایک بات اور۔“ شارک نے ڈی کوٹا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہوٹل میں رہ کر ہم آزادی سے کام نہیں کر سکتے۔ کسی اچھے علاقے میں رہائش کے لئے مکان اور گاڑی کا بھی بندوبست کرنا ہو گا تاکہ ہم آزادی سے کام کر سکیں۔“

”کل دوپہر کے وقت تم لوگ مکان میں منتقل ہو جاؤ گے اور گاڑی بھی مل جائے گی۔ ایک بچے ہوٹل میں میرے فون کا انتظار کرنا۔“ ڈی کوٹا نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں تمہاری کال کا انتظار کروں گا۔ شارک کہتے ہوئے دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

وہ دونوں پیدل چلتے ہوئے ہوٹل کی طرف آ گئے۔ اس وقت رات کا ایک بج چکا تھا۔ ہوٹل کا لوہے کے جنگلے والا گیٹ بند ہو چکا تھا۔ اندر کی طرف کرسی پر ایک دربان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے انہیں دیکھ کر دروازہ کھول دیا اور وہ دونوں اندر آ گئے۔۔۔۔۔ نوکھا اپنے کمرے میں سو چکا تھا۔ یہ دونوں اپنے کمرے میں آ گئے۔ ان دونوں نے ہوٹل میں میاں بیوی کی حیثیت سے اپنا اندراج کروایا تھا۔

سلح تک تھے اور دوسری طرف نہایت چلی سطح پر بھی اس کا ملنا ملتا تھا۔ شارق نے ٹیو کی مدد سے ایک ٹن اسمتھ سے رابطہ قائم کیا اور اپنی نگرانی میں لوہے کی چادر کا ایک کنٹینر تیار کروایا۔ یہ کنٹینر اونچائی میں کم تھا لیکن چوڑائی زیادہ تھی۔ کنٹینر تیار کرواتے وقت اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہیروئن کی پانچ پانچ کلو والی سوتھیلیاں آسانی سے اس میں سما سکیں۔

کنٹینر تیار کروانے کے بعد شارق، ٹیو کے ساتھ مختلف جگہوں پر گھومتا رہا۔ ان جگہوں میں کچھ سرکاری دفاتر بھی تھے اور بعض دکانیں وغیرہ بھی۔ جہاں سے کچھ سالن خرید گیا تھا۔ شارق کے خیال میں ٹیو زیادہ قابل اعتماد نہیں تھا لیکن وہ اسے اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور تھا۔ ان تمام کاموں سے نمٹنے کے بعد شارق، ٹیو کو لے کر کراچی سے کئی میل دور ماہی گیروں کی ایک بستی میں پہنچ گیا۔ ان کے ساتھ ٹینہ بھی تھی۔ اس دوران شارق نے محسوس کیا تھا کہ ٹیو بڑی لالچائی ہوئی نظروں سے ٹینہ کی طرف دیکھتا رہا تھا اور وہ شارق کے بجائے ٹینہ ہی سے زیادہ تربات کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ ٹینہ کے چہرے پر الجھن کے تاثرات صاف نظر آ رہے تھے۔

ماہی گیروں کی بستی میں نورو چاچا کو تلاش کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ نورو چاچا کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ سر کے بال برف کی طرح سفید اور کلین شیو۔ اور رنگت تو بے کی طرح سیاہ تھی۔ اس کی ساری زندگی سمندر میں گزری تھی لیکن اب کچھ عرصہ سے اس نے سمندر میں جانا چھوڑ دیا تھا۔

نورو چاچا تین لالچوں کا مالک تھا ایک اس کا بیٹا خود چلاتا تھا اور باقی دو اس نے ٹھیکے پر دے رکھی تھیں۔ تھے تو یہ لوگ ماہی گیر لیکن عام تاثر یہ تھا کہ یہ لوگ دوسروں کے ساتھ مل کر منشیات اور انسانوں کی اسمگلنگ بھی کرتے تھے۔ سمندر کی نگرانی لالچوں کو دھوکا دے کر خلیج کی ساحلی ریاستوں تک پہنچ جاتا ان کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

”فرماؤ صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ نورو چاچا نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت ایک جھوپڑے میں چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے تو بے کی چالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جھوپڑے سے گھٹ پر کھڑی ہوئی ماہی گیری کی لالچیں اور سمندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

”ہمیں ایک لالچ چاہئے۔ بہت اچھی حالت میں اور تیز رفتار۔“ شارق نے تو بے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

”کس مقصد کے لئے؟“ نورو چاچا نے پوچھا پھر خود ہی بولا۔ ”اگر آپ کو لالچ اسمگلنگ کی غرض سے چاہئے تو پھر میں معذرت چاہوں گا۔ میں اس قسم کے غیر قانونی دھندے نہیں کرتا میری

”یہ سب کیا ہے؟“ ٹینہ نے دروازہ بند کرتے ہوئے شارق کی طرف دیکھا۔ ”میں تو سمجھی تھی کہ ہم یہاں سیر و تفریح کے لئے آئے ہیں اور چند روز بعد باہر چلے جائیں گے۔ لیکن یہ مسٹر ڈی کوٹا اور خالی بیٹیوں کے انبار میں چھپی ہوئی وہ ہیروئن۔۔۔۔۔“

”لاہور میں تمہیں یہ سب کچھ بتانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”ہم چند روز کراچی میں رہیں گے۔ مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔ اس دوران تم اور نوکھلا آزادی سے کراچی کی سیر و تفریح کرتے رہنا۔ اس مشن کے بعد میں کوشش کروں گا کہ ہم لوگ چند روز کے لئے ملک سے باہر چلے جائیں۔“

”ہیروئن کی ایک بڑی کھیپ جو سمندری راستے سے ایک غیر ملکی جہاز پر منتقل کرنی ہے۔“ شارق نے کہا اور پھر اسے پوری تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”یہ مسٹر ڈی کوٹا، حاجی عبداللہ کا آدمی ہے۔ ہیروئن بھی تم دیکھ چکی ہو اب اس ہیروئن کو کراچی سے نکال کر کھلے سمندر میں اس غیر ملکی جہاز پر منتقل کرنے کی ذمہ داری میری ہے۔ میں اس سلسلے میں مصروف رہوں گا۔ تم نوکھلا کے ساتھ گھومتی پھرتی رہنا۔“

ٹینہ جواب دینے کے بجائے بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے صرف جو گرز اتار کر ایک طرف پھینک دیئے تھے۔ کپڑے تبدیل نہیں کئے تھے۔ کچھ دیر بعد شارق بھی اسی بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ چند منٹ بعد وہ دونوں نیند کی آغوش میں پہنچ چکے تھے۔



اس شخص کا نام تو اگرچہ خرم تھا لیکن وہ اپنے حلقے میں ٹیو کے نام سے مشہور تھا اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال رہی ہو گی۔ دراز قامت، صحت مند جسم، گوری جیٹی رنگت، پنسل جیسی باریک مونچھیں اس کے چہرے پر بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ وہ کراچی یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا۔ اس کے ماں باپ اسے جو کچھ بنانا چاہتے تھے وہ تو نہیں بن سکا تھا لیکن وہ ایک غنڈہ بن گیا تھا۔ اور غنڈہ بھی ایسا جس کے تعلقات بہت اوپر تک تھے۔ اس کے جاننے والوں کو حیرت ہوتی تھی کہ ٹیو جیسا آدمی اعلیٰ سرکاری آفسروں کے دفتروں اور ایم پی اے اور ایم این ایز وغیرہ کے دفاتر میں بے تکلفی سے کس طرح گھس جاتا ہے۔ بعض لوگ جو ٹیو کو جانتے تھے ان کا ٹیو کے بارے میں خیال تھا کہ وہ افسران اور اعلیٰ شخصیات کو بلک میل کرتا ہے۔ ان کی کوئی نہ کوئی دھکتی رگ اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس کے اشاروں پر ناپٹے پر مجبور ہیں۔

شارق کے لئے ٹیو بڑے کام کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ ایک طرف اس کے تعلقات بہت اونچی

”لاٹچ کے عملے کے تین آدمی ہیں ان کا خرچ بھی تم کو دینا ہو گا۔“ نورو چاچا نے کہا۔
”خرچ تو کھانے پینے کا ہی ہو گا اور ظاہر ہے وہ کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائیں گے بھوکے تو نہیں رہیں گے۔“ شارق نے جواب دیا۔

نورو چاچا کو دس ہزار روپے ایڈوانس دے دیئے گئے اور وہ لوگ شہر واپس آ گئے اسی رات شارق، ثینہ اور ڈی کوشا کو لے کر سبزی منڈی پہنچ گیا۔ لوہے کی چادروں والا کنٹینر پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ رات کے سائے میں بڑی خاموشی سے ہیروئن کی تھیلیاں وائر پروف بیگز میں ڈال کر آہنی کنٹینر میں پیک کر دی گئیں۔ کنٹینر کو اس طرح بند کر دیا گیا تھا کہ اس میں پانی داخل ہونے کا احتمال نہ رہے۔ کنٹینر کو پھر لکڑی کی خالی بیٹیوں کے انبار کے نیچے چھپا دیا گیا۔

دوسرے دن شارق دو کاریگروں کو لے کر مٹی کی بستی پہنچ گیا۔ ان کاریگروں کے ساتھ ایک پورٹبل ویلڈنگ پلانٹ بھی تھا۔ ثینہ اور ڈی کوشا بھی شارق کے ساتھ تھے۔ وہ ٹیڈو کو جان بوجھ کر ساتھ نہیں لایا تھا۔

شارق دن بھر اپنی نگرانی میں کاریگروں سے کام کرواتا رہا۔ لاٹچ کے نیچے چار جگہوں پر لوہے کے ہک لگا کر ان میں لمبی لمبی آہنی پٹیاں لگوائی گئی تھیں۔

شام کو وہ لوگ واپس آ گئے اور اگلے روز پھر گھاٹ پہنچ گئے۔ اس مرتبہ ٹیڈو اور نوکھا بھی ساتھ تھے۔ لکڑی کی دو بیٹیاں بھی تھیں جن میں کچھ آلات تھے۔ ان میں سے کچھ آلات ایک کین میں سیٹ کر دیئے گئے اور کچھ باہر عرشے پر مختلف جگہوں پر لگا دیئے گئے۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہی تھے کہ نورو چاچا آ گیا۔

”کل رات کو ہم لوگ یہاں سے رخصت ہو جائیں گے نورو چاچا۔“ شارق نے کہا۔ ”ہم نے یہاں اپنے بہت قیمتی آلات لگوائے ہیں۔ اس لئے ہمارا یہ آدمی رات کو یہیں رہے گا۔“
”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ نورو چاچا نے جواب دیا۔

”کل شام سے پہلے پہلے لاٹچ کا انجن وغیرہ چیک کر دالیں اور تیل بھروالیں۔ ہم آدھی رات کو روانہ ہو جائیں گے کیونکہ صبح سویرے ہمیں اس جگہ پہنچنا ہے جہاں ہم اپنا حقیقی کام کرنا چاہتے ہیں۔“

”سارا انتظام ہو جائے گا تم لوگ فکر مت کرو۔“ نورو چاچا نے جواب دیا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے وہ لوگ واپس آ گئے نوکھا کو لاٹچ پر ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ شارق نے ٹیڈو کو اگلے دن ملاقات کے لئے کہہ کر رخصت کر دیا اور وہ لوگ فیڈرل بی ایریا میں اس مکان پر آ گئے جس کا بندوبست ڈی کوشا نے کیا تھا۔ یہاں کھانا وغیرہ پکانے کے لئے ایک ملازم بھی تھا۔

ساری زندگی اس سمندر میں گزری ہے۔ لیکن آج تک میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس سے دوسروں کو مجھ پر انگلی اٹھانے کا موقع مل سکے۔“

”تم غلط سمجھ نورو چاچا۔“ شارق نے کہا۔ ”ہمارا تعلق ایک ایسے پرائیویٹ ادارے سے ہے جو سمندر میں مختلف قسم کی تحقیقات کرتا ہے۔ ہمارے ادارے کے پاس اپنی دو لائنیں ہیں لیکن اتفاق سے دونوں لائنیں سمندر میں گئی ہوئی ہیں اس لئے ہمیں لاٹچ کی ضرورت پڑ گئی ہے آپ کو ادارے کی طرف سے ضمانت فراہم کی جائے گی کہ اسے غیر قانونی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کیا جائے گا۔“

نورو چاچا چند لمحوں خاموشی سے ان تینوں کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

”لاٹچ آپ کو کتنے دنوں کے لئے چاہئے؟“

”کم از کم ایک ہفتے کے لئے۔ زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔“ شارق نے جواب دیا۔

”اتفاق سے میری وہ لاٹچ آج صبح ہی سمندر سے واپس آئی ہے جو آپ کے کام کی ہو سکتی ہے۔ آپ لوگ پہلے لاٹچ دیکھ لیں اس کے بعد بھاڑا وغیرہ طے کر لیں گے۔“ نورو چاچا کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

وہ لوگ جمونپڑی سے نکل کر گھاٹ پر آ گئے۔ کئی کشتیاں اور لائنیں کھڑی تھیں زیادہ ز ایسی تھیں جو صرف مٹی گیری کے لئے ہی استعمال ہو سکتی تھیں البتہ دو ایسی لائنیں بھی نظر آ رہی تھیں جن پر باقاعدہ کین بنے ہوئے تھے۔

وہ لوگ بیٹی سے ہوتے ہوئے اس لاٹچ پر آ گئے جس کے کین پر نیلے رنگ میں ایک چوڑی پٹی بنی ہوئی تھی۔ کین کے عرشے پر تین آدمی کام کر رہے تھے۔ دو تو جال سمیٹ رہے تھے اور ایک عرشے کی صفائی کر رہا تھا۔ مچھلی کی بوتلیاں طور پر فضا میں پھیلی ہوئی تھیں۔

”یہ لاٹچ میرا بیٹا استعمال کرتا ہے۔“ نورو چاچا نے کہا۔ ”اس میں دو کین ہیں اور انجن بہترین حالت میں ہے۔ چند روز پہلے ہی انجن کی اوور ہالنگ کی گئی ہے۔“

وہ لوگ گھوم پھر کر لاٹچ دیکھنے لگے۔ اور پھر اس کے کرائے کی بات ہونے لگی۔ نورو چا بہت زیادہ مانگ رہا تھا لیکن بہر حال ان میں معاملہ طے ہو گیا۔

”تم لوگ کب جانا چاہتے ہو؟“ نورو چاچا نے پوچھا۔

”تین چار دن تو لگیں گے۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”اس دوران ہمیں لاٹچ پر کچھ کام ہو گا۔ کچھ آلات اور مشینیں فٹ کرنی ہیں۔ کل میں اپنے کاریگروں کو لے کر آ جاؤں گا اور یہی کام مکمل ہو گا ہم روانہ ہو جائیں گے۔“

اسے ہر حال مطمئن کر دیا کہ اس ڈبے میں تحقیقاتی آلات ہی لگے ہوئے ہیں۔ اس نے وعدہ کے مطابق آدمی رقم نورو چاچا کے حوالے کر دی اور طے یہ پایا تھا کہ باقی رقم واپسی پر ادا کی جائے گی۔

کنٹینر کو لانچ کے نچلے حصے میں پہلے سے لگی ہوئی آہنی پٹیوں میں باندھ دیا گیا اور اب وہ سب لوگ دعا مانگ رہے تھے کہ رواجی تک کا وقت خیریت سے گزر جائے۔ پروگرام کے مطابق دس بجے کے لگ بھگ ٹیو بھی پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی کو دیکھ کر شارق چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا حالانکہ کسی آدمی کو ساتھ لے جانے کے لئے ان میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ آدمی شکل سے ہی چھٹا ہوا بد معاش لگتا تھا۔

”یہ کون ہے؟“ شارق نے ٹیو سے پوچھا۔

”یہ میرا خاص آدمی ہے۔“ ٹیو نے جواب دیا۔ ”ہم جس مہم پر جا رہے ہیں اس میں اس قسم کے آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔ اس لئے میں نے اسے ساتھ لے لیا ہے۔“

”مگر پہلے تو تم نے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔“ شارق نے اسے گھورا۔

”اس سے ملاقات ہی آج ہوئی ہے۔“ ٹیو نے کہا۔ ”اس کا نام مانڈا ہے میں نے اس سے ذکر کیا تو فوراً ہی تیار ہو گیا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مانڈا بڑے کام کا آدمی ہے۔“

شارق الجھن میں پڑ گیا تھا۔ اسے ٹیو کی نیت پر شبہ ہونے لگا تھا لیکن اگر وہ مانڈا کو ساتھ لے جانے سے انکار کر دیتا تو یہیں سے گزربود شروع ہو سکتی تھی۔ اس لئے اس نے خاموشی ہی میں غایت سمجھی۔ ویسے بھی وہ سوچ رہا تھا کہ راستے میں اگر ان کی نیت میں فتور آگیا تو یہ لوگ کیا کر سکیں گے۔ وہ دو تھے اور شارق اور اس کے ساتھیوں کی تعداد چار تھی۔ تین آدمی لانچ کے عملے میں تھے اور ظاہر ہے کسی ہنگامی صورت حال میں وہ شارق ہی کا ساتھ دیں گے۔

لانچ کا کیپٹن نورو چاچا کا بیٹا قاسم تھا۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ تھی اور وہ بھی اپنے دونوں ساتھیوں کی طرح ہٹا کٹا آدمی تھا۔ ٹھیک آدمی وقت لانچ حرکت میں آکر کھاڑی سے نکلی اور آہستہ آہستہ گہرے سمندر کی طرف بڑھنے لگی۔

ایک کیبن کو دفتر کے طور پر آراستہ کر لیا گیا تھا۔ وہاں بعض آلات کے علاوہ کچھ کافذات اور سمندری نقشے بھی تھے۔ ٹیمن، شارق اور ڈی کوشا اسی کیبن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اگرچہ سمندر میں سفر کرنے کا یہ شارق کا بھی پہلا موقع تھا لیکن ٹیمن تو اپنے آپ میں عجیب سی سنسنی کی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔

شارق نے قاسم کو نقشوں کی مدد سے اپنی منزل کے بارے میں بتا دیا تھا اور لانچ مناسب رفتار

یہ لوگ اسے بتا کر گئے تھے کہ رات کا کھانا گہرے آکر ہی کھائیں گے۔ اس لئے اس نے کھانا تیار کر رکھا تھا۔

ان تینوں نے اکٹھے ہی بیٹھ کر کھانا کھایا اور اس کے ساتھ ہی کل کا پروگرام بھی طے کر لے گئے۔ جس جہاز پر انہیں ہیروئن کی یہ کپھ منتقل کرنا تھی وہ ہفتہ کی صبح پاکستان کی سمندری حدود کے باہر ایک خاص مقام پر پہنچنے والا تھا۔ شارق نے جہاز کے ٹائم ٹیبل کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی اپنا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ وہ جمعرات کی رات کو ساحل سے روانہ ہو کر اور بڑے اطمینان سے سفر کرتے ہوئے مقررہ وقت سے کئی گھنٹے پہلے وہاں پہنچ سکتے تھے۔

ڈی کوشا تقریباً بارہ بجے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ملازم بھی اوپر چھت پر واقع اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ شارق نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور ٹیمن کی طرف دیکھنے لگا۔

ٹیمن نے نوکھٹا کے ساتھ دو تین دن کراچی کی سیر کی تھی اور پھر شارق کے ساتھ کلام میٹر مصروف ہو گئی تھی۔ آج بھی وہ بہت تھک گئی تھی۔ بستر پر لیٹتے ہی سو گئی۔

صبح وہ دیر تک سوتے رہے۔ باہر کا کوئی کام نہیں تھا اس لئے شام تک گھر پر ہی رہے اور پھر شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی وہ لوگ مکان سے رخصت ہو گئے۔ جب وہ لوگ سبزی منڈی کے عقبی حصے میں واقع خالی پٹیوں والے اس گودام میں پہنچے تو وہاں درمیانے سائز کا مزہ کا ایک ٹرک تیار کھڑا تھا۔ اس پر لکڑی کی پٹیاں لدی ہوئی تھیں اور ان پٹیوں کے نیچے وہ آہنی کنٹینر تھا جس میں پانچ سو کلو ہیروئن رکھی گئی تھی۔

ڈی کوشا ڈرائیور کے ساتھ ٹرک پر بیٹھ گیا۔ ٹرک منڈی سے نکل کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ٹیمن اور شارق بھی ایک ٹیکسی پر ملای گیروں کی بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔

شارق اور ٹیمن ٹرک سے پہلے ملای گیروں کی بستی پہنچ گئے۔ ٹرک آدھے گھنٹے بعد پہنچا تھا۔ ٹرک رکتے ہی پٹیاں اتار کر اس میں سے آہنی کنٹینر اتار لیا گیا۔ ٹھیک اسی وقت نورو چاچا بھی پہنچ گیا۔

”یہ کیا ہے بھائی!۔۔۔ اس میں کیا ہے؟“ نورو چاچا نے کنٹینر کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کے اندر آلات لگے ہوئے ہیں۔ یہ ڈبہ پانی کی تہہ میں رہے گا اور اس کے اندر لگے ہوئے آلات ہمیں سمندر کے بارے میں وہ معلومات فراہم کریں گے جن کی ہمیں ضرورت ہے۔“ شارق نے جواب دیا۔

نورو چاچا مشتبہ نگاہوں سے کبھی کنٹینر اور کبھی شارق وغیرہ کی طرف دیکھتا رہا۔ شارق نے

دونوں لانچیں بہت قریب تھیں چند سیکنڈ بعد تین آدمی ان کی لانچ پر آگئے ان میں دو کے پاس سب مشین گنیں تھیں اور ایک کے پاس ریوالور۔

”آپ لوگ کون ہیں اور اس کھلے سمندر میں کہاں جا رہے ہیں؟“ ریوالور والے نے پوچھا۔ وہ اپنی پارٹی کا انچارج تھا۔

”ہمارا تعلق اوشیانوگرانی کے شعبے سے ہے اور ہم لوگ ریسرچ کے لئے گہرے سمندر میں جا رہے ہیں۔ ہمارے پاس حکومت کا اجازت نامہ اور دیگر کاغذات موجود ہیں۔ آپ چاہیں تو چیک کر سکتے ہیں۔“ شارق نے جواب دیا۔

”چیک تو کرنا ہی پڑے گا۔“ آفسر نے جواب دیا۔ اس کے ماتحت عرشے پر ہی مستعد کھڑے رہے اور وہ خود شارق اور ٹیم کے ساتھ کیبن میں آگیا۔ شارق نے ایک فائل اس کے سامنے رکھ دی۔ اس فائل میں وہ تمام ضروری کاغذات موجود تھے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ ان کا تعلق سمندری تحقیقات کے کسی شعبے سے ہے۔ اس تحقیقاتی مشن کے لئے حکومت کا اجازت نامہ بھی موجود تھا۔

آفسر نے تمام کاغذات چیک کر لئے۔ بیشتر کاغذوں پر سرکاری مہریں ثبت تھیں اس نے کاغذات دیکھتے ہوئے مطمئن انداز میں سر ہلادیا اور فائل واپس کرتے ہوئے بولا۔

”آپ کے کاغذات تو درست ہیں لیکن ہم لانچ کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ آپ تلاشی لیجئے۔“ شارق نے کہا۔

آفسر کیبن سے باہر آگیا۔ اس نے اپنی لانچ سے دو آدمی اور بلوا لئے اور وہ لانچ کی تلاشی لینے لگے۔ بحری کسٹمر کے ان اہلکاروں کا واسطہ دن رات مختلف قسم کی لانچوں اور جہازوں سے پڑتا رہتا تھا اور وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کسی چیز لانچ تلاشی کے لئے کون کون سی جگہوں پر توجہ دی جانی چاہئے۔

وہ تقریباً ایک گھنٹہ تک تلاشی لیتے رہے لیکن انہیں لانچ کے کسی بھی حصے سے کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ملی تھی۔ لانچ کے کاغذات بھی درست تھے۔ قاسم کے پاس پاکستان کی سمندری حدود میں مابی گیری کا اجازت نامہ موجود تھا۔ اور شارق کے پاس حکومت کا جاری کردہ وہ لیٹر بھی تھا جس کے تحت اس پارٹی کو پاکستان کی سمندری حدود کے باہر تحقیقات کی اجازت دی گئی تھی۔

لانچ کے کاغذات درست تھے۔ کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ملی تھی اس لئے لانچ کو روکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے جناب۔“ کسٹمر آفسر نے کہا۔ ”آپ لوگ جا سکتے ہیں۔“

سے گہرے سمندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ان کی منزل دو سو میل دور پاکستان کی سمندری حدود سے بھی تقریباً پچیس میل آگے آزاد سمندر میں وہ چھوٹا سا چٹانی جزیرہ تھا جس پر کسی قسم کی آبادی نہیں تھی۔ اس غیر ملکی جہاز کو اسی چٹانی جزیرے کے قریب ان کا انتظار کرنا تھا۔

ٹیم کے لئے عرشے پر گئی تھی لیکن چاروں طرف تاریک سمندر تھا۔ لانچ ہچکولوں سے اسے چکر سا آنے لگا اور وہ دوبارہ کیبن میں آگئی تھی۔ نوکھا عرشے پر تھا۔ اسے غار طور پر ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ مانیٹر پر نگاہ رکھے۔

ڈی کوشا اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا تھا۔ شارق اور ٹیم مدہم لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ لانچ اپنی رفتار سے منزل کی طرف چلی جا رہی تھی۔

اس وقت غالباً صبح کے چار بجے تھے کہ قاسم ان کے کیبن میں داخل ہوا۔

”کیا بات ہے قاسم؟“ شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایک لانچ دائیں طرف سے ہمارے سامنے آ رہی ہے۔ ہمیں روکنے کے لئے روشنی کا سگنل دیا جا رہا ہے۔“ قاسم نے بتایا۔

”اوہ!“ شارق ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ڈی کوشا بھی آواز سن کر جاگ گیا تھا۔ وہ تینوں قاسم کے ساتھ کیبن سے باہر آگئے۔ نوک ٹیو اور مانیٹر پہلے ہی سے عرشے پر موجود تھے۔ شارق ریٹنگ کے قریب رک کر دائیں طرف دیکھ لگا۔ بہت دور روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک روشنی مخصوص انداز میں جل بجھ رہی تھی۔

”یہ بحری فِداق تو نہیں؟“ ٹیم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کے چہرے پر فِداق کے سائے ابھر آئے تھے۔

”بحری فِداق!“ قاسم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”نہیں بی بی آج کل بحری فِداق نہیں ہوتے۔ بحری کسٹمر کی لانچ ہے۔ جس سے ہمیں روکنے کے لئے سگنل دیا جا رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ لانچ روک دو۔“ شارق نے کہا۔

قاسم نے چیخ کر اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور خود وہیل پر آگیا اس کا ایک ساتھی دوسری کو روشنی کا جوابی سگنل دینے لگا۔ قاسم نے لانچ کی رفتار کم کر دی تھی اور بالآخر وہ رک گئی۔

یہ دیر بعد دوسری لانچ بھی قریب آ کر رک گئی۔ اس پر پاکستانی جہنڈا لہرا رہا تھا اور لانچ کے پہلے بحری کسٹمر کا مخصوص نشان بنا ہوا تھا۔

”تم لوگ ہماری مشین گنوں کی زد پر ہو۔ کوئی شرارت مت کرنا۔ ہمارے آدمی چیکنگ کے لئے تمہاری لانچ پر آ رہے ہیں۔“ دوسری لانچ سے میکانوں پر کہا گیا۔

تمام کسٹمر والے اپنی لانچ پر چلے گئے۔ ان کی لانچ سمندر کے پانی میں ایک سفید محراب کی
بیاتی ہوئی بائیں طرف چلی گئی۔ قاسم نے بھی لانچ کا انجن اشارت کر دیا اور ان کی لانچ بھی حرکت
میں آکر اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگی۔

اس وقت دن کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ نوکھا عرشے پر ہی تھا اور ٹینہ، شارق اور ڈی کوشا
کیبن میں بیٹھے اس صورت حال پر تبصرہ کر رہے تھے۔
”اگر یہ کافذات مہارت سے تیار نہ کرائے گئے ہوتے تو ہمارا مشن یہیں پر ختم ہو جاتا۔
شارق نے ڈی کوشا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اسی لئے تو میں نے کہا تھا کہ نیو بڑے کام کا آدمی ہے۔“ ڈی کوشا نے جواب دیا۔
”انے کافذات تیار کرانے کے لئے جس آدمی کا انتخاب کیا تھا وہ واقعی فنکار ثابت ہوا۔ کسٹمر آفیسر
ان کافذات کے جعلی ہونے پر ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکا۔“
”نیو تو واقعی کام کا آدمی نکلا لیکن یہ مانڈا نام کے جس شخص کو ساتھ لے کر آیا ہے اس سے
مجھے ان کی نیوٹوں پر شبہ ہو رہا ہے۔“ شارق نے کہا۔

”ان کی تم فکر نہ کرو۔“ ڈی کوشا نے کہا۔ ”اگر ان کی نیوٹوں میں فتور بھی ہوا تو یہ لوگ
ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔“

اسی لمحہ کیبن کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور وہ تینوں چونک گئے۔ نیو دروازے سے ایک فرد
آگے بڑھ کر رک گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ تھی۔
”ہم تمہارا واقعی کچھ نہیں بگاڑیں گے بشرطیکہ تم لوگ یہ بتا دو کہ پانچ سو کلو ہیروئن تم لوگوں
نے اس لانچ کے کس حصے میں چھپائی ہے۔“ نیو نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے
کہا۔

”پانچ سو کلو ہیروئن!“ شارق کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”اگر ہیروئن اس لانچ پر ہوتی تو
تمہارے خیال میں یہ کسٹمر افران اتنے بے وقوف تھے کہ ہیروئن تلاش نہیں کر سکے۔“

”ان کی بے وقوفی میں شبہ نہیں ہے۔“ نیو نے کہا۔ ”لیکن میں بے وقوف نہیں ہوں۔
تم لوگ ہیروئن کے بارے میں بتا دو گے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم لوگوں کو ساحل پر لے جاؤں
اتار دیا جائے گا۔ بصورت دیگر ہم تم سب کو الگ الگ تشدد کا نشانہ بنا کر ہیروئن کے بارے میں
معلوم کر لیں گے۔“

”تم واقعی کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو۔“ ڈی کوشا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”ہیروئن یا کسی اور غیر قانونی چیز کی اسمگلنگ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نہیں سمجھتا

نہیں۔“
”یہ تو میں معلوم کر ہی لوں گا کہ ہیروئن لانچ میں کہاں چھپائی گئی ہے۔“ نیو نے اس کی بات
کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم لوگوں کا تعلق ہیروئن کی اسمگلنگ سے نہیں ہے تو جعلی کافذات کی
تجاری اور دیگر انتظامات پر لاکھوں روپے خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہیروئن ہی ایک ایسی چیز
ہے جس سے اتنا منافع کمایا جا سکتا ہے اور پھر معاملہ پانچ سو کلو ہیروئن کا ہو تو چند لاکھ روپے کا
خرچ کوئی معنی نہیں رکھتا اور پھر تم مجھے اتنا بے وقوف کیوں سمجھتے ہو۔ میں نے تمہیں ہیروئن کی
مقدار بتادی ہے اس کا مطلب ہے کہ میں غلط نہیں کہہ رہا۔“

”تم یقیناً غلط کہہ رہے ہو۔“ شارق نے کہا۔ ”ہمارا ہیروئن سے کوئی...“
”اب میں مزید کوئی کجواس نہیں سنوں گا۔“ نیو نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں ہیروئن کے
بارے میں جاننا چاہتا ہوں اور کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔“

وہ تینوں خاموش رہے۔ شارق سوچ رہا تھا کہ اس کا دوسرا ساتھی مانڈا عرشے پر ہے اور یقینی
بات تھی کہ اس نے نوکھا اور قاسم وغیرہ کو پستول یا ریوالور کی زد پر لے رکھا ہو گا۔
”اے... تم ادھر آؤ۔“ نیو نے خالی ہاتھ سے ٹینہ کو اشارہ کیا۔ ”میرا خیال ہے گھی سیدھی
الگیوں سے نہیں نکلے گا۔“

ٹینہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ اس کا چہرہ خوف سے دھواں ہو رہا تھا۔
”میں نے کہا تم ادھر آؤ!“ نیو دھاڑا۔
ٹینہ نے ڈی کوشا اور شارق کی طرف دیکھا اور اٹھ کر نیو کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ نیو نے
پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی۔

”میں تین تک گئوں گا۔“ نیو نے ڈی کوشا اور شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تین
کنے کے بعد بھی تم میں سے کسی نے مثبت جواب نہیں دیا تو اس خوبصورت لڑکی کی کھوپڑی میں
سوراخ کر دوں گا۔ ایک... دو...“

نیو کے تین کنے سے پہلے ہی عرشے کی طرف سے فلاز کی ایک آواز سنائی دی۔ نیو نے
چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ٹینہ اگرچہ بے حد خوفزدہ تھی لیکن اس موقع پر اس نے بڑی
بلاری اور عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے بڑی پھرتی سے نیچے جھک کر دونوں کہنیاں نیو کے
پیش میں مار دیں اور خود بھی نیچے گر گئی۔

نیو کے منہ سے کراہ سی نکل گئی۔ اس نے غیر ارادی طور پر پستول کا ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی
بین کی گول کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی نکل گئی۔ شارق اور ڈی کوشا نے بیک وقت اپنی جگہ سے

چھلانگ لگائی تھی۔ ڈی کوشا کے پیر کی ٹھوکر ٹیو کے پستول والے ہاتھ پر لگی اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دروازے سے باہر جاگرا۔

ٹیو نے بھی فوراً ہی سنبھل کر باہر چھلانگ لگا دی لیکن شارق اسے دروازے ہی میں چھاپ چکا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو رگیدتے ہوئے کیبن کے دروازے سے باہر نکل گئے۔ ٹیو فرژ پر پڑے ہوئے پستول پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا مگر ڈی کوشا نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ اپنے پیر کے نیچے پکڑ کر رکھ دیا۔ ٹیو کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

اسی لمحہ ایک اور فائر ہوا۔ ایک چیخ فضا میں ابھری اور پھر شرپ کی آواز سنائی دی۔ شارق کی توجہ ایک لمحہ کو ہٹی تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹیو نے اسے اپنے اوپر سے دھکیل دیا اور اٹھ کر لالچ کے وہیل کیبن کی طرف دوڑ لگا دی۔ شارق نے لپک کر پستول اٹھایا اور ٹیو کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

ٹیو کے لئے یہ انکشاف بڑا خوفناک ثابت ہوا کہ مانند لالچ کے کپتان قاسم کے ہاتھوں گولی نشانہ بن کر سمندر میں جاگرا تھا۔ ٹیو بری طرح بدحواس ہو گیا وہ وہیل کیبن میں داخل ہونا چاہتا تھا کہ شارق نے بڑی پھرتی سے آگے آکر اس کے منہ پر زور دار گھونسہ رسید کر دیا۔ ٹیو لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔

شارق کے بائیں ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے ٹیو کو پستول کی زد پر لے لیا۔ ٹیو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا اور بالاخر عرشے کی ریٹنگ سے جا لگا۔

”مجھے پہلے ہی دن سے شبہ تھا کہ تم کوئی حرامزدگی کرو گے۔“ شارق غرایا۔

”تنت... تم مجھے پکڑ نہیں سکو گے۔“ ٹیو ہٹلایا۔

اور اس سے پہلے کہ شارق کچھ سمجھتا ٹیو نے اچانک ہی سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

”خس کم جہاں پاک۔“ ڈی کوشا نے کہا۔

”استاد! وہ دیکھو!“ قاسم کا ایک آدمی چیخا۔ ”کوئی لالچ اس طرف آ رہی ہے۔“ اس نے

طرف اشارہ کیا۔

وہ سب چونک کر اس طرف دیکھنے لگے۔ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں میں سمندر سطح پر اچھلتی ہوئی ایک لالچ صاف نظر آ رہی تھی۔ اس لالچ کا رخ اسی طرف تھا۔



”خطرہ ہمارے سر پر آ رہا ہے مسٹر شارق! اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟“ لالچ کے کپتان قاسم نے سوالیہ نگاہوں سے شارق کی طرف دیکھا۔

”یہ کونسی لالچ ہو سکتی ہے؟“ شارق نے پوچھا۔ وہ دوسری لالچ کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں تشویش نمایاں تھی۔

”میری ٹائم سیکیورٹی۔“ قاسم نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ کسٹروالوں کی طرح بے وقوف نہیں ہیں۔ آسانی سے دھوکا نہیں کھا سکیں گے۔“

”کیا مطلب۔ میں سمجھا نہیں۔“ شارق نے اسے گھورا۔

”میرا باپ پرانے زمانے کا آدمی ہے۔“ قاسم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کئی سال پہلے اس نے سمندر کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اب تو ساحل پر کھڑے ہو کر پرسکون لہروں کو دیکھ کر ہی خوش ہو لیتا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ منشیات اور مختلف چیزوں کی اسمگلنگ کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ لیکن میں....“

”تم غلط سمجھ رہے ہو قاسم۔“ شارق نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”منشیات کی اسمگلنگ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”بقول شخصے میں نے بھی گھٹ گھٹ کا پانی پیا ہے شارق بابو۔“ قاسم نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئی کہا۔ ”اس مشن پر روانگی سے پہلے تین چار دن تک تم لوگ اس لالچ پر جو کچھ کرتے رہے ہو سب میری نظروں میں ہے۔ یہ آلات تو دوسروں کو دھوکا دینے کے لئے ہیں۔ اصل مال تو اس لوہے کے ڈبے میں ہے جو اس لالچ کے پینڈے میں بندھا ہوا ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھنا۔ کسٹرو والے جعلی کلغذات اور ان آلات سے دھوکا کھا سکتے ہیں۔ لیکن میری ٹائم سیکیورٹی والے نہیں۔ ان کے پاس بڑے جدید ترین انتظامات ہیں۔ وہ ایک منٹ میں معلوم کر لیں گے کہ یہ کلغذات جعلی ہیں۔“

”وہ یہی کریں گے تاکہ وائرلیس پر اپنے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر کے ہمارے کلغذات کے بارے میں تصدیق کرنے کی کوشش کریں گے۔“ شارق ایک لمحہ کو خاموش ہوا۔ اس کے ہونٹوں

پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ لیکن میں نے یہ پلانٹ بہت سوچ سمجھ کر کی تھی۔ آج جمعہ ہے تمام سرکاری دفاتر بند ہوتے ہیں۔ کم از کم آج کا دن تو یہ کسی طرح بھی ہمارے کٹھنات کے بارے میں تصدیق نہیں کر سکتے۔

”ایسی باتوں کی تصدیق کے لئے ان کے پاس اور بھی بہت سے ذرائع ہیں۔“ قاسم نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دوبارہ بولا۔ ”تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ مانڈا کی لاش سمندر میں تیر رہی ہو گی اور ٹیو بھی ابھی سمندری لہروں پر ہاتھ پیر مار رہا ہو گا۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی لالچ والوں کی نظروں میں آ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ان کے کھینچے سے بچ نکلنا ممکن نہیں ہو گا۔ اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ ان کے ہاتھ سے بچنا چاہتے ہو یا۔۔۔“ اس نے معنی خیز انداز میں جملہ اودھورہ چھوڑ دیا۔

”تم کیا چاہتے ہو قاسم؟“ شارق نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ انہیں بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔

”انتظامات پر لاکھوں روپے خرچ کئے گئے ہیں تو مال تو کروڑوں کا ہو گا۔“ قاسم بولا۔

”میں تمہیں پچاس ہزار دینے کو تیار ہوں۔“ شارق اس کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔

”پچاس ہزار تو بہت کم ہیں شارق بابو۔“ قاسم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پانچ لاکھ کی بات کرو۔ پانچ لاکھ کی۔“

”دیکھو قاسم۔“ شارق نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”یہ مال ہمارا نہیں ہے۔ ہم تو صرف کمیشن پر کام کر رہے ہیں۔ میں تمہیں زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ روپے دے سکتا ہوں۔ اگر تمہیں قبول ہے تو ٹھیک بصورت دیگر لالچ روک لو اس کے بعد جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ویسے تمہیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ لالچ تمہاری ہے۔ اگر اس میں سے کوئی غیر قانونی چیز برآمد ہوتی ہے تو پانچ تم بھی نہیں سکو گے۔ اس لئے عقل مندی یہی ہے کہ ایک لاکھ پر ہی اکتفا کر لو۔“

”ٹھیک ہے۔“ قاسم کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کو آواز دے کر قریب بلایا اور اپنی زبان میں کچھ کہا۔ وہ انجن روم کی طرف دوڑ گیا۔ دوسرا ساتھی ہدایت پا کر لالچ کے اس حصے کی طرف دوڑ گیا جہاں رسے اور جال وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ پہلا آدمی جلد ہی واپس آ گیا۔ اس نے ایک سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا۔

”تم لوگ اس کے ساتھ کیبن میں جاؤ اور کپڑے بدل لو۔ اس سوٹ کیس میں ایک زنانہ جوڑا بھی ہے۔ جو تمہاری اس ساتھی کو بورا آ جائے گا۔ بلکہ ڈھیلا ہو گا اور ڈھیلا ڈھیلا لباس ہی

س کے لئے بہتر ہے۔ ہمیں اس قسم کی صورت حال کا اندازہ تھا اس لئے میں نے پہلے ہی یہ بارے انتظامات کر لئے تھے۔“

”کیا کرنا چاہتے ہو؟“ شارق نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہم لوگ مانی گیر ہیں۔ مچھلیاں پکڑنے کے لئے گہرے سمندر کی طرف جا رہے ہیں۔ کھلے

مندر میں مانی گیری کا اجازت نامہ ہمارے پاس موجود ہے۔“ قاسم نے کہا۔

”لیکن مانی گیری کی لالچ پر ایک عورت کی موجودگی؟“ شارق نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ قاسم کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

”مانی گیری کی لالچ پر کسی عورت کا موجود ہونا اچھے کی بات نہیں ہے۔“ قاسم نے کہا۔

”مانی گیر جب زیادہ دنوں کے لئے کھلے سمندر میں جاتے ہیں تو کھانا وغیرہ پکانے کے لئے گہری کسی عورت کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں اور بعض اوقات تو بچے بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ مانی گیروں کی زندگی ہی سمندر کی لہروں پر گزرتی ہے اس لئے عورت کی موجودگی کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جاؤ۔۔۔ تم لوگ جلدی سے لباس بدل لو وہ تمام آلات جو کیبن میں لگا رکھے ہیں سمندر میں پھینک دو۔ عرشے پر لگے ہوئے آلات میرے آدمی پھینک دیں گے۔ ہمارے کٹھنات اور اپنے یہ کپڑے سمیٹ کر سوٹ کیس میں بند کر کے میرے آدمی کے حوالے کر دینا۔ میرا آدمی ان کا بھی بندوبست کر لے گا۔ جاؤ۔۔۔ اب دیر مت کرو۔“

شارق وغیرہ قاسم کے ماتحت نبی بخش کے ساتھ کیبن میں آ گئے۔ نبی بخش نے سوٹ کیس بڑ پر رکھ دیا اور دوسری میزوں پر لگے ہوئے آلات اکھاڑنے لگا۔ شارق نے تمام کٹھنات سمیٹ کر فائل میں جمع کر دیئے۔ نبی بخش وہ قیمتی آلات سمندر میں پھینک آیا۔

نولکھا وغیرہ سوٹ کیس میں سے لباس نکال رہے تھے۔ یہ پرانے اور استعمال شدہ لباس تھے اور ایسے ہی تھے جیسے مانی گیر استعمال کرتے ہیں۔ نولکھا اور ڈی کوٹا اپنے اپنے لباس لے کر لاسرے کیبن میں چلے گئے۔ ٹیمنے کے لباس کے ساتھ پلاسٹک کی چوڑی سفید اور نیلی چوڑیاں بھی تھیں اور ایک چادر بھی اور چاندی کے بالے بھی۔

”تم جلدی سے کپڑے بدل لو۔ میں کوئی اور جگہ تلاش کر لیتا ہوں۔“ شارق نے ٹیمنے سے کہا اور نبی بخش کو لے کر کیبن سے باہر آ گیا۔

ٹیمنے نے دروازہ بند کر لیا اور بڑی تیزی سے لباس تبدیل کرنے لگی۔ اس نے پلاسٹک کی چوڑیاں بھی پہن لیں اور کالوں میں بالے بھی۔ اس نے اپنی پینٹ شرٹ تہہ کر کے میز پر ڈال ڈال۔ پینٹ کی جب میں کچھ رقم تھی جسے نکال کر اس نے اپنے گریبان میں ٹھونس لیا تھا۔

کی طرف تھیں جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ قاسم نے ان کے چلنے بدلنے میں اگرچہ بڑی پھرتی دکھائی تھی لیکن اس بات کا اندیشہ بہر حال موجود تھا کہ ان کی کسی قسم کا شبہ نہ کر لیا جائے۔

اسے قاسم پر بھی بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ بظاہر سیدھا سادھا نظر آنے والا یہ آدمی بڑا گھاگ تھا۔ اور اس نے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ اسے یقیناً شروع ہی سے ان پر شبہ رہا تھا اور یہاں کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ شارق کو یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ قاسم کی لانچ اسٹانگ میں استعمال ہوتی رہی تھی اور وہ خود بھی اس دھندے میں ملوث رہا ہو گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ان کے بارے میں اس قدر صحیح اندازہ نہ لگا لیتا۔

قاسم کی ساری زندگی سمندر کی لہروں پر گزری تھی وہ ایک مشاق ملاح تھا وہ لانچ کو اس جگہ بہت دور نکال لے گیا تھا جہاں سمندر میں مینڈا کی لاش گری تھی اور نیوٹن نے چھلانگ لگائی تھی۔ لیکن اس کا بھی حل تلاش کر لیا گیا تھا۔ نبی بخش اسے کیبن والے کمرے میں لے گیا وہ میری ٹائم سیکورٹی والوں کو کوئی ایسا موقع نہیں دینا چاہتا تھا جس سے ان پر کسی قسم کا شبہ نہ کر لیا جائے۔ وہ لانچ کو اس طرح وہاں سے نکال کر لے گیا تھا کہ یہ شبہ بھی نہ ہو سکے کہ وہ فرار کی کوشش کر رہے ہیں۔

دوسری لانچ قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ نصف دائرے کی صورت میں آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے سامنے سے اس لانچ کا راستہ روکنا چاہتی ہو۔ لانچ پر بھاری مشین گنیں نصب تھیں اور جوان بڑی مستعدی سے ان مشین گنوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ جیسے اپنے آفیسر کا اہم عملہ ملے ہی فائر کھول دیں گے۔ کچھ جوان سب مشین گنیں سنبھالے کھڑے تھے۔

قاسم نے اپنی لانچ کی رفتار کم کر دی اور بالاخر وہ رک گئی۔ دوسری لانچ بھی ان کے برابر آ کر رک چکی تھی۔ دو جوان ریٹنگ پر چڑھ کر ان کی لانچ پر کود آئے۔ ”دوہو! یہ قاسم ہے۔“ ایک جوان نے قاسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جو وہیل کیبن سے اٹھ کر ان کی طرف آ رہا تھا۔

قاسم نے آگے بڑھ کر بڑے تپاک سے ان سے ہاتھ ملایا۔ ایک دوسرے کو شناخت کر لینا ان کی بات نہیں تھی۔ سمندر میں ایک دوسرے سے آنا سامنا ہوتا ہی رہتا ہے۔

دو اور آدمی بھی لانچ پر آ گئے۔ ان میں سے ایک آفیسر تھا۔ اس نے بھی قاسم کو پہچان لیا۔ ”اس مرتبہ تم جلدی سمندر میں واپس آ گئے۔“ آفیسر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں جہاز دن پہلے تو تم ساحل پر گئے تھے۔“

حصہ سوم

کیبن کے باہر شارق بھی ایک آڑ میں کھڑا لباس تبدیل کر رہا تھا۔ یہ لباس اس کے جسم پر چمک کا رومال بھی لپیٹ لیا اور جوتے اتار کر وہ چپل پہن لیا۔ سوت کیس سے برآمد ہوئی تھی۔ دوسروں کے حصے میں بھی ایک ایک چپل آئی تھی۔ سوت کیس میں دو جوڑے بچ گئے تھے۔ قاسم نے پہلے ہی سے پورا انتظام کر رکھا تھا۔ باقی دونوں جوڑے اور مینڈا کے لئے تھے لیکن وہ دونوں سمندر برد ہو چکے تھے۔

ثمینہ نے کیبن کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے چادر بھی اوڑھ رکھی تھی۔ نوکھا کی رگت ان میں وہ سونا آبنوسی رنگت کا مالک تھا۔ انہوں نے جو لباس پہنے تھے ان میں وہ بھی وہی رنگت تھی۔

شارق اور ثمینہ کی رنگت گوری تھی۔ ثمینہ نے تو ہاتھ اور چہرہ چادر میں چھپا لیا تھا۔ زمین پر لگتے ہوئے گھاگہرے میں چھپ گئے تھے۔ البتہ شارق کی رنگت اس کی چٹلی کھا رہی تھی۔ لیکن اس کا بھی حل تلاش کر لیا گیا تھا۔ نبی بخش اسے کیبن والے کمرے میں لے گیا وہ میری ٹائم سیکورٹی والوں کو کوئی ایسا موقع نہیں دینا چاہتا تھا جس سے ان پر کسی قسم کا شبہ نہ کر لیا جائے۔ وہ لانچ کو اس طرح وہاں سے نکال کر لے گیا تھا کہ یہ شبہ بھی نہ ہو سکے کہ وہ فرار کی کوشش کر رہے ہیں۔

نبی بخش سوت کیس ٹھکانے لگا آیا تھا جس میں ان کے کپڑے، جوتے اور وہ جعلی کلغذات فائل تھا۔ وہ ثمینہ کو اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”نبی بی! تم میرے ساتھ آؤ۔“

ثمینہ نے شارق کی طرف دیکھا اور پھر نبی بخش کے پیچھے چل پڑی۔ نبی بخش اسے والے کیبن کے پچھلی طرف لے گیا۔ یہاں تین اطراف میں تختے کھڑے کر کے یہ مختصر گویا باورچی خانے کے طور پر مخصوص کر دی گئی تھی۔ مٹی کے تیل کا چولہا، چائے کے برتن اور کھانے پکانے کے لئے ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ چولہا جل رہا تھا اور اس پر دھوئیں کالی ایک کیتلی چڑھی ہوئی تھی۔

”اس ڈبے میں چائے کی پتی ہے، اس میں چینی اور یہ خشک دودھ ہے۔ پلاسٹک کنسٹر میں پینے کا پانی ہے۔ کیتلی چڑھی ہوئی ہے۔ تم یہاں بیٹھ کر چائے بناؤ۔“ نبی بخش نے اس کی ڈیوٹی سمجھا دی۔

نوکھا اور ڈی کوٹا، قاسم کے دوسرے ماتحت عمر کے ساتھ عرشے کے ایک حصے میں بیٹھ کر پکڑنے والے جال اور رسوں میں الجھے ہوئے تھے۔

شارق انجن والے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کی نظریں دھوپ میں چمکتی ہوئی اس سفید

”موسم اچھا ہے۔ ہم نے سوچا کیوں نہ ایک لمبا پھیرا لگا لیا جائے آپ جانتے ہیں پھر برسات کا موسم شروع ہونے والا ہے۔“ قاسم نے کہا۔
 ”لمبا چکر!“ آفسر نے اسے گھورا۔ ”واقعی کوئی لمبا چکر تو نہیں چلا رہے؟“
 ”نہیں صاحب!“ آپ جانتے ہیں میں ایسے دھندوں میں نہیں پڑتا جس میں کوئی عزت نہ رہے۔“ قاسم نے جواب دیا۔

”کتنے آدمی ہیں تمہارے ساتھ؟“ آفسر نے پوچھا۔

”ہم نوٹل سات ہیں جی۔ اس میں میری گھر والی بھی شامل ہے۔“ قاسم نے جواب دیا پھر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جادیکہ وہ چائے بنا رہی ہے یا اس نے گائے کے پائے چا رکھے ہیں۔ چائے لاکر پلاؤ مہمانوں کو۔“

نبی بخش انجن والے کین کے پچھلی طرف چلا گیا۔

آفسر عرشے پر موجود آدمیوں کو گھور رہا تھا۔ پھر وہ شارق کے قریب آ کر رک گیا جو انجن والے کین کے دروازے سے نیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کپڑا تھا جس پر نگر وغیرہ کے دھبے لگے ہوئے تھے۔

”کپتان صاحب!“ قاسم جلدی سے ان کے قریب آ گیا۔ ”یہ اپنا دستری ہے عبدالرحیم انر کچھ پریشان کرنے لگا تھا اس لئے میں نے اس مرتبہ اسے بھی ساتھ لے لیا۔“
 آفسر گہری نظروں سے شارق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شارق کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی رہی تھی لیکن اس نے اپنے چہرے سے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ٹھیک اس لمحہ نبی بخش پلاسٹک کی ایک پلیٹ میں چار گے رکھے ہوئے آ گیا۔ پلاسٹک کے گے خاصے استعمال شدہ لگ رہے تھے۔

”چائے پو کپتان صاحب۔“ قاسم نے ایک مگا اٹھا کر کپتان کی طرف بڑھا دیا۔

”میں چائے نہیں پیوں گا۔ البتہ تمہاری لالچ چیک کرنا چاہتا ہوں۔“ آفسر نے جواب دیا۔

”ضرور جی۔ آپ اپنی ڈیوٹی ضرور پوری کیجئے۔“ قاسم نے کہا اور چائے کا مگا شارق کی طرف

بڑھا دیا۔ شارق مگا لے کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔

آفسر نے اپنے جوانوں کو اشارہ کیا۔ وہ لالچ میں پھیل گئے۔ آفسر انجن والے کین کے

سے گھوم کر دوسری طرف آ گیا۔ قاسم بھی اس کے ساتھ تھا۔ ٹیمپہ چولے کے سامنے بیٹھی

تھی اس نے چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ ہاتھ تک چھپ کر رہ گئے تھے۔

”یہ میری گھر والی ہے جی۔“

پشت پر قاسم کی آواز سن کر ٹیمپہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا خون کھول اٹھا۔ کم بخت کس کے سامنے اسے اپنی بیوی بتا رہا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحہ خوف غصے پر غالب آ گیا قاسم کے ساتھ یقیناً کوئی سیکورٹی آفسر تھا اگر اسے ذرا سا بھی شبہ ہو گیا کہ یہ عورت اس کی گھر والی نہیں تو وہ سب لوگ قانون کے شکنجے میں اس طرح کے جائیں گے کہ نجات کی کوئی راہ نظر نہیں آئے گی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک تلاشی کا سلسلہ جاری رہا۔ سیکورٹی کے جوان مطمئن تھے کہ لالچ پر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے غیر قانونی کہا جاسکے البتہ انہوں نے اس پہلو پر دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ لالچ کے عرشے پر چار افراد کا وجود ہی غیر قانونی تھا۔

سیکورٹی آفسر اور تمام جوان اپنی لالچ پر چلے گئے۔ وہ لالچ حرکت میں آ کر آہستہ آہستہ دور ہونے لگی۔ جبکہ ان کی لالچ وہیں کھڑی رہی۔ وہ لوگ عرشے پر اس طرح چلتے پھرتے رہے جیسے کام میں مصروف ہوں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد سیکورٹی کی لالچ نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ قاسم نے اپنی لالچ کا انجن اشارت کر دیا اور اسے حرکت میں لے آیا۔

دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ تیز ہوا ہونے کے باوجود دھوپ کی تپش سے ان کے دماغ پلپلے ہونے لگے تھے۔ ابھی تو دن کی ابتدا ہوئی تھی۔ شارق کا خیال تھا کہ اگر گرمی بڑھتی رہی تو دوسرے کے وقت یہ لوگ پاگل ہو جائیں گے۔

انہوں نے ابھی تک صرف چائے پی تھی۔ ناشتے کے لئے بند خوراک کے ڈبے کھولے گئے اور ایک مرتبہ پھر چائے بنانا پڑی۔

ٹیمپہ، شارق اور ڈی کوشا کین میں آ گئے تھے۔ نو لکھا عرشے پر ہی تھا۔ وہ قاسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور اس سے لالچ کے بارے میں مختلف سوالات کر رہا تھا۔ قاسم مسکرا مسکرا کر اس کے ہر سوال کا جواب دے رہا تھا۔

ڈی کوشا اور شارق بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ٹیمپہ اپنے بک پر لیٹ گئی تھی کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔

ٹیمپہ کو دوپہر دو بجے کھانا کھانے کے لئے جگایا گیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ پھر لیٹ گئی اور اونگھنے لگی۔ اس پر سستی سوار تھی۔ جسم ٹوٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کر یونی لیٹ رہے۔ اس میں ٹیمپہ کا قصور نہیں تھا۔ سب سمندری ہوا کا اثر تھا۔

سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر پہلے ٹیمپہ اٹھ کر کین سے باہر آ گئی۔ مغربی افق پر ہلکے

بھر تھی۔ بچیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر رہی تھی۔ انہیں یہ بتائی تھی کہ اچھا کیا ہے اور برا ہے۔ لیکن خود اچھے برے میں تمیز کرنا بھول گئی۔ اور ایسے راستے پر نکل آئی ہوں جہاں قدم اُٹھانے کا ذلت ہے اور رسوائی ہے۔“

”اور اس کا ذمہ دار میں ہوں۔“ شارق نے کہا۔

”میں اپنی برابری کا الزام کسی اور کو نہیں دوں گی۔“ ثینہ نے کہا۔ ”میں کوئی بچی نہیں تھی مورتحل کا اندازہ نہ لگا سکتی۔ آج میں جس جگہ پر کھڑی ہوں اس کی ذمہ دار میں خود

”میرا خیال ہے کہ تم بہت زیادہ مایوس ہو۔“ شارق نے کہا۔

”مایوسی اور امیدیں۔۔۔ اب میرے لئی بے معنی چیزیں ہو کر رہ گئی ہیں۔“ ثینہ نے گہرا لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”اب تو میں وہ ہوں جو اس وقت میں ہوں۔ اسمگلر، قانون کو اب۔۔۔ جس کا ہر لمحہ خوف میں گزر رہا ہے۔ پکڑے جانے کا دھڑکا تلوار کی طرح گردن پر لٹکا ہے۔“

”مجھے افسوس ہے کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔“ شارق نے کہا۔ ”لیکن بار بار اظہار اس کا کوئی فائدہ بھی تو نہیں ہے۔ ذہن پر بوجھ لادے رکھنے سے بہتر یہی ہے کہ اس پر خطر کی کو ایک چیلنج سمجھ کر قبول کر لو۔ اسے زندگی کا ایک ایڈونچر سمجھ لو۔ تم نے اندازہ لگایا ہو گا کتنی سنسنی ہے اس زندگی میں۔ کتنا دلچسپ ہے ملی چوہے کا کھیل۔۔۔ ہاں! یہ کھیل ہی تو ہے۔ رات سے اب تک اس کھیل میں کتنی سنسنی خیز موڑ آچکے ہیں۔ سی کسز کا سامنا۔۔۔ نیو اور ان کی غداری۔۔۔ اس وقت تو لگتا تھا جیسے ہماری زندگی کے آخری لمحات آن پہنچے ہیں۔ جیسے ہم مار رہے ہیں۔ لیکن پھر بازی ایک دم پلٹ گئی۔ تم نے خوفزدہ ہونے کے باوجود وہ کام کر دکھایا۔ یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ہماری ہوئی بازی جیتنے میں کتنا لطف ہے؟ اس کا اندازہ تم نے لگا ہو گا اور پھر میری ٹائم سیکورٹی والوں کی آمد اور اس سے پہلے لاچ کے کپتان قاسم کی بلیک۔۔۔ یہ سب کچھ کتنا عجیب سا لگتا ہے اور پھر یہ ایک نیا روپ! کتنی سنسنی ہے زندگی کے ان لمحوں میں۔“ شارق چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”جب میں جیل گیا اور پولیس اور منشیات فروشوں نے مجھے تنگ کرنا شروع کیا تو میں یہ سوچ کر اس لائن پر آ گیا کہ ان لوگوں کے اندر رہتے ہوئے ان کا خاتمہ کروں گا۔ شروع میں کچھ کیا بھی۔ لیکن ہمارا راستہ بدل گیا۔ میں غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہوتا چلا گیا۔ میرے ہاتھ خون میں رنگا ہوا اس میں میرے اپنے ارادے کو بھی دخل تھا۔ میرا دامن دھندلا ہو گیا۔ مجھے اس کا احساس

ہلکے بادل تھے۔ سورج غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ سورج جیسے جیسے نیچے ہو رہا تھا فضا میں سرخی سی پھیلتی جا رہی تھی۔۔۔ اور پھر ٹینہ کو یوں محسوس ہوا جیسے سمندر پر خون بکھر گیا ہو۔ سورج کا سرخ تھل افق پر پانی کی سطح سے شاید چند انچ اوپر تھا۔ ہر طرف سرخی پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی اور پھر سرخ تھل آہستہ آہستہ پانی میں اترنے لگا۔

سورج لگا ہوں سے اوجھل ہو چکا تھا لیکن سمندر کی سطح اور افق پر گہری سرخی اب بھی موجود تھی۔ ٹینہ اپنے آپ میں ایک عجیب سنسنی کی سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ اس نے غروب آفتاب کا یہ حسین منظر زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔

لاچ بہت ہلکی رفتار سے چل رہی تھی۔ سمندر اور افق پر پھیلی ہوئی سرخی بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی اور پھر سرخی کی جگہ سرمئی غبار نے لے لی جو آہستہ آہستہ تاریکی میں بدلنے لگا۔

ٹینہ دونوں ہاتھ عرشے کی ریٹنگ پر نکائے کھڑی تھی۔ اس کے چاروں طرف تاریک سمندر تھا۔ اچھلتی ہوئی لہروں کا شور اس تاریکی میں کچھ عجیب سا تاثر پیدا کر رہا تھا۔

دفترا ”ٹینہ کے ذہن میں ایک خیال ابھر آیا، اگر ان کی لاچ کو کوئی حادثہ پیش آ جائے؟ لاچ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائے تو کیا ہو گا؟ سمندر کی لہروں پر ان کی موت کتنی اذیت ناک ہو گی اور پھر وہ پھیلیوں کی خوراک بن جائیں گے۔

یہ خیال آتے ہی ٹینہ کانپ اٹھی۔ اس کے ذہن میں نیو کا چہرہ ابھر آیا۔ جس نے گولی سے بچنے کے لئے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی۔ کیسی اذیت ناک ہو گی اس کی موت؟

ٹینہ یہ سب سوچ رہی تھی کہ اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے اچھل پڑی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ شارق تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ شارق نے پوچھا۔

”سوچ رہی ہوں کہ اگر ہماری لاچ کو کوئی حادثہ پیش آ جائے تو ہمارا انجام کیا ہو گا؟“ ٹینہ

نے کہا۔

کو منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ایک نئی خوراک مل جائے گی اور کیا!“ شارق نے ہنسنے ہوئے

جواب دیا۔

”شاید ایسا ہی ہو۔“ شارق نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

”تم کچھ اداس لگ رہی ہو؟“ شارق نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”تو کیا تمہارے خیال میں مجھے قہقہے لگانے چاہئیں؟“ ٹینہ نے اسے گھورا۔ ”میری زندگی کے راستے کتنے بدل گئے ہیں۔“ اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ”میں کالج کی ایک

تھیں۔ لگتا تھا جیسے کسی بہت بڑی عمارت میں چراغاں کیا گیا ہو۔

”کیا ہم ساحل کے قریب پہنچ رہے ہیں؟“ اس نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”ساحل! نہیں تو۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”بلکہ ہمارے اور ساحل کے درمیان گزرنے والے
 ہر لمحہ کے ساتھ مزید اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔“

”لیکن وہ جھلملاتی ہوئی روشنیاں۔ لگتا ہے کسی عمارت پر چراغاں ہو رہا ہے۔“ ثینہ نے ایک
 طرف اشارہ کیا۔

”اوہ... وہ۔“ شارق مسکراتے ہوئے بولا۔ ”وہ ساحل پر کوئی عمارت نہیں۔ بحری جہاز ہے اور
 شاید مسافر بردار جہاز ہے۔“

”اوہ!“ ثینہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ بڑی دلچسپ نظروں سے ان روشنیوں کی طرف
 دیکھتی رہی جو لمحہ بہ لمحہ واضح ہوتی جا رہی تھیں۔ سمندر کی لہروں پر ہلکورے لیتی اور جھلملاتی ہوئی
 یہ روشنیاں بڑی پراسرار لگ رہی تھیں۔

لانچ خاصے فاصلے سے نکل گئی۔ ان کی لانچ کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ ثینہ دونوں ہاتھ
 ریٹک پر ٹکائے اس وقت تک ان جھلملاتی ہوئی روشنیوں کی طرف دیکھتی رہی جب تک وہ نظر
 آتی رہیں۔ پھر یکایک اسے احساس ہوا کہ وہ اکیلی کھڑی ہے۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ شارق
 وہاں نہیں تھا۔ ثینہ کو پتہ بھی نہیں چلا تھا کہ وہ کب وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کے منہ سے بے
 اختیار گہرا سانس نکل گیا اور وہ ایک بار پھر مڑ کر تاریک سمندر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی چاروں
 طرف گہری تاریکی تھی۔ اسے وقت کا اندازہ بھی نہیں تھا۔

”ثینہ بی بی!“ اپنے عقب میں نوکھا کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ ”کھانا تیار ہو گیا ہے۔
 سب لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

ثینہ گہرا سانس لیتی ہوئی کینن کی طرف مڑ گئی۔ نوکھا اس سے دو قدم آگے تھا۔ جب وہ
 کینن میں داخل ہوئی تو نبی بخش میز پر کھانا لگا چکا تھا۔ شارق اور ڈی کوسا میز کے گرد کرسیوں پر
 بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ قاسم بھی تھا۔ ثینہ اور نوکھا بھی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور انہوں
 نے کھانا شروع کر دیا۔

”کب پہنچیں گے ہم لوگ اس چٹان کے پاس؟“ ثینہ نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے
 پوچھا۔

”اگر ہم لانچ کو اسی رفتار سے چلاتے جس رفتار سے روانہ ہوئے تھے تو بہت پہلے منزل پر
 پہنچ چکے ہوتے۔ لیکن ہم نے لانچ کی رفتار بہت کم رکھی ہے۔ اس رفتار سے ہم صبح چار بجے کے

تھا۔ میں نے اپنے آپ کو روکنے کی کوشش کی مگر میرے قدم اس راستے پر اٹھتے چلے گئے۔
 آپ کو بے گناہ کہنے کا حق مجھ سے چھین گیا اور میں ایک باقاعدہ مجرم بن گیا۔ قاتل... منہ
 فروش، متعدد سنگین جرائم میں پولیس کو مطلوب۔“ وہ ایک بار پھر چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر
 ”تم میری ماں اور بہن سے مل چکی ہو۔ وہ میری ماں اور بہن نہیں لیکن میرے لئے سب
 وہی ہیں۔ وہ میری ان سرگرمیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ میں
 معزز شخص ہوں اور باعزت کاروبار کر رہا ہوں جس کے لئے مجھے اکثر کئی کئی روز تک گھر سے
 رہنا پڑتا ہے۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ میرے اندر کا آدمی ابھی زندہ ہے۔ اور میں اپنے
 کے اس آدمی کو مرنے نہیں دوں گا۔ تم جانتی ہو کہ کوئی بھی شخص پیدائشی مجرم نہیں ہوتا۔
 کے کردار کی تشکیل اس کے ارد گرد کا ماحول کرتا ہے۔ میں تمہارے سامنے ہوں، نوکھا تمہارے
 سامنے ہے، ٹیو کو بھی تم دیکھ چکی ہو۔ وہ کراچی یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ
 نے اپنی خوشی سے جرائم کی دنیا میں قدم رکھا ہو گا۔ نہیں ثینہ ایسا نہیں ہے۔ جیسا کہ میں
 بھی کہہ چکا ہوں کہ انسان کا کردار اس کے ارد گرد کا ماحول تشکیل دیتا ہے۔ غلطی کسی سے
 سکتی ہے۔ لیکن ہمارا معاشرہ کچھ عجیب سا ہے۔ غلطی کرنے والے کی اصلاح کرنے کے بجائے
 سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اسے مزید غلطیاں کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور پھر وہ شخص غلطیاں
 کرتا جو کچھ بھی کرتا ہے اپنی مرضی سے کرتا ہے اور اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہے۔ معاشرہ
 سے اسے نفرت ہو جاتی ہے وہ انتقام لینے پر تل جاتا ہے۔ ڈی کوسا تمہارے سامنے ہے۔ یہ
 شریف اور باعزت انسان نظر آتا ہے۔ لیکن اس کا اصل روپ بھی تم نے دیکھ لیا ہے۔ یہ
 کیوں کر رہا ہے؟ اگر تم اس کا دل ٹٹول کر دیکھو تو تمہیں ایک سنسنی خیز کہانی سننے کو ملے گی۔
 خود ہو... کیا تم اپنی مرضی سے آئی ہو؟ نہیں ثینہ؟ اپنی مرضی سے کوئی بھی شخص کیچڑ میں
 نہیں رکھتا... اور جب کوئی اس طاعون کی چکر میں پھنس جاتا ہے تو وہ باہر نہیں نکل سکتا۔ لاکھ
 پیر مارنے کے باوجود اسے حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں بھی
 حالات سے سمجھوتہ کر ہی لینا چاہئے۔“

”اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہارے ساتھ یہاں نہ ہوتی۔“ ثینہ نے جواب دیا۔ اس کے
 میں اب بھی اداسی تھی۔

شارق نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جیسے جیسے بات آگے بڑھے گی ثینہ
 اداسی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس لئے اس نے موضوع بدل دیا تھا۔

دفعاً ثینہ چونک سی گئی۔ سامنے بہت دور تاریکی میں کچھ روشنیاں جھلملاتی ہوئی نظر آ

لگ بھگ اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔" قاسم نے کہا۔

"تو کیا ہم آج رات بھر بھی سفر کرتے رہیں گے۔" ثمنہ نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی تھی۔

"لگتا ہے تم نے پہلے کبھی سمندری سفر نہیں کیا۔" قاسم نے کہا۔

"نہیں۔ یہ پہلا اتفاق ہے۔" ثمنہ نے جواب دیا۔

کھانے کے بعد ثمنہ اور شارق وغیرہ پھر عرشے پر آ گئے۔ وہ کچھ دیر تک رینگ کے سہارے کھڑے تاریک سمندر میں گھورتے رہے پھر عرشے پر بیٹھ گئے۔ یہاں کوئی کرسی وغیرہ نہیں تھی۔ وہ فرش پر ہی بیٹھے تھے۔ قاسم ایک بار پھر وہیل کیبن میں چلا گیا تھا اور اس کے دونوں آدی عمر اور نبی بخش مختلف کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔

شارق، ثمنہ اور نوکھا کی زندگی میں بحری سفر کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ شروع میں تو وہ خاصے پریشان ہوئے تھے لیکن اب کسی حد تک عادی ہو گئے تھے۔ ڈی کوشا البتہ کئی مرتبہ سمندری سفر کر چکا تھا۔ وہ حاجی عبداللہ کے گروہ کا آدی تھا اور مختلف اوقات میں بحری جہازوں اور لانچوں کے ذریعے مختلف ممالک جا چکا تھا۔ وہ ان تینوں کو اپنی بیٹی ہوئی مہمات کی داستانیں سنا رہا تھا اور وہ تینوں بڑی دلچسپی سے یہ سب کچھ سن رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے ڈی کوشا نے سگریٹ کا پیکٹ نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن پیکٹ جیب میں نہیں تھا۔

"میں سگریٹ کا پیکٹ شاید کیبن ہی میں بھول آیا ہوں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"سگریٹ لے آؤں تو داستان کا باقی حصہ سناتا ہوں۔"

وہ کیبن میں آگیا۔ اندر داخل ہو کر اس نے بتی جلائی اور اپنے بک پر رکھا ہوا سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس اٹھا کر باہر آگیا۔ وہ عرشے کی طرف واپس جانا ہی چاہتا تھا کہ کیبن کے دوسری طرف سرگوشیوں کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر تاریکی میں کوئی نظر نہیں آیا۔ سرگوشیاں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ ڈی کوشا کو آواز کی شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ عمر اور نبی بخش تھے جو بلوچی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔

ڈی کوشا تھوڑی بہت بلوچی زبان سمجھتا تھا ان دونوں کی سرگوشیاں گفتگو میں ثمنہ کا نام سن کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اسے کچھ شبہ سا ہوا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کیبن کے دوسری طرف رسوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ وہ کسی چوپائے کی طرح ہاتھوں اور گھٹنوں پر چلتا ہوا رسوں کے اس ڈھیر کے قریب آگیا۔ عمر اور نبی بخش رسوں کے اس ڈھیر کے دوسری طرف بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ڈی کوشا نے رسوں کے انبار کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ تاریکی میں ان کے

چہرے نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ دونوں بیڑیاں پی رہے تھے۔ ڈی کوشا فضا میں بیڑی کے پتے کی بو محسوس کر رہا تھا۔ وہ رینگتا ہوا کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ اب وہ ان کی باتیں صاف طور پر سن سکتا تھا۔

"اڑے! قاسم استاد نے بولا ہے کہ آج ہی رات ان تینوں کو مار کر سمندر میں پھینک دے گا اور لانچ کو واپس لے جائے گا۔" یہ نبی بخش کی آواز تھی۔ وہ مزید کہہ رہا تھا۔ "اور سنا تم نے استاد قاسم بولتا ہے کہ لوہے کے اس ڈبے میں پانچ سو کلو ہیروئن ہے۔ کروڑوں روپے کا مال ہے۔ استاد قاسم یہ ہیروئن بیچ دے گا تو اپنے تو دارے نیارے ہو جائے گا۔ استاد قاسم ہم دونوں کو بھی حصہ دے گا۔ جانتا ہے۔ میں اپنے پیسے کا کیا کروں گا؟"

"کیا کرو گے؟" عمر نے پوچھا۔

"اڑے! ہم بھی ایک لانچ خریدے گا۔ پھر تو ساری زندگی آرام سے گزر جائے گی۔" نبی بخش نے جواب دیا۔

"اڑے! تم بولا ان تینوں کو مار کر سمندر میں پھینک دے گا۔ مگر وہ تو چار ہیں۔ اس چھوکری کو بھول گئے کیا؟" عمر نے کہا۔

"چھوکری کو استاد قاسم اپنا پاس رکھے گا۔ اسے اپنے گھر والی بنائے گا۔ ایک بات ہے عمر۔" نبی بخش چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ "وہ چھوکری ہے زوردار چیز۔ میں استاد قاسم کو بولوں گا کہ وہ ہم کو دے دے۔ اس کا تو اپنی گھر والی بھی ہے نا۔۔۔ وہ چھوکری ہم کو مل جائے گا تو ہمارا گھر بھی آباد ہو جائے گا۔"

"اڑے! شکل دیکھا ہے اپنا۔" عمر نے کہا۔ "وہ چھوکری تو تم پر تھو کے گا بھی نہیں۔ کوئی اور بات سوچو نبی بخش وہ چھوکری تم کو نہیں ملے گی۔ لیکن یار ایک بات اپنا سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ لوگ تو چار ہیں اور ہم تین۔۔۔۔۔ ان لوگوں کو کیسا مار کر پھینکے گا؟"

"تم بھول گئے۔ اس بد معاش کا پستول تو استاد قاسم کے پاس ہے۔ جسے مار کر سمندر میں پھینک دیا تھا۔" نبی بخش نے جواب دیا۔ "استاد قاسم کا پروگرام یہ ہے کہ رات کو جب یہ لوگ سو جائے گا تو سب کو ایک ایک گولی مار کر لاشیں سمندر میں پھینک دے گا۔ صبح ہونے سے پہلے پچھلیاں ان کا گوشت کھا جائیں گی۔"

"اگر ان کے پاس بھی پستول مستول ہوا تو؟" عمر کے لہجے میں تشویش تھی۔

"اڑے! یہی تو مزے کی بات ہے۔" نبی بخش نے کہا۔ "ان کے پاس پستول مستول نہیں ہے۔ اس لئے تو استاد قاسم نے یہ پروگرام بنایا ہے۔"

کیبن کی طرف جا کر نگاہوں سے اوچھل نہ ہو گئے۔ ان کے عائب ہوتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز تیز قدموں سے اس طرف چلنے لگا جہاں شارق وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

”میں تو سمجھا تھا کہ تم کیبن میں جا کر سو گئے۔ کہاں رہ گئے تھے؟“ شارق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ پستول کہاں ہے جو تم نے نیو سے چھینا تھا؟“ ڈی کوشا نے شارق کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔

”کیوں....؟ خود کشی کرنے کا ارادہ ہے کیا؟“ شارق نے اسے گھورا۔

”اس وقت ہم بہت سنگین قسم کی صورتحال سے دوچار ہیں شارق۔“ ڈی کوشا کا لہجہ سرگوشیانہ تھا۔

”کیا ہوا.... قیامت آنے والی ہے کیا؟“ شارق نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”میں سمجھ لو۔“ ڈی کوشا نے کہا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”قاسم اور اس کے ساتھیوں نے آج رات ہمیں قتل کر کے سمندر میں پھینک دینے کا منصوبہ بنایا ہے۔ قاسم ہمیں ختم کر کے اس بیرونی پر قبضہ کرنا چاہتا ہے جس کے لئے ہم یہ ساری مصیبتیں جھیل رہے ہیں۔ اسی لئے ان نے تم سے اس پستول کا پوچھا تھا۔“

”اوہ!“ شارق اچھل پڑا۔ ”پستول میرے پاس ہے لیکن تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتہ چلا۔“

”میں کیبن سے سگریٹ کا پیکٹ لے کر باہر نکلا ہی تھا کہ کیبن کے پچھلی طرف سے عمر اور لائسنس کی باتوں کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ بلوچی میں باتیں کر رہے تھے اور میں یہ زبان موڑی بہت سمجھتا ہوں۔ میں رسوں کے ڈھیر کے پیچھے چھپ کر ان کی باتیں سننے لگا۔ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ آج رات ایک اور تین بجے کی درمیان جب ہم سو رہے ہوں تو ہمیں گولیاں مار کر میں سمندر میں پھینک دی جائیں اور لالچ کا رخ موڑ کر واپس چلے جائیں۔ قتل کا منصوبہ ہم بول کے لئے ہے۔ ٹینے کے لئے قاسم نے ایک اور پروگرام بنا رکھا ہے۔“

”وہ کیا؟“ ٹینے نے پوچھا۔ ڈی کوشا کی باتیں سن کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

”قاسم تمہیں اپنی گھر والی بنانے کا خواب دیکھ رہا ہے جبکہ نبی بخش بھی تمہارا امیدوار ہے۔“ ڈی کوشا نے کہا۔

”قاسم کا گلا تو میں اپنے ہاتھ سے گھونٹوں گی۔“ ٹینے نے دانت کچکپاتے ہوئے کہا۔ ”دن

”کس وقت؟“ عمر نے پوچھا۔

”رات کو ایک سے تین بجے کی درمیان۔ جب بھی موقع ملا۔“ نبی بخش نے جواب دیا۔

”دگر وہ موٹا تو رات کو بھی سوتا ہی نہیں۔ کیا نام بولتا ہے اس کا۔ ہاں یاد آ گیا۔ نوکلا.... اس کا کیا کرے گا؟“ عمر نے کہا۔

”اس کو بھی دیکھ لیں گے یار۔ تم فکر مت کرو۔“ نبی بخش بولا۔

اس سے پہلے کہ عمر کچھ کتا دھیل کیبن کی طرف سے قاسم کی آواز سنائی دی۔ وہ نبی بخش کو آوازیں دے رہا تھا۔

”چلو.... اٹھو.... استاد بلا رہا ہے۔“ نبی بخش نے کہا۔

وہ دونوں اٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے سلگتی ہوئی بیڑی سمندر کی طرف اچھال دی اور وہ دونوں دھیل کیبن کی طرف چلے گئے۔

ڈی کوشا رسوں کے ڈھیر کے پیچھے دکا ہوا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ قاسم اس قسم کا کوئی منصوبہ بنا سکتا ہے۔ وہ زور زور سے سر جھٹکنے لگا۔ پھر اسے یاد آ گیا کہ وہ قاسم ہی تھا جس نے میری ٹائم سیکیورٹی کی لالچ دیکھ کر شارق کو بلیک میل کیا تھا اور رازداری کے عوض پانچ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا۔ جبکہ معاملہ ایک لاکھ پر طے ہو گیا تھا قاسم بہت گھاگہ آدمی تھا۔ اسے شروع ہی سے ان پر شبہ تھا اور موقع ملنے ہی اس نے فائدہ اٹھایا تھا لیکن اب پھر اس کی نیت بدل گئی تھی۔ پہلے اس نے ایک لاکھ پر معاملہ طے کر لیا تھا لیکن اب وہ پورے مال پر قبضہ کرنے کی سوچ رہا تھا اور اس کے لئے اس نے بہت ہی خوفناک منصوبہ بنایا تھا۔

جب وہ لوگ روانگی کی تیاری کر رہے تھے تو ڈی کوشا نے شارق کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کسی قسم کا اسلحہ بھی اپنے ساتھ لے چلیں لیکن شارق نے سختی سے اس تجویز کی مخالفت کی تھی۔ کیونکہ لالچ پر ان کی حیثیت سائنس دانوں کی ہوتی اور اسلحہ کی موجودگی کسی قسم کے شبہ سے باعث بن سکتی تھی۔

دفعۃً ڈی کوشا کو یاد آ گیا کہ نیو والے پستول پر شارق نے قبضہ کر لیا تھا اور قاسم کو شابہ اس کا علم نہیں تھا۔ وہ یقیناً یہ سمجھا ہو گا کہ پستول صرف مانڈا کے پاس تھا جسے اس نے خود چھپ کر مانڈا کو گولی مار دی تھی۔ پستول قاسم کے قبضے میں تھا اور اسے یقیناً یہ علم نہیں تھا کہ ان کے پاس بھی پستول ہے۔

ڈی کوشا اس وقت تک رسوں کے ڈھیر کے پیچھے دکا رہا جب تک عمر اور نبی بخش دھیل

یہ میری گھر والی ہے۔ اس وقت بھی میرا خون کھول اٹھا تھا۔ لیکن صورت حال کی نزاکت کے نظر میں خاموش رہی تھی اس جیٹی کو تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ نوکھانے کہا۔ ”جب تک ہم زندہ ہیں کوئی تر طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔“

”قاسم کے پاس وہ پستول ہے جو اس نے ماٹرا سے چھینا تھا۔“ ڈی کوشا نے کہا۔ ”اس پاس چھریاں یا خنجر وغیرہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن انہیں یہ پتہ نہیں ہے کہ تمہارے پاس بھی موجود ہے۔ آج رات۔۔۔“

”فکر مت کرو۔“ شارق نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”مگر ہمیں اس منصوبے کا پتہ نہ ہو شاید لاعلمی میں مارے جاتے لیکن اب جبکہ ہم قاسم کے اس گھناؤنے پروگرام سے آگاہ ہو چکے تو گویا ان کی اپنی زندگیاں خطرے میں پڑ گئی ہیں۔“

ڈی کوشا نے پکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ ایک کش لگا کر اس نے دھواں اور کچھ کتا ہی چاہتا تھا کہ وہیل کیبن کی طرف سے کسی کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ وہ تھا جو ان کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

”اب ہمیں یا ہماری لالچ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ وہ شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں تھوڑی دیر سولینا چاہتا ہوں۔ تم لوگ بھی اگر چاہو تو سو جاؤ۔ صبح چار بجے ہم اپنی منزل پر جائیں گے۔“

”ہاں۔ ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں کہ تھوڑی دیر سولیا جائے۔“ شارق نے جواب دیا۔

لیکن ابھی تو شاید دس بجے نہیں گئے۔ کچھ دیر اور یہاں بیٹھیں گے۔ پھر سو جائیں گے اپنے میں جا کر۔ تم جاؤ۔۔۔ آرام کرو۔“

قاسم انہیں شب بھر کتا ہوا دوبارہ وہیل کیبن کی طرف چلا گیا۔ اس سے ذرا آگے چلا جہاں ڈیزل کے ڈرموں کے قریب عمریا نبی بخش نے بوریاں وغیرہ ڈال کر سونے کی جگہ بنا تھی۔

”نوکھانے۔“ شارق نوکھانے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تم شروع ہی سے قاسم کے ساتھ رہے ہو لالچ کے بارے میں کچھ سمجھتے ہو یا نہیں۔“

”راستوں کو سمجھتا تو اپنی سمجھ میں نہیں آیا لیکن لالچ کو بند کرنا۔ اشارت کرنا۔ لنگر گرا

اٹھانا اور پھینکے کو قابو کرنا سمجھ لیا ہے۔“

”یہ تو ایسے ہی ہوا جیسے کسی اناڑی کو گاڑی کے کلچ بریک اور گیر وغیرہ کے بارے میں

طور پر بتا کر اسے کہہ دیا جائے کہ گاڑی کو کسی پر ہجوم سڑک پر لے جائے۔“ شارق نے کہا۔

”نہیں شارق باؤ۔“ نوکھانے کہا۔ ”ایسی ڈنٹ نہیں ہونے دوں گا۔“

”تو پھر کیا پروگرام ہے تم لوگوں کا؟“ شارق نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔

”پروگرام یہی ہے کہ ہم اپنے اپنے بستروں پر لیٹے رہیں گے لیکن اپنی آنکھیں کھلی رکھیں گے۔ یہ لوگ جیسے ہی کچھ کرنا چاہیں گے جوابی کارروائی کریں گے۔“

”میرا خیال ہے نوکھانے اپنے بستر پر نہیں جائے گا۔“ شارق نے کہا۔ ”یہ عرشے پر عمریا نبی بخش کے ساتھ رہے گا۔ اس طرح کم از کم ایک آدمی کو تو یہ سنبھال لے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ نوکھانے کہا۔ ”ایک کیا۔ اگر وہ دونوں اکٹھے ہوئے تو میں ان دونوں کو سنبھال لوں گا۔“

”اور ہم تینوں۔“ شارق نے ٹینے اور ڈی کوشا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آج رات ایک ہی کیبن میں گزاریں گے۔ اس طرح جو بھی کیبن میں آئے گا اس سے ٹنٹے میں آسانی رہے گی۔“

وہ لوگ پروگرام طے کرنے کے بعد موضوع بدل کر باتیں کرتے رہے۔ نوکھانے اچانک ہی اونچی آواز میں مایہا گانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی پات دار آواز تاریکی میں سمندر کی لہروں پر دور دور تک پھیل رہی تھی۔

گیارہ بجے ٹینے، شارق اور ڈی کوشا اٹھ کر کیبن میں آ گئے۔ نوکھانے بیٹھا اونچی آواز میں مایہا گاتا رہا۔

کیبن میں چار بجے تھے۔ دو نیچے اوپر ایک دیوار کے ساتھ اور دو دوسری دیوار کے ساتھ۔ اس طرح کیبن میں چار افراد کے سونے کی جگہ تھی۔ ٹینے اور شارق ایک دیوار والے بنگس پر لیٹ گئے۔ ٹینے اوپر والے بنگ پر تھی اور شارق نیچے۔ ڈی کوشا ساتھ والی دیوار کے نیچے والے بنگ پر لیٹ گیا۔ وہ دونوں اپنے اپنے بنگ پر اس طرح لیٹے تھے کہ سر ایک دوسرے کے قریب تھے انہوں نے کیبن کی بتی نہیں جلائی تھی۔ وہ دونوں تاریکی میں سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔

”ضروری نہیں کہ یہ لوگ ایک اور تین بجے کے درمیان کوئی کارروائی کریں۔ یہ اپنے منصوبے پر اس سے پہلے بھی عمل کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ہر لمحہ محتاط رہنا ہو گا۔“ شارق نے کہا اور لباس میں چھپا ہوا پستول نکال کر اپنے سامنے اس طرز رکھ لیا کہ اسے کسی بھی وقت ہاتھ میں لیا جاسکتا تھا۔

کوشا۔ لیکن خوف کے باعث وہ اسی کے ساتھ چپکی جا رہی تھی۔

قدموں کی آواز دروازے کے قریب آکر رک گئی۔ شارق نے پستول ہاتھ میں لے لیا تھا اور وہ دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں خاموشی رہی اور قدموں کی آواز دوبارہ سنائی دینے لگی۔ وہ جو کوئی بھی تھا واپس جا رہا تھا چند سیکنڈ بعد شارق نے سرگوشیاً لہجے میں کہا۔

”میرا خیال ہے ان میں سے کوئی یہ دیکھنے آیا تھا کہ ہم لوگ جاگ تو نہیں رہے۔“

”مجھے بھی یہی لگتا ہے۔“ ڈی کوشا نے سرگوشی کی۔ ”مجھے یقین ہے کہ اب وہ لوگ کوئی کارروائی کرنے والے ہوں گے۔“

ان آوازوں سے ٹہنہ سمجھ گئی تھی کہ اس کے ساتھ ڈی کوشا ہی کھڑا تھا اور شارق اس سے آگے دروازے کی طرف تھا۔ ٹہنہ سرک کر کچھ پیچھے ہٹ گئی مگر ڈی کوشا بھی اس سے چپکا جا رہا تھا۔

تقریباً تین منٹ گزر گئے۔ باہر قدموں کی آواز ایک بار پھر سنائی دینے لگی۔

”ہوشیار!“ شارق نے سرگوشی کی۔

ٹہنہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ قدموں کی آواز قریب آ رہی تھی اور بالاخر دروازے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ ٹہنہ غیر ارادی طور پر ڈی کوشا کے ساتھ چپک گئی۔

چند سیکنڈ گزر گئے اور پھر یوں لگا جیسے باہر سے دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستہ آہستہ گھمایا جا رہا ہو۔ ٹہنہ کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر حملہ آور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو کیا ہو گا۔

دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ شارق سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پستول والا ہاتھ اوپر اٹھالیا تھا۔ دروازہ مزید کھلتا چلا گیا اور پھر دفعتاً تاریکی میں ایک شعلہ چکا اس کے ساتھ ہی فائر کی آواز گونجی۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس نے دروازے کے باہر ہی سے فائر کیا تھا۔ لیکن فائر کے جواب میں کوئی چیخ نہ سن کر اس نے دروازہ جھٹکے سے کھول دیا اور دو قدم آگے بڑھ آیا۔

شارق اس موقع کا منتظر تھا۔ باہر صرف وہیل کیبن کی جی جی رہی تھی جس کی مدھم روشنی یہاں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ دروازے میں داخل ہونے والے کا چہرہ اگرچہ واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اسے شناخت کرنے میں شارق کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ قاسم تھا اس نے پستول والا ہاتھ آگے نکال رکھا تھا۔

شارق نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور پستول سے قاسم کے ہاتھ پر زور دار ضرب لگائی۔ قاسم کے منہ سے کراہ سی نکل گئی۔ اس نے ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی اس مرتبہ سامنے دیوار پر اوپر والے بک پر

وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور ٹہنہ اوپر والے بک پر لیٹی اس تازہ تر صورتحال کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ موت ان کے ارد گرد منڈلا رہی تھی اور اس ناک بے تھی کہ یہ لوگ پلک جھپکیں تو انہیں جھپٹ لے۔ لیکن مرنے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ سب موت سے بچنے آزمائی کے منصوبے بنا رہے تھے۔

ٹہنہ سوچ رہی تھی کہ اگر انہیں اس سازش کا پتہ نہ چلتا تو وہ بڑی آسانی سے اس کا شکار جاتے۔ شارق، نوکھا اور ڈی کوشا کو قتل کر دیا جاتا اور ٹہنہ قاسم کے قابو میں آ جاتی۔ لیکن خلاف اس سازش سے آگاہ ہو کر وہ لوگ ہوشیار ہو چکے تھے۔

اس وقت غالباً بارہ بج چکے تھے۔ کیبن میں تاریکی اور سناٹا تھا۔ یکایک ٹہنہ کو خیال آیا کہ شارق اور ڈی کوشا سو تو نہیں گئے۔ کیونکہ اب ان کی سرگوشیوں کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ اس نے اپنے بک سے ذرا سامنے جھک کر ہلکی سی سرگوشی کی۔

”شارق!“

”ہاں۔ کیا بات ہے؟“ شارق کا جواب بھی سرگوشی میں ملا۔

”کچھ نہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ تم لوگ سو تو نہیں گئے۔“ ٹہنہ نے کہا۔

”نہیں۔ ہم لوگ جاگ رہے ہیں۔“ اس مرتبہ ڈی کوشا نے جواب دیا۔

اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ شارق اپنے بک سے اٹھ کر دبے قدموں چلتا ہوا کیبن دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ عرشے کی طراف سے اب نبی بخش یا عمر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ بلوچی میں کوئی گیت گا رہا تھا لیکن آ زیادہ بلند نہیں تھی۔

”ابھی تک تو خیریت ہے۔“ شارق نے دروازہ بند کرتے ہوئے سرگوشی کی اور اپنے بک

لیٹ گیا۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر وقت کی رفتار کچھ ست ہو جاتی ہے ٹہنہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے وقت بالکل ختم گیا ہو۔

کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ کتنا وقت گزرا ہو گا لیکن دفعتاً باہر قدموں کی آوازیں تینوں چونک گئے۔ پھر پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق وہ تینوں بڑی پھرتی سے اپنے بک سے اتر کر دروازے کے ساتھ والی دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑے ہو گئے۔ اب اگر کھلتا تو وہ دروازے کی آڑ میں ہوتے۔

ٹہنہ کسی کے ساتھ چپک کر کھڑی تھی۔ اب اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ شارق تھا۔

گئی۔ شارق نے بھی گولی چلا دی۔ اس کی گولی دوسری دیوار میں لگی تھی۔

اسی لمحے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ قاسم تھا جو دوڑتا ہوا انجن والے کیبن کی آڑ میں چلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ساتھیوں سے چیخ کر کچھ کہا تھا۔ شارق بھی کیبن سے باہر آگیا اور اس نے زمین پر لیٹ کر آواز کی طرف فار کر دیا۔

دوسری طرف نوکھا لانچ کے عرشے پر بچھی ہوئی بوری پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ بظاہر سو رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر عمر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ وہ جب کش لگاتا تو روشنی کا ننھا سا نقطہ چمک اٹھتا۔

پھر دفعتاً "نوکھا چونک گیا۔ عمر نے بیڑی عرشے کی رینگ کی طرف اچھال دی تھی اور اب وہ کسی چوہے کی طرح ہاتھوں اور گھٹنوں پر رینگتا ہوا نوکھا کی طرف آ رہا تھا۔ نوکھا آنکھوں میں جھری پیدا کئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا وہ اس سے دو قدم کے فاصلے پر رک گیا اور پھر قیض کے اندر ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی۔ وہ چاقو تھا جس کا بلیڈ وہیل کیبن سے آنے والی مدھم سی روشنی میں چمک رہا تھا۔ نوکھا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور وہ صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

خاموش فضا اچانک ہی فار کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی عمر سانپ کی طرح بڑی تیزی سے نوکھا کی طرف لپکا۔ اس نے چاقو والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور نوکھا کے سینے پر وار کر دیا۔ نوکھا اچانک ہی حرکت میں آگیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے عمر کی کلائی تھام لی اور اسے زور وار جھٹکا دیا۔

عمر کے لئے یہ صورت حال بالکل غیر متوقع تھی۔ اس کا خیال تھا کہ نوکھا سویا ہوا تھا اور وہ بڑے اطمینان سے چاقو اس کے دل میں اتار دے گا۔ لیکن یہاں اسے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ نوکھا نے اس کی کلائی پکڑ کر زور وار جھٹکا دیا؟ چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جاگرا۔ نوکھا نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس نے عمر کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ عمر کچھ دیر پٹتا رہا پھر وہ بھی سنبھل گیا۔

عمر نوکھا کے مقابلے میں کم عمر اور دھلا پتلا تھا اور نوکھا سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہو رہا تھا۔ دوائی کا بھی ماہر تھا۔ اس نے سنبھلنے ہی نوکھا پر حملے شروع کر دیئے۔ اس کی ایک ٹھوکر نوکھا کے دائیں پنڈلی پر لگی۔ نوکھا کراہ اٹھا۔ وہ ذرا نیچے جھکا تو عمر نے سر کی زور وار ٹکر اس کے سر ماری۔ نوکھا کراہتا ہوا پیچھے گرا۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ عمر نے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

نوکھا پٹتا رہا۔ وہ عمر کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن عمر اچھل اچھل کر اس پر حملے کر رہا تھا اور بالاخر اس کی ٹانگ نوکھا کے ہاتھ میں آگئی۔ نوکھا نے ٹانگ کو زور وار جھٹکا دیا۔ عمر ایک ٹانگ پر گھوم گیا اور پھر لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ نوکھا نے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اسے چھاپ لیا۔

کیبن کی طرف سے یکے بعد دیگرے دو اور گولیوں کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی قاسم کے پیچھے کی آواز بھی سنائی دی تھی اس نے غالباً اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا تھا۔ نوکھا کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دوسری طرف بھی معرکہ شروع ہو چکا تھا۔

نوکھا نے عمر کو اس طرح دلوچ رکھا تھا کہ وہ حرکت کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا تھا۔ وہ نبی بخش کو مدد کے لئے پکار رہا تھا۔

نبی بخش وہیل کیبن میں تھا۔ وہ وہیل چھوڑ کر کیبن سے نکلا اور عمر اور نوکھا کی طرف دوڑا۔ اس کے ہاتھ میں بھی چاقو تھا جس کا پھل بلب کی مدھم روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس نے آتے ہی نوکھا پر حملہ کر دیا۔ نوکھا بڑی پھرتی سے ایک طرف جھک گیا۔ نبی بخش اپنی ہی جھونک میں آگے نکل گیا۔ نوکھا نے عمر کی گردن کو ایک زور وار جھٹکا دے کر ایک طرف پھینک دیا اور نبی بخش کی طرف لپکا جو چاقو والا ہاتھ آگے کو نکالے اس پر حملے کے لئے پر تول رہا تھا۔

نبی بخش نے جیسے ہی حملہ کیا نوکھا نہ صرف پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا بلکہ اس نے اپنی ٹانگ بھی آگے نکل دی تھی۔ اس کی ٹانگ نبی بخش کی ٹانگوں میں پھنس گئی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور پھر اس کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکل گئی۔ نوکھا نے تیزی سے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ عرشے پر تڑپ رہا تھا اور اس کا اپنا ہی چاقو دستے تک اس کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر پیوست تھا۔ وہ اس انداز میں گرا تھا کہ اس کا چاقو اپنے ہی سینے میں پیوست ہو گیا تھا۔ سینے سے بننے والا خون فرش پر پھیل رہا تھا۔

اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر عمر کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے عرشے پر پڑا ہوا اپنا چاقو اٹھایا اور چیخا ہوا نوکھا پر حملہ آور ہوا۔ نوکھا غافل نہیں تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے عمر کی ہلائی پکڑ لی اور دونوں میں چاقو کی لئے کشمکش ہونے لگی۔ دفعتاً "نوکھا کا پیر فرش پر پھسلا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل گرا۔ وہ سنبھلتا ہی چاہتا تھا کہ عمر نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس مرتبہ بھی نوکھا اگر اس کی کلائی نہ پکڑ لیتا تو چاقو اس کے سینے میں پیوست ہو جاتا۔

عمر نوکھا کے سینے پر سوار تھا۔ چاقو کی نوک نوکھا کے گلے کی طرف تھی۔ نوکھا نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی تھام رکھی تھی اور وہ کلائی مروڑتے ہوئے چاقو کا رخ بدلنے کی کوشش کر

رہا تھا۔ چاقو کی نوک کبھی اس کی شہ رگ کے قریب آ جاتی اور کبھی وہ اسے ہٹانے میں کامیاب ہو جاتا۔

عمر دہلا پتلا ہونے کے باوجود بے پناہ طاقت کا مالک تھا۔ اور اس وقت تو اس کی ساری طاقت بازوؤں میں سمٹ آئی تھی۔ وہ یہی کوشش کر رہا تھا کہ چاقو نوکھا کے حلق میں پیوست ہو جائے مگر نوکھا بھی بڑی مہارت سے اپنا دفاع کر رہا تھا۔

دقتاً نوکھا کے ذہن میں ایک اور ترکیب آئی۔ اس نے عمر کو دونوں پیروں سے اوپر اٹھانا شروع کر دیا۔ اس نے دونوں پیر عمر کے پیٹ پر جما دیئے اور اسے بتدریج اوپر اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ عمر اب اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش میں تھا لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ نوکھانے اسے پوری طرح اوپر اٹھا دیا اور ایک زور دار جھٹکا دے کر اپنے پیچھے کی طرف اچھال دیا۔

عمر کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی بھیانک تھی۔ وہ نوکھا کے سر کے اوپر سے الٹی قلابازی کھاتا ہوا رینگ کے اندر سے نکل کر سمندر میں جا گرا تھا۔

نوکھا پھرتی سے اٹھ گیا۔ عمر کا چاقو عرشے کے کنارے پر پڑا تھا۔ اس نے لپک کر چاقو اٹھالیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا لانچ ہلکی رفتار سے ایک طرف جا رہی تھی۔ وہیل کیبن میں کوئی نہیں تھا۔ لیکن انجن والے کیبن کی آڑ میں اسے قاسم نظر آگیا جو وقفے وقفے سے فائرنگ کر رہا تھا۔ دوسری طرف سے شارک بھی فائرنگ کا جواب دے رہا تھا۔ فائرنگ کی آواز سے اس نے شارک کی پوزیشن کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ رسوں کے ڈھیر کے پیچھے پوزیشن لئے ہوئے تھا۔ ٹینہ اور ڈی کوسٹا نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید وہ کیبن میں پناہ لئے ہوئے تھے۔

نوکھا چند لمحے ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر چاقو سنبھالے دے قدموں بائیں طرف چلنے لگا۔ عرشے پر ایک لمبا چکر کاٹ کر وہ اس طرف نکل آیا جہاں باورچی خانے کی جگہ بنی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ انجن کا کیبن تھا۔ قاسم اس کیبن کے دوسری طرف سے شارک پر فائرنگ کر رہا تھا۔

نوکھا چاقو سنبھالے دے قدموں کیبن کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ بالآخر وہ قاسم کے پیچھے پہنچ گیا۔ قاسم اور اس کے درمیان صرف دو فٹ کا فاصلہ تھا نوکھا نے مزید ایک قدم آگے بڑھ کر چاقو کی نوک قاسم کی پشت سے لگا دی۔

”بس! اب تمہارا کھیل ختم ہو گیا قاسم۔ پستول پھینک دو۔“ نوکھا کے حلق سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی۔

نتیجہ نوکھا کی توقع کے برعکس نکلا۔ اس کا خیال تھا کہ قاسم پستول پھینک کر شرافت سے ہاتھ اٹھالے گا لیکن وہ بڑی تیزی سے نیچے جھکتے ہوئے گھوم گیا۔ اس کے پستول کا رخ نوکھا کے

سننے کی طرف تھا۔ اس نے ٹرائیگر دبا دیا۔ لیکن کوئی دھماکہ نہیں ہوا۔ پستول سے صرف اسٹیک کی آواز نکل کر رہ گئی۔ میگزین خالی ہو چکا تھا۔ اس پستول کی ساری گولیاں وہ شارک سے مقابلے میں ضائع کر چکا تھا۔

نوکھا کے حلق سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ وہ قاسم کے سامنے چاقو لہراتے ہوئے بولا۔
”اب کہاں جاؤ گے بچو! تمہاری گولیاں تو ختم ہو گئیں۔ اب میرا کمال دیکھو۔“
قاسم کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ چند لمحے خوفزدہ نگاہوں سے نوکھا کی طرف دیکھتا رہا پھر نبی نش اور عمر کو آوازیں دینے لگا۔

”وہ لوگ اب نہیں آئیں گے۔“ نوکھا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا ایک آدمی تو بچے ہی چاقو سے موت کے گھاٹ اتر گیا۔ اس کی لاش عرشے پر پڑی ہے اور دوسرا سمندر میں گر گیا۔ اسے بھی اب تک مچھلیاں کھا چکی ہوں گی۔ اب تمہاری باری ہے۔ تم ہمارے ہاتھ سے مرنا نہ کرو گے یا مچھلیوں کے خوراک بننا چاہو گے؟“

قاسم کی چہرے پر خوف کے سائے گہرے ہونے لگے۔ وہ اٹلے قدموں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ پھر اس نے اچانک ہی ہاتھ میں پکڑا ہوا خالی پستول نوکھا پر دے مارا۔ اس کی یہ حرکت نوکھا کے لئے غیر متوقع تھی۔ اس نے بچنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ پستول اس کے سینے لگا۔ ضرب خاصی زور دار تھی نوکھا کراہتا ہوا دوہرا ہو گیا۔ قاسم نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کر نوکھا کے چاقو والے ہاتھ پر ٹھوکر مار دی۔ چاقو نوکھا کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔

نوکھا سیدھا ہونا چاہتا تھا کہ قاسم نے اس کے سینے پر سر سے زور دار ٹکر ماری۔ نوکھا ایک ہلکا سا جھٹکا دے کر دوبارہ دوہرا ہو گیا۔ قاسم نے اس کے منہ پر اس طرح ٹھوکر ماری جیسے فٹ بال کو کک مارا جاتی ہے۔ نوکھا پھراٹ گیا۔ قاسم نے اس کے جسم پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ لیکن پھر ماکو بھی سنبھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

وہ اٹھ کر قاسم سے لپٹ گیا۔ قاسم کو سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ کچھ نکل اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا مگر نوکھا کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ قاسم نے اس کے بازو پر دانت گاڑ دیئے۔ اس کا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ نوکھا بلبلاتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ قاسم نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور ایک طرف دوڑ لگا۔ لیکن وہ زیادہ دور نہیں جاسکا تھا۔

شارک اچانک ہی تاریکی سے نکل کر سامنے آگیا تھا۔ قاسم ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اس نے

چھ مزار دیکھا۔ اس طرف سے نوکھانے تلے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ قاسم خوفزدہ اندر میں کیمین وال کی طرف بڑھنے لگا لیکن اس کے قدم ایک بار پھر رک گئے۔ اس طرف ڈی کو کھڑا تھا۔ اس کے بائیں طرف چند فٹ کے فاصلے پر شینہ کھڑی تھی۔

لاچ شتر بے مہار کی طرح سمندر کی لہروں پر اچھلتی ہوئی جا رہی تھی۔ قاسم نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ چاروں طرف سے گھر چکا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے موت ٹانجتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ ناکام ہو گیا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی مارے جا چکے تھے اور ان دشمنوں میں گھر گیا تھا جنہیں اس نے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

قاسم اس کھیل کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ خود اسمگلر نہیں تھا لیکن اس کی لاچ کئی م اسمگلروں کے استعمال میں رہی تھی۔ اور اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ یہ اسمگلر اپنے دشمن کی صورت میں بھی زندہ نہیں چھوڑتے۔ انسانی زندگی ان کے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ صرف دولت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور پھر یہاں معاملہ لاکھ دو لاکھ کا نہیں کروڑوں کا تھا۔ کے نچلے حصے میں جو آہنی کنٹینر بندھا ہوا تھا اس میں پانچ سو کلو ہیروئن تھی اور وہ اچھی طرح تھا کہ عالمی منڈی میں اس ہیروئن کی قیمت کروڑوں ڈالر تھی۔

اس ہیروئن پر قبضہ کرنے کے لئے پہلے خود ان لوگوں میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ ٹیو اور اس کے ساتھی مانڈا نے ان لوگوں کو قتل کر کے ہیروئن پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر کامیاب نہ ہوا تھا۔ اس معرکے میں قاسم نے شارق کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ پارٹی کا لیڈر شارق اور قاسم سمجھ گیا تھا کہ ٹیو اور مانڈا کرائے کے آدمی تھے جن کی نیٹوں میں فٹور آگیا تھا۔ لیکن لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ مانڈا تو قاسم ہی کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور ٹیو۔ اپنی جان بچانے کے لئے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی اور اس طرح مچھلیوں کی خوراک بن گیا تھا۔

قاسم کی دل میں دراصل شروع ہی سے لاچ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لاچ کی دو وجوہات تھیں۔ کروڑوں ڈالر مالیت کی ہیروئن اور اس سے بڑھ کر حسین و جمیل شینہ۔ پینٹ شرٹ میں شینہ حسن و شباب اس کے دل پر قیامت ڈھا رہا تھا۔ قاسم نے ان لوگوں کے بارے میں یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ لوگ اس کاروبار میں نئے تھے۔ خصوصاً شینہ کے بارے میں تو اسے یقین تھا کہ اسمگلروں کے کسی گروہ کے ساتھ پہلی مرتبہ کسی ایسے ٹور پر جا رہی تھی۔ وہ ڈری ڈری اور سہمی سی تھی اور قاسم نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ راستے میں وہ شینہ ہی کے ذریعے کوئی سازش کرے گا۔ نجانے اسے یہ یقین کیوں ہو گیا تھا کہ وہ شینہ کو پھانسنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اگر کوئی اندیشہ تھا تو ٹیو اور مانڈا کی طرف سے۔ وہ دونوں ہی چھٹے ہوئے اور پیشہ ور لگتے تھے۔ قاسم کے ذہن میں بھی کوئی منصوبہ واضح نہیں تھا۔ لیکن پھر ٹیو والا واقعہ پیش آ گیا۔ ان دونوں کے خاتمے کے بعد میری ٹائم سیکورٹی کی لاچ کو آتے دیکھ کر قاسم نے شارق کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی اور ایک لاکھ میں معاملہ طے کر لیا۔ حالانکہ بلیک میلنگ اس کا مقصد نہیں تھا۔ وہ لاکھ دو لاکھ پر اکتفا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی نظرس تو پورے مل اور شینہ پر تھیں۔ لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی اس حرکت نے شارق کو ہوشیار کر دیا تھا۔

مانڈا کا پستول قاسم کے قبضے میں آ گیا تھا۔ وہ یہ بھی اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ ٹیو کا پستول شارق کے پاس تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ٹیو نے اپنی جان بچانے کے لئے بدحواسی میں سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی اور اس کا پستول بھی اس کے پاس تھا۔

قاسم نے شینہ کو درغلانے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ اس طرح قتل عمل نہیں ہو سکا تھا کہ شینہ ہر وقت شارق کے ساتھ چپکی رہتی تھی۔ وہ اس سے الگ ہوتی تو قاسم کوئی کوشش کرتا مگر اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ پھر پستول ہاتھ آ جانے کے بعد اس نے دوسرا منصوبہ بنایا اس نے عمر اور نبی بخش کو اپنی سازش کے بارے میں بتا دیا۔

نوکھلا عام طور پر عرشے پر ہی رہتا تھا۔ اس نے عمر اور نبی بخش کو سمجھا دیا کہ جیسے ہی پہلی گولی چلے وہ اس کا خاتمہ کر دیں۔ شینہ اور شارق ایک کیمین میں اور ڈی کو شاو دوسرے کیمین میں رہتا تھا۔ لیکن رات کو جب اس نے ان تینوں کو ایک ہی کیمین میں جاتے دیکھا تو یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ اس طرح اس کا کام بھی کچھ اور آسان ہو گیا تھا۔ وہ تینوں ایک کیمین میں ہوں گے تو انہیں ٹھکانے لگانے میں آسانی رہے گی۔

اور پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ لوگ سوچے ہوں گے تو قاسم نے عملی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تو نوکھلا عرشے پر سو رہا تھا۔ اس نے عمر کو اشارہ کیا اور خود پستول سنبھالے کیمین کی طرف بڑھنے لگا اس نے بڑی آہستگی سے کیمین کا دروازہ کھولا تھا۔ دروازے کے بالکل سامنے والی دیوار میں نیچے اور اوپر دو بنگ تھے۔ اسے یقین تھا کہ دو افراد تو اس بنگ پر سوئے ہوئے ہوں گے۔ اس نے دروازہ کھولتے ہی ایک بنگ پر گولی چلا دی تھی۔ لیکن پھر اسے چونک جانا پڑا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جسے بھی گولی لگے گی وہ جیتنے کا ضرور۔ لیکن گولی کے جواب میں خاموشی پا کر وہ چونکے بغیر نکل رہا تھا۔ ایک عجیب سا شبہ اس کے ذہن میں ابھرا اور وہ دروازہ پوری طرح کھول کر مزید آگے بڑھ گیا اور پھر وہ سب کچھ ہو گیا جس کی اسے توقع نہیں تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شارق اور اس کے ساتھی کسی طرح اس کی سازش سے واقف ہو چکے تھے۔ بازی پلٹ گئی تھی

ان ہمارے وجود سے بھی پاک ہو جائے۔
نو لکھا اور شارق دہیل کیبن میں آگئے۔ شارق کو یہ دیکھ کر اطمینان نہ ہوا۔ لالچ آٹو پائلٹ پر
اور اس کا رخ بھی اس طرف تھا جس طرف لکھا جاتا تھا۔ شارق نے ایک طرف لگی
ٹھہری دیکھی۔ ساڑھے تین بج رہے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ تقریباً آدھ گھنٹے میں اپنی منزل
پانچ جائیں گے لیکن سب سے بڑا مسئلہ لالچ کو کنٹرول کرنے کا تھا۔

”تم لالچ کو سنبھال سکو گے یا ہم سمندر میں ہی بھٹکتے رہیں گے۔“ شارق نے پوچھا۔
”فکرت کرو شارق باؤ۔“ نو لکھا نے لالچ کا کنٹرول سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میں قاسم کے ساتھ
لے لگا رہتا تھا کہ اسے تھوڑا بہت ہینڈل کرنا سیکھ لوں۔“
”خدا کرے تم اسے ہینڈل کر لو۔“ شارق نے کہا۔

ٹہینہ اور ڈی کوسا بھی دہیل کیبن میں آگئے تھے۔ ٹہینہ مختلف ڈائریکٹرز کو دیکھ رہی تھی۔ پانچ
کے لگ بھگ دن کی روشنی پھیلنے لگی تو ٹہینہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخ اٹھی۔
”وہ... وہ دیکھو... وہ چٹان نظر آرہی ہے۔“

دارق وغیرہ اس طرف دیکھنے لگے اور پھر تیزی سے کیبن سے نکل کر عرشے پر آگئے۔
نو لکھا کنٹرول دہیل سنبھالے رہ گیا تھا شارق، ٹہینہ اور ڈی کوسا عرشے کی ریٹنگ کے سہارے
ہو کر سامنے دیکھنے لگے۔ بہت دور صبح کے دھندلکے میں ایک بہت بڑی چٹان کا ہیولہ دکھائی
اٹھا۔

نو لکھا: ”شارق نے وہیں سے چلا کر کہا۔“ لالچ کا رخ چٹان کی طرف موڑ دو۔ لیکن اس
خیال رکھنا کہ لالچ کہیں ٹکرا نہ جائے۔“

فکرت کرو شارق باؤ۔“ نو لکھا نے بھی چیخ کر جواب دیا۔ ”ہم انشاء اللہ خیریت سے پہنچ
گے۔“

غلامیں دھند سی تھیں۔ لالچ کی رفتار کم ہو گئی۔ اب وہ بہت ست رومی سے چٹان کی طرف
لا تھی۔ نو لکھا نے لالچ کی تمام بتیاں بھی روشن کر دی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے دہیل
بائوئے تھا اور کسی ماہر ملاح کی طرح اسے کبھی دائیں اور کبھی بائیں حرکت دے رہا تھا۔

قریباً آدھے گھنٹے بعد لالچ چٹان کے بہت قریب پہنچ گئی۔ اب دھند بھی چھٹنے لگی تھی۔
نو لکھا ہی کو نہیں بلکہ سب کو یہ اندیشہ تھا کہ لالچ کیس پانی میں چھپی ہوئی کسی چٹان سے نہ
اٹے۔ نو لکھا صرف چند گھنٹے قاسم کے ساتھ رہا تھا۔ اور ان چند گھنٹوں میں سطحی طور پر چند
تجربے جاسکتی تھیں لیکن ملاح ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لیکن نو لکھا نے ان چند

اس کے دونوں ساتھی مارے جا چکے تھے۔ نبی بخش کی لاش اس کے سامنے عرشے پر پڑی تھی اور
وہ چاروں طرف سے گھر چکا تھا۔ یہ چاروں اسے انسان نہیں موت کے فرشتے لگ رہے تھے۔
قاسم نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کسی طرح لالچ کے انجن والے
کیبن تک پہنچ جائے تو اپنے آپ کو بچا سکتا تھا۔ اگر موت ہی اس کا مقدر بن چکی تھی تو وہ اکیلا
نہیں مرے گا۔ ان چاروں کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے گا لیکن انجن والے کیبن کی طرف اب
نو لکھا کھڑا تھا۔ وہ انسان نہیں جلا تھا۔

قاسم نے ایک بار پھر گھوم کر ادھر ادھر دیکھا۔ شارق ہاتھ میں پستول سنبھالے آہستہ آہستہ
آگے بڑھ رہا تھا۔ ڈی کوسا بھی آگے آ رہا تھا۔ البتہ ٹہینہ اپنی جگہ کھڑی تھی۔ قاسم کی آنکھوں
میں چمک سی ابھر آئی۔ یہ حصار کا زور پہلو تھا۔ یہ سوچتے ہوئے قاسم نے ٹہینہ کی طرف دوڑ لگا
دی۔ اس نے یہی سوچا تھا کہ کسی طرح ٹہینہ کو اپنی گرفت میں لے کر اس کے ذریعے انہیں اپنے
سامنے جھکتے پر مجبور کر دے گا۔ اگر وہ ٹہینہ کو گرفت میں نہ بھی لے سکا تو اسے اوپر سے گھوم کر
انجن والے کیبن تک پہنچنے کا موقع مل جائے گا۔ اس نے جیسے ہی ٹہینہ کی طرف چھلانگ لگائی
شارق نے پستول کا ٹرائیگر دبا دیا۔ پستول سے سنک کی آواز ابھر کر رہ گئی۔ شارق کا پستول بھی خالی
ہو چکا تھا۔ وہ پستول پھینک کر قاسم کے پیچھے دوڑا۔

قاسم ٹہینہ کی طرف لپکا۔ ٹہینہ غافل نہیں تھی۔ وہ بھی غالباً قاسم کے ارادے کو بھانپ گئی
تھی۔ قاسم جیسے ہی قریب پہنچا ٹہینہ نہ صرف پھرتی سے ایک طرف جھک گئی بلکہ اس نے ایک پیر
بھی آگے کر دیا تھا۔ اس کا پیر قاسم کی ٹانگوں میں الجھا اور قاسم چیخا ہوا منہ کے بل گرا۔ لیکن اس
نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس نے اٹھ کر ٹہینہ پر جھپٹنا چاہا مگر پھر اس نے اپنا ارادہ
بدل دیا۔ شارق بہت قریب پہنچ چکا تھا۔

قاسم نے مڑ کر دوسری طرف دوڑ لگا دی۔ وہ اوپر سے گھوم کر انجن والے کیبن کی طرف جانا
چاہتا تھا مگر نو لکھا دوڑتا ہوا اس طرف آگیا۔ قاسم بڑی طرح بدحواس ہو گیا۔ اس نے مڑ کر ریٹنگ
کی طرف چھلانگ لگا دی۔ دوسری طرف سے شارق نے دوڑ کر اس کا راستہ روکنا چاہا لیکن اسے
دیر ہو چکی تھی۔ قاسم چیخا ہوا اچھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا تاریک سمندر میں جا گرا۔
وہ چاروں دوڑتے ہوئے ریٹنگ کے قریب پہنچ گئے۔ تاریکی میں قاسم کی ایک دو جھینیں سنائی
دیں اور پھر اسے لہروں نے نگل لیا۔

”خس کم جہاں پاک۔“ نو لکھا نے تاریک سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”جہاں تو اس خس سے پاک ہو گیا۔ اب لالچ کو دیکھو۔“ شارق نے کہا۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ

گھنٹوں میں قاسم سے جو کچھ سمجھا تھا اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ بڑی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔

چٹان لمحہ بہ لمحہ قریب آرہی تھی۔ چٹان کیا تھی تقریباً دو مربع میل پر پھیلا ہوا ایک چھوٹا چٹانی جزیرہ تھا جس پر گھاس کا ایک تنکا تک نہیں تھا۔ اگرچہ یہ جزیرہ ساحل کے قریب ہوتا تو طرح ویران نہ ہوتا۔ ساحل سے تقریباً ڈھائی سو میل دور ہونے کی وجہ سے ہی یہ ویران پڑا تھا تقریباً پچاس گز کا فاصلہ رہ گیا تھا اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ لالچ پانی میں چھپی ایک چٹان سے ٹکرا گئی۔ اگر رفتار تیز ہوتی تو شاید لالچ کے ٹکڑے ہو گئے ہوتے۔ لیکن رونا ہونے کے برابر تھی اس لئے اس تصادم کے بعد بھی یہ لوگ محفوظ رہے تھے۔ البتہ لالچ زیر چھوٹی چھوٹی چٹانوں میں پھنس گئی تھی۔ اب یہ بات نوکھا کے بس میں نہیں تھی کہ لالچ کو سے نکال سکتا۔ اس نے انجن بند کر دیا۔ پتھروں میں پھنسی ہوئی لالچ ہلکے ہلکے ہلکورے لینے لگا۔ ”قصہ تمام شد۔“ شارق نے ٹیمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا ہم اس چٹان پر اڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے۔“ ٹیمین نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی تھی۔

”تم شاید بھول رہی ہو کہ مال لینے کے لئے ایک جہاز یہاں آنے والا ہے۔“ شارق کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہم اس جہاز کے کپتان سے کہیں گے کہ وہ ہمیں کسی ساحل پر اتار دے۔ امید ہے کہ وہ ہماری یہ درخواست رد نہیں کرے گا۔“

”لیکن... وہ جہاز کب آئے گا؟“ ٹیمین نے پوچھا۔

”میرے خیال میں اب سے ایک گھنٹے بعد اس جہاز کو یہاں پہنچ جانا چاہئے۔“ اس م کوٹھانے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ لوگ لالچ کے عرش پر بیٹھ گئے۔ ہوا خاصی تیز تھی۔ اس میں نمی زیادہ تھی جس سے چپ چاپٹ کا احساس ہو رہا تھا۔

”ایک دن اور دو راتیں۔“ شارق ٹیمین کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”یہ ہماری سب سے سنسنی خیز دور تھا۔ پانچ انسان اپنی زندگیوں سے محروم ہوئے اور ہمارے سروں خوف کی تلوار لٹکتی رہی۔“

”خوف کی یہ تلوار تو اب بھی ہمارے سروں پر لٹکی ہوئی ہے۔“ ٹیمین نے کہا۔ ”ناٹم سیکیورٹی یا بحری کسٹمر کی کوئی لالچ اس طرف نکل آئی تو ہم دھر لئے جائیں گے۔ پہلے تو بات بن گئی تھی لیکن اب ہمارے پاس کوئی عذر نہیں ہے۔“

”ہم اس وقت آزاد سمندر میں ہیں۔“ ڈی کوٹھانے کہا۔ ”یہاں ہم محفوظ ہیں۔ البتہ ہم ہی کسی ملک کی سرحد میں داخل ہوں گے وہاں کے قانون کے مطابق ہمارے ساتھ سلوک کیا جائے گا۔“

”یار شارق باؤ۔“ نوکھانے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ساری رات ہمارے ساتھ بڑے سے ہوتے رہے ہیں۔ میرا تو جسم بھی تھک گیا ہے اور دماغ بھی۔ میرا دل تو چاہ رہا ہے کہ پی لیں اور کچھ کھاپی بھی لیں۔ تاکہ دماغ کچھ سوچنے کے قابل تو ہو سکے۔“

”میں چائے بناتی ہوں۔ تم ڈبوں میں سے کچھ کھانے کو نکال لو۔“ ٹیمین بھی کہتے ہوئے اٹھ

نوکھا تو کیمین کی طرف چلا گیا اور ٹیمین اس طرف جہاں کچن کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ اسے بنانے میں پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے اس دوران نوکھا بھی بسکٹوں کے ڈبے نکال لیا۔ ”ہمارے کپڑے اس کجخت نے پتہ نہیں کہاں چھپا دیئے ہیں ان کپڑوں میں تو اب ابھن لگی ہے۔“ شارق نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

”مجھے پتہ ہے۔“ نوکھانے جواب دیا۔ ”انجن روم کی ایک دیوار کے تختوں کے پیچھے وہ کیس رکھا ہوا ہے۔ اتفاق سے میں نے نبی بخش کو وہ تختہ کھولتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔“

چائے پینے کے بعد نوکھا وہاں سے اٹھ کر انجن روم میں آ گیا۔ ٹیمین بھی اس کے ساتھ کیمین میں داخل ہو کر نوکھا ایک دیوار کے قریب بیٹھ گیا اور اسکیرو ڈرائیور سے دیوار میں ہوئے پیچ کھولنے لگا۔ چار پیچ کھل جانے سے لکڑی کا ایک تختہ الگ ہو گیا۔ دیوار میں پیدا نہ والے اس خلا میں وہ سوٹ کیس رکھا ہوا تھا جسے باہر نکال کر اس نے ٹیمین کے حوالے کر دیا۔ خود تختے کو دوبارہ اس کی جگہ پر فٹ کرنے لگا۔

ٹیمین وہ سوٹ کیس لے کر اپنے کیمین میں آ گئی۔ اس نے کیمین کا دروازہ اندر سے بند کر لیا سوٹ کیس میں سے اپنے کپڑے نکال کر پہننے لگی۔ پینٹ شرٹ اور جوگرز میں وہ اپنے آپ کو سے زیادہ فٹ محسوس کرنے لگی تھی۔

ٹیمین کیمین سے باہر آ گئی۔ ڈی کوٹھانے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے باری باری کیمین میں جا کر کپڑے بدل لئے۔

سورج طلوع ہو رہا تھا۔ کل ٹیمین نے غروب آفتاب کا دلچسپ و حسین منظر دیکھا تھا۔ سمندر لہر آفتاب کا منظر اس سے کہیں زیادہ حسین تھا۔

بڑی مشکل سے انہیں ساتھ لینے پر آمادہ ہوا تھا۔

”ہمارا راستہ اگرچہ مختلف ہے لیکن ہم ایک طویل پتھر کاٹنے ہوئے مسقط کی طرف نکل جائیں گے۔ وہاں تم لوگوں کو ساحل پر اتار دیا جائے گا اور اگر قسمت نے ساتھ دیا تو گوادر پہنچ جاؤ گے۔ اسمگلروں کی لانچیں مسقط اور گوادر کی درمیان پتھر لگاتی رہتی ہیں۔“

شارق نے ٹینے کو جہاز پر ہی چھوڑ دیا اور لطیف کے ساتھ موٹر بوٹ پر سوار ہو کر لانچ کی طرف واپس چلا گیا۔

لانچ کے نیچے سے ہیروئن سے بھرا ہوا وہ آہنی کنٹینر نکالنے میں تقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ سب لوگ بوٹ پر آ گئے۔ شارق نے لانچ کے عرشے پر رکھا ہوا ڈیزل کا ایک ڈرم اوندھا دیا۔ ڈیزل عرشے پر پھیلتا چلا گیا۔ شارق نے ریٹنگ کے قریب آ کر ایک کپڑے کو آگ لگائی اور اسے عرشے پر پھینک دیا اور خود بڑی پھرتی سے رسے سے لنک کر موٹر بوٹ میں آ گیا۔ موٹر بوٹ فوراً ہی حرکت میں آ گئی۔

جب وہ جہاز پر پہنچے تو چٹان کے قریب کھڑی ہوئی لانچ سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ اور یہ شعلے بتدریج بلند ہوتے جا رہے تھے۔

جہاز حرکت میں آ گیا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ وہاں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ شارق، ٹینے، نوکھا اور ڈی کوشا جہاز کے عرشے کی ریٹنگ سے نیک لگائے کھڑے شعلے اٹکتی ہوئی لانچ کو دیکھ رہے تھے جو لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔



ماجھا گجری تلملاہٹ قابل دید تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنا ہی گلا گھونٹ لے۔ شارق اور ٹینے کا مندر سے بھاگ جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ نہ صرف بھاگ گئے تھے بلکہ یعقوب کو بھی قتل کر گئے تھے۔ یعقوب اس کا ایک مضبوط ستون تھا جو گر گیا تھا۔

شارق بڑی مشکل سے اس کے ہاتھ لگا تھا۔ لیکن وہ جس طرح نکل بھی گیا تھا اس سے ماجھا گجری طرح بوکھلا گیا تھا۔ اس کے اس طرح بھاگ جانے کا مطلب تھا کہ اب وہ ان پر بھرپور وار کرے گا۔ ماجھا کو اپنے آدمیوں پر اس بات پر بھی طیش آ رہا تھا کہ رات کو جب شارق اور ٹینے کو پکڑ کر مندر والے اوڑے پر لایا گیا تھا تو اسے اطلاع کیوں نہیں دی گئی تھی۔ حالانکہ رات بارہ بجے تک وہ خود مندر میں رہا تھا۔ اسے کسی اور ذریعے سے یہ اطلاع تو مل گئی تھی کہ شارق کے ڈیرے کو آگ لگا دی گئی تھی۔ پھر وہ یعقوب کو یہ ہدایت کر کے اپنی نمر والی کو بھی پر آ گیا تھا کہ شارق کے سلسلے میں کوئی اطلاع ملے تو اسے فوری طور پر اطلاع دے دی جائی لیکن شارق کے

سورج جیسے جیسے بلند ہو رہا تھا دھوپ میں تپش آتی جا رہی تھی۔ جہاز ابھی تک نہ تھا۔ انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ جہاز ہفتہ کی صبح اس چٹان کے پاس پہنچے گا۔ کوئی وقت مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن صبح کا وقت بیت رہا تھا۔ اور اب تو دوپہر ہونے والی تھی۔ وہ سب ہی اپنی اپنی جگہ پکڑے ہوئے تھے۔ ٹینے سوچ رہی تھی کہ اگر جہاز نہ پہنچا تو وہ اسی لانچ یا چٹان پر اڑیاں ہوئے ختم ہو جائیں گے اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ شارق کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ آبی گزرگاہ سے بہت ہٹ کر ہے جس کا مطلب تھا کہ اس طرف کسی اور جہاز کے آنے کا توقع نہیں تھی جسے کسی طرح اپنی طرف متوجہ کیا جاسکتا۔

پونے بارہ کے قریب افق پر ایک جہاز کا بھولہ سا دکھائی دیا۔ جہاز کو دیکھ کر ان کی جان آئی۔ جہاز اسی طرف آ رہا تھا۔ اسے وہاں پہنچنے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا اور پھر اس چٹان سے تقریباً نصف میل دو ہی نلکر انداز ہو گیا۔

شارق وغیرہ اس طرف دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک کشتی جہاز سے سمندر میں گئی۔ اس کے ساتھ ہی دو آدمی بھی کشتی میں آ گئے۔ وہ ایک چھوٹی موٹر بوٹ تھی جو چیرتی ہوئی ان کی لانچ کے قریب آ گئی۔ وہ دونوں آدمی کشتی سے لانچ پر آ گئے تھے۔ پاکستانی ہی تھے۔ کوڈ ورڈز کے تبادلے کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ یہ وہی لوگ تھے جن کے وہ مال کرنا تھا۔

”مال کہاں ہے؟“ ان میں لطیف نامی شخص نے پوچھا۔
”مال تمہارے حوالے کر دیا جائے گا لیکن ہمیں ایک پرائیلم درپیش ہے۔“ شارق نے
”وہ کیا؟“ لطیف نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

شارق نے اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔
”ہم میں سے کوئی بھی لانچ چلانا نہیں جانتا۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں بھی جہاز کر لیا جائے اور کسی ساحل پر اتار دیا جائے۔ وہاں سے ہم اپنا بندوبست خود ہی کر لیں گے۔“
”پکتان سے بات کرنی پڑے گی۔“ لطیف نے کہا۔ ”وہ کینڈین ہے اور میرا خیال تمہاری بات مشکل ہی سے مانے گا کیونکہ ہمیں صرف مال اٹھانے کو کہا گیا تھا کسی آدمی کو چلنے میں خود بات کرتا ہوں۔“ شارق نے کہا۔

لطیف اور شارق موٹر بوٹ پر آ گئے۔ پھر کچھ سوچ کر شارق نے ٹینے کو بھی ساتھ انہیں جہاز تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ یہ مال بردار جہاز تھا اور زیادہ بڑا نہیں کراچی کی بندرگاہ سے روانہ ہو تھا اور اس کی منزل کینڈا تھی جہاز کا پکتان بھی کینڈا

ہاتھ روم دراصل ڈرائنگ روم میں آنے والے مہمانوں کے لئے مخصوص تھا۔ ماجھا اس ہاتھ روم میں داخل ہو گیا۔

اس کے کپڑوں سے اب بھی کیچڑ ٹپک رہا تھا۔ چہرہ اور ہاتھ پیر بھی کیچڑ میں لت پت تھے۔ اسے اپنے آپ سے کراہیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ ہاتھ روم میں داخل ہو کر اس نے بڑی احتیاط سے کپڑے اتار کر ایک کونے میں ڈال دیئے اور شلور کھول کر اس کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ شلور کے نیچے کھڑا نہاتا رہا۔ اس دوران اس نے تین مرتبہ اپنے جسم پر صابن ملا تھا اور بالآخر مطمئن ہو کر اس نے تولیہ لپیٹا اور ہاتھ روم سے نکل کر اپنے کمرے میں آگیا اور الماری میں سے استری شدہ کپڑے نکل کر پہنے لگا۔ کپڑے بدل کر وہ ڈرائنگ روم میں آگیا۔ تقریباً اسی وقت کاکا اندر داخل ہوا اس کے کندھے پر آٹومیک رائفل لٹکی ہوئی تھی۔

”گاڑی کیچڑ میں کیسے بھر گئی استلو؟“ اس نے دروازے ہی میں رک کر پوچھا۔
 ”آج تو میرے ساتھ ڈرامہ ہو گیا۔“ مانجھے نے کہا۔ ”میں وزیر علی کی طرف گیا تھا۔ گاڑی بازار میں کھڑی کر دی تھی۔ میں خود وزیر علی کی طرف چلا گیا تھا۔ تمہیں پتہ ہے اس کا گھر گندے نالے کے پرلی طرف ہے۔ واپس آتے ہوئے میں نے سوچا لمبا چکر لگانے کے بجائے چھلانگ لگا کر تالہ پار کر لیا جائے۔ اندھیرے میں اندازے کی غلطی ہو گئی اور میں گندے نالے میں جا گرا۔ اس وقت آس پاس کوئی آدمی بھی نہیں تھا جو میری مدد کرتا۔ بڑی مشکل سے نکلا تھا نالے سے۔۔۔۔۔۔ میرے کپڑے پچھلے غسل خانے میں پڑے ہیں۔ انہیں پانی میں کھنگال کر باہر ڈال دو۔ بعد میں دھوبی کو دے دیتا۔ اور غسل خانے کو اچھی طرح دھو دیتا۔ اور ہاں۔۔۔۔۔۔ گاڑی صاف کر دی؟“
 مانجھے نے آخر میں سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے کیچڑ کے بارے میں ایک فرضی کہانی سنا دی تھی۔ ظاہر ہے وہ یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ اسے گالے نے کیچڑ میں رگیدا تھا۔

”منیر گاڑی صاف کر رہا ہے۔“ کاکے نے جواب دیا۔
 ”اچھا جاؤ۔۔۔۔۔۔ تم چائے بنا کر لاؤ اور یہ ٹیلی فون ذرا میرے پاس رکھ جاؤ۔“ مانجھے نے کہا۔ کاکا نے اسٹینڈ پر رکھا ہوا ٹیلی فون اٹھا کر اس کے سامنے کٹنی ٹیبل پر رکھ دیا اور باہر چلا گیا۔ مانجھے نے ٹیلی فون اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دو ہندسے ملانے کے بعد اس نے کریڈل دبا دیا۔ چند لمحوں کے بعد سوچتا رہا پھر ٹیلی فون صوفے پر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد کاکا چائے بنا کر لے آیا۔ ماجھا گھر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ شارق کو کہاں تلاش کرے۔ لیکن شارق سے زیادہ اب اسے گالے کی ضرورت تھی جس نے اسے ذلیل کیا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ جب تک گالے کو سبق نہیں سکھائے گا اسے چین نہیں

ساتھ حینہ کو دیکھ کر یعقوب کی رال ٹپک پڑی تھی اور اس کی ہوس نے ہی اسے موت کی نیر سلا دیا تھا۔

شارق ایک بار پھر اپنی خفیہ پناہ گاہ میں جا چھپا تھا اور مانجھے کے آدمی اس کا سراغ لگانے میں بری طرح ناکام رہے تھے۔ اپنے آدمیوں سے مایوس ہو کر مانجھے نے خود شارق کی تلاش شروع کر دی تھی۔ اس سلسلے میں راجہ کا نام سامنے آیا تھا۔ راجہ بھی شارق کا آدمی تھا۔ اور مانجھے کو اس بات پر حیرت تھی کہ اس نے اسکرپ سے بھرا ہوا ٹرک کیوں لیا تھا اور پھر دوسرے دن اسکرپ واپس کیوں کر دیا تھا۔ مانجھے کو شبہ تھا کہ اسکرپ کی آڑ میں مل کسی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا گیا ہو گا۔ لیکن راجہ کہاں تھا؟ وہ بھی اسی طرح غائب ہو گیا تھا جیسے اس دنیا میں اس وجود ہی نہ رہا ہو۔

اور پھر اسی رات مزنگ میں گھومتے ہوئے گالا اس کی نظروں میں آگیا تھا جو ایک ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ پولیس اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ ماجھا گھر تھانے کے باہر کھڑا گالے کی واپسی کا انتظار کرتا رہا اور بالآخر گالا تھانے سے باہر نکلا تو مانجھے نے اس کا تعاقب شروع کر دیا اور ایک سنا جگہ پر اسے گرفت میں لینے کی کوشش کی مگر گالا اسے گندے پانی والے چھپڑ میں ڈھیر کر کے بھاگ نکلا تھا۔

ماجھا گھر اپنے آدمیوں پر برہم تو تھا ہی لیکن اب اسے اپنے آپ پر بھی طیش آ رہا تھا۔ گالے کو قابو نہیں کر سکا تھا۔ بلکہ اسے خود ذلیل ہونا پڑا تھا۔ چھپڑ سے نکلنے کے بعد وہ سیدھا نہروالی کوٹھی پر آیا تھا اس کے کپڑے کیچڑ میں لت پت تھے جس سے گاڑی کی سیٹ بھی خراب ہو گئی تھی۔ جب وہ کوٹھی پہنچا تو چوکیدار اسے کیچڑ میں لت پت دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہا تھا۔ ”کاکا کہاں ہے؟“ مانجھے نے گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی گاڑی روک لی تھی۔

”وہ چھت پر ہے جی۔“ چوکیدار نے جواب دیا۔
 ”اے بلاؤ اور کوئی گاڑی صاف کرے۔“ ماجھا کہتے ہوئے گاڑی سے اتر کر آگے بڑھ گیا۔ جب سے شارق مندر سے فرار ہوا تھا مانجھے نے دو گن مین اپنی کوٹھی پر تعینات کر رکھے تھے کیونکہ اسے شارق کی طرف سے کسی انتقامی کارروائی کا اندیشہ تھا۔ ان دونوں گن مینوں سے ایک ہر وقت چھت پر موجود رہتا تھا۔

ماجھا پورچ والے دروازے سے اندر داخل ہونے کی بجائے پہلو کے دروازے سے داخل ہوا۔ اس دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ایک ہاتھ روم تھا اور اس سے آگے راجہ کے انتظام پر ایک طرف ڈرائنگ روم کا دروازہ تھا اور دوسری طرف ہال میں داخلے کا راستہ

آئے گا۔

چائے پیتے ہوئے اسے اچانک ہی ایک اور خیال آیا۔ ایک ایسے شخص کا نام اس کے ذہن میں آگیا تھا جس سے راجہ کے بارے میں معلوم کیا جاسکتا تھا۔ اس کا نام شکور تھا اور وہ مغل پورہ میں رہتا تھا۔ راجہ سے اس کی بڑی یاری تھی اور مانجھے سے بھی اس کے تعلقات تھے۔ مانجھے کو یقین تھا کہ شکور سے راجہ کے بارے میں معلوم ہو جائے گا۔

”اوئے کا کے!“ اس نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے آواز دی۔

”کاکا فوراً ہی حاضر ہو گیا۔“ جی استاد جی۔“

”گاڑی صاف ہو گئی؟“ مانجھا نے پوچھا۔

”منیر گاڑی صاف کر رہا ہے استاد جی۔ بس تھوڑا ہی کام رہ گیا ہے۔ سیٹوں پر سوکھا کپڑا بچہ رہا ہے۔“ کاکا نے جواب دیا۔

”تم گاڑی لے کر مغل پورے چلے جاؤ اور شکور کو لے کر آؤ۔ اس سے کہنا مانجھے نے کہا ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔“ مانجھے نے کہا۔

”اچھا استاد جی۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔“ کاکا کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

مانجھا کچھ دیر ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا پھر اٹھ کر ہال کمرے میں آگیا جہاں بی بی رکھا تھا۔ اس نے بی بی وی آن کر کے دور درشن لگا دیا۔ اس وقت فلم آ رہی تھی۔ مار دھاڑ سے بھر یہ فلم خاصی دلچسپ تھی۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھا فلم دیکھتا رہا۔

فلم اپنے منطقی انجام کو پہنچ کر ختم ہو گئی۔ یہ انجام بھی مار دھاڑ سے بھر پور تھا۔ مانجھے۔ اٹھ کر بی بی وی بند کر دیا اور دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ ساڑھے بارہ بجے تھے۔ ٹھیک اسی کار بنگلے میں داخل ہو کر رکی اور تھوڑی ہی دیر بعد سامنے والے دروازے کی طرف سے کاکا شکور کی باتوں کی آواز حائل دی۔

”کاکا! میں یہاں ہوں۔ ہال کمرے میں۔ شکور کو یہیں لے آؤ۔“ مانجھے نے قدرے اونگھتے ہوئے آواز میں کہا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ہال میں آ گئے۔ شکور نے اس طرح آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا تھا جیسے وہ دمرشد کے سامنے حاضری دے رہا ہو۔

”آج ہماری یاد کیسے آگئی استاد۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم بھول ہی گئے ہو؟“ شکور نے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”میں تو نہیں بھولا لیکن تم ہی لوگ مجھے بھولتے جا رہے ہو۔“ مانجھے نے کہا۔ ”آج ایک

ان پڑا ہے تم سے۔“

”حکم کرو استاد۔“ شکور نے کہا۔ ”کوئی بندہ اٹھواتا ہے۔“

”یہی سمجھ لو۔“ مانجھے گجبر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس طرح نہیں جس طرح سمجھ رہے ہو۔“

”پھر کیسے استاد؟“ شکور نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”جسے اٹھاتا ہے وہ تمہارا بہت گرا دوست ہے۔ تم اسے کہیں بھی لے جاسکتے ہو۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ اسے اٹھانے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں جو کچھ چاہتا ہوں وہ تم بڑی آسانی سے معلوم کر سکتے ہو؟“

”کھل کر بات کرو استاد۔“ شکور نے کہا۔

”راجہ آج کل کہاں غائب ہے۔“ مانجھا گجبر نے سوال کیا۔

”وہ آج کل گلے کے ساتھ لگا ہوا ہے۔“ شکور نے جواب دیا۔ ”اتفاق سے آج ہی ملاقات ہوئی تھی۔ بڑی جلدی میں تھا۔ کوئی تفصیلی بات بھی نہیں ہو سکی۔ مگر تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟“

”تمہیں معلوم ہے شارق سے آج کل میری نسل چل رہی ہے۔ اس نے مجھے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ اس کے ہاتھوں میرے کئی بندے بھی ضائع ہو چکے ہیں لیکن شارق کسی طرح قابو میں نہیں آ رہا۔ کل رات وہ ہاتھ تو لگ گیا تھا لیکن یعقوب کو قتل کر کے بھاگ گیا۔ اس کے بعد کوئی پتہ نہیں وہ کہاں غائب ہے۔ راجہ اگر گلے کے ساتھ لگا ہوا ہے تو اسے شارق کے ٹھکانے کا پتہ ہو گا۔ کسی طرح راجہ سے یہ معلوم کر لو کہ گاما یا شارق کہاں ہے۔ میں تمہیں اتنا انعام

دوں گا کہ یاد کرو گے۔“

”مجھے انعام کا لالچ نہیں ہے استاد۔“ شکور نے کہا۔ ”میں ایک دو دن میں راجہ کو تلاش کر کے اس سے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”کوشش ہی نہیں کرنی۔ یہ کام ہر صورت میں کرنا ہے۔ لو یہ خرچ وغیرہ کے لئے رکھ لو۔“

مانجھا گجبر نے جب سے پانچ ہزار روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔

شکور نے نوٹ لے کر جب میں رکھ لئے۔ وہ کچھ دیر تک شارق ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر شکور جانے کے لئے اٹھ گیا۔

”اسے چھوڑ آؤ کاکا۔“ مانجھا گجبر نے کاکا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں سونے کے لئے جا رہا ہوں۔ واپس آ کر مجھے جگامت دینا۔“

شکور کے جانے کے بعد مانجھا گجبر اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ

نہد کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

کئی روز گزر گئے۔ شارق کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ اس دوران دو مرتبہ شکور سے بھی ملاقات ہوئی تھی لیکن وہ بھی راجہ یا گاما کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکا تھا۔ اور پھر ایک روز ماجھا گجر کے لئے یہ اطلاع بڑی سنسنی خیز ثابت ہوئی تھی کہ شارق کو سرخ رنگ کی شیراڑ میں حاجی عبداللہ کے ایک آدمی کے ساتھ سمن آباد کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ ماجھا گجر حاجی عبداللہ کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا شمار پاکستان میں منشیات کے ان چند اسمگلوں میں ہوتا تھا جو پوری دنیا میں منشیات سپلائی کرتے تھے۔ وہ بہت سے ممالک کو مطلوب تھا پاکستان کی حکومت بھی اس کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔ مگر یہاں کوئی اس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ اس کی گرفتاری حکومت کے ایوانوں کو ہلا کر رکھ سکتی تھی۔

حاجی عبداللہ پاکستان میں آزادی سے گھومتا پھرتا تھا۔ لاہور میں اس کی بہت جائیداد تھی۔ ایبٹ روڈ پر ایک سینما بھی تھا۔ حاجی عبداللہ کو مقامی طور پر ہیروئن یا دیگر منشیات کی سپلائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ منشیات صرف بیرون ملک سمگل کرتا تھا۔ دس بیس کلو ہیروئن کے گاہکوں کو تو وہ گھاس بھی نہیں ڈالتا تھا۔ اس کا مال تو منوں کے حساب سے نکلتا تھا لیکن ماجھا گجر کو حیرت تو اس بات پر تھی کہ اس سے شارق کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ حاجی عبداللہ کے کسی آدمی کے ساتھ دیکھے جانے کا مطلب یہ تھا کہ شارق حاجی عبداللہ سے ملا ہو گا حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ حاجی عبداللہ جیسے شخص سے ملنا یا اس تک رسائی حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ ماجھا گجر اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اسے خود حاجی عبداللہ سے ملنا ہوتا تو پہلے اسے کئی سفارشی تلاش کرنا پڑتیں۔ ان سفارشوں کے باوجود یا تو وہ مصروفیت کا بہانہ کر کے ملنے سے صاف انکار کر دیتا یا ملاقات کے لئے کئی روز تک انتظار کرنا پڑتا لیکن..... شارق اس تک کیسے پہنچ گیا تھا۔

ماجھا گجر نے اپنے ذرائع سے یہ معلوم کرنے کی کوشش شروع کر دی کہ شارق حاجی عبداللہ تک کیسے پہنچا تھا۔ اس کا حاجی عبداللہ کے دو تین آدمیوں سے رابطہ ہوا بھی لیکن ان میں سے کوئی بھی کچھ نہیں بتا سکا۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ شارق اور حاجی عبداللہ میں کوا ملاقات ہوئی بھی تھی۔

ماجھا گجر بری طرح چکرایا ہوا تھا۔ نہ تو راجہ کا پتہ چل رہا تھا نہ ہی گامے کا اور نہ ہی شارق کا۔ البتہ شارق کے بارے میں اس انکشاف نے اسے مزید پریشان کر دیا تھا۔ اور پھر ایک روز اچانک ہی شارق اس کی نظروں میں آ گیا۔ وہ سرخ رنگ کی شیراڑ میں اور اس کے ساتھ شینہ بھی تھی۔ وہ گاڑی اس نے ریلوے اسٹیشن کے قریب دیکھی تھی جو گھو

ہوئی گڑھی شاہو کی طرف جاری تھی۔ ماجھا گجر نے فوراً ہی اس سرخ شیراڑ کا تعاقب شروع کر دیا۔ بوہڑ والا چوک تک تو اس نے اپنے اور شیراڑ کے درمیان ایک گاڑی حائل رکھی۔ اس علاقے میں رش تھا اور اسے اندیشہ تھا کہ اگر زیادہ فاصلہ رکھا گیا تو شارق کی گاڑی غائب نہ ہو جائے لیکن بوہڑ والا چوک کے ذرا آگے نکلنے ہی اس نے فاصلہ بڑھا دیا۔

گڑھی شاہو کے چوک سے شارق کی گاڑی ریلوے پل کی طرف مڑ گئی۔ ماجھا گجر موڑ پر پہنچا ہی تھا کہ پل کی طرف سے آنے والی ایک مسافر وگن تیزی سے اس طرف مڑی۔ ماجھا گجر نے اپنی گاڑی بڑی پھرتی سے بائیں طرف موڑ دی لیکن وہ بچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ نہ صرف وگن اس کی گاڑی سے ٹکرا گئی بلکہ کنارے پر کھڑا ہوا پھلوں کا ایک ٹھیلہ بھی اس کی گاڑی سے ٹکرا کر الٹ گیا۔

وگن کے ٹکرانے سے ماجھا گجر کی گاڑی کا اس طرف کا ہیڈ لیمپ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اپنا یہ نقصان نظر انداز کرنے کو تیار تھا مگر ٹھیلے والا اسے نظر انداز کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس جھگڑے کو طے کرنے میں تقریباً دس منٹ لگ گئے۔ ماجھا گجر نے گاڑی طوفانی رفتار سے دوڑا دی۔ پل کے دوسری طرف کو آپریٹو سنور والے موڑ پر وہ رک گیا اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ شارق کی گاڑی بائیں طرف گئی ہو گی یا دائیں سمت باغبانپورہ کی طرف۔ بلاخر اس نے گاڑی جی ٹی روڈ پر باغبانپورہ کی طرف موڑ دی۔ وہ گاڑی کو طوفانی رفتار سے دوڑا رہا تھا۔ کئی مرتبہ حادثہ ہوتے ہوتے بچا تھا ماجھا گجر شالادباغ تک پہنچ گیا لیکن شارق کی گاڑی کا سراغ نہیں ملا۔ بیس منٹ کا مارجن بہت زیادہ تھا۔ شارق کسی اور طرف نکل گیا ہو گا۔

ماجھا گجر کو بے حد افسوس ہوا تھا۔ شارق ایک بار پھر اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اسے مسافر وگن اور ٹھیلے والے پر بے حد غصہ آ رہا تھا جن کی وجہ سے شارق کو نکلنے کا موقع مل گیا تھا شارق اگرچہ نکل گیا تھا لیکن اس کی گاڑی کا نمبر اس نے نوٹ کر لیا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس گاڑی کے ذریعے وہ شارق کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

تیسرے دن رات کو اسے ایک بار پھر یہ اطلاع ملی کہ شارق کو گڑھی شاہو میں ایک ڈاکٹر کے کلینک سے نکلے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اطلاع دینے والے نے یہ بھی بتایا تھا کہ شارق کے ساتھ ایک بوڑھی عورت اور ایک جوان اور خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ وہ کلینک سے نکل کر سرخ رنگ کی شیراڑ میں بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھنے والا شخص گاڑی کا نمبر نوٹ نہیں کر سکا تھا۔ نمبر معلوم نہ ہونے کے باوجود مجھے کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وہی گاڑی تھی جس میں اس روز شارق اور شینہ کو اس نے دیکھا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ بوڑھی عورت اور جوان لڑکی کون تھی۔ تجربے جو حلیہ

ماجھا گجر مایوس ہو کر واپس آگیا۔ کئی روز گزر گئے نہ تو گاڑی کا سراغ ملا اور نہ ہی شارق کا۔ گڑھی شاہو میں واقع اس کلینک کی بھی نگرانی کی جا رہی تھی لیکن شارق اس روز کے بعد وہاں نہیں آیا تھا۔

اور پھر کئی روز بعد ماجھا گجر کو اطلاع ملی وہ بھی بڑی سنسنی خیز تھی۔ شارق اور ثمنہ کو ایئر پورٹ پر دیکھا گیا تھا۔ اطلاع دینے والے نے بتایا تھا کہ اس نے شارق اور ثمنہ کو ایئر پورٹ کے سامنے ایک ٹیکسی سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے پاس سالن کے نام پر صرف ایک سوٹ کیس تھا جسے شارق نے اٹھا لیا تھا۔

اس اطلاع پر ماجھا گجر اچھل پڑا تھا۔ ان دونوں کے اچانک ہی کراچی چلے جانے والی بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی کیا وہ اس سے ڈر کر بھاگ گئے تھے؟ یہ اطلاع پا کر ماجھا گجر کو خوشی بھی ہوئی تھی کہ اس کا سب سے بڑا دشمن بھاگ گیا تھا۔

شارق اور ثمنہ کے جانے کے دو دن بعد اتفاق سے گاما سے آنا سامنا ہو گیا۔ گاما اس وقت اکیلا تھا اور مانجھے کے ساتھ دو خوشنوار قسم کے آدمی تھے۔ انہوں نے گاما کو اپنی گاڑی میں ڈال لیا اور مانجھے کی سہرا والی کونٹھی میں لے آئے۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ وہ لوگ ہال کمرے میں تھے۔ گاما کو انہوں نے قالین پر بٹھا رکھا تھا اور ماجھا اور اس کے آدمیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔

”من اوئے گامے۔“ ماجھا گجر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”تیری وجہ سے مجھے اب تک کروڑوں کا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ لیکن میں یہ سب کچھ بھول سکتا ہوں بشرطیکہ تو شارق کو چھوڑ کر میری طرف آ جا۔ شارق ہے کیا چیز؟ اس میں مردانگی ہوتی تو وہ چوروں کی طرح نہ چھپتا تو تو بڑا دلیر آدمی تھا۔ لیکن شارق نے اپنے ساتھ تجھے بھی بزدل بنا دیا ہے۔ بھاگ گیا نا وہ تمہیں اکیلا چھوڑ کے۔ مجھے یقین تھا کہ اسے ایک نہ ایک دن بھاگنا ہی پڑے گا۔“

”وہ بھاگا نہیں ہے۔“ گامے نے کہا۔ ”چند روز بعد واپس آ جائے گا اور پھر تم اس کے آگے آگے لگ کر اس طرح بھاگے پھوگے کہ تمہیں کہیں بھی پناہ نہیں ملے گی۔“

”تمہیں باتیں تو بہت کرنا آگئی ہیں۔“ ماجھا گجر نے کہا۔ ”اب بھی وقت ہے گامے! میری بات مان لو۔ ورنہ سمجھ لے کہ یہ تیری زندگی کی آخری رات ثابت ہو گی۔“

”زندگی اور موت تو رب کے ہاتھ میں ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔“ گامے نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میں مرنا قبول کر لوں گا مگر تم جیسے چور اچکے کی بات نہیں مان سکتا۔“

”اوئے کاا!“ ماجھا گجر نے کا کے کی طرف دیکھا۔ ”تو اسے ذرا اپنی زبان میں سمجھا۔ اگر میں

بتایا تھا وہ ثمنہ سے بہت مختلف تھا اور یوں بھی زیر زمین دنیا کے بہت سے لوگ اب ثمنہ کو پہچان چکے تھے کیونکہ شارق اسے ہر وقت اپنے ساتھ لئے پھرتا تھا۔

تو پھر وہ بوڑھی عورت اور جوان لڑکی کون تھی؟

یہ سوال ماجھا گجر کے ذہن میں مسلسل گردش کر رہا تھا مگر اس سوال کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ وہ اس کی ماں یا بہن بھی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ شارق کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا، تو پھر وہ بوڑھی عورت اور جوان لڑکی کہاں سے ٹپک پڑی۔ تجربے بتایا تھا کہ شارق اور وہ لڑکی اسی بوڑھی عورت کو سہارا دیئے ہوئے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ عورت بچہ تھی اور شارق اسی کو دکھانے کے لئے لایا تھا۔ مانجھے کے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ شارق گڑھی شاہو میں کہیں رہ رہا ہو۔ اگر وہ کسی اور علاقے میں ہوتا تو اُس علاقے کے کسی ڈاکٹر کے پاس جاتا۔ شہر کے ہر علاقے میں اچھے ڈاکٹر موجود تھے۔

ماجھا گجر نے اپنے آدمی کو ہدایت کر دی کہ وہ کلینک کی نگرانی کرتا رہے اور جیسے ہی شارق نظر آئے اسے اطلاع کر دی جائے یا کسی بھی طرح پکڑنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اب اس نے گاڑی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یہ ذمہ داری اپنے ایک ایسے آدمی کے سپرد کر دی جو کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔

لیکن اس سلسلے میں بھی اسے بے حد مایوسی ہوئی۔ وہ گاڑی عرفان احمد نام کے ایک آدمی کے نام رجسٹر تھی۔ مانجھے نے جب ماڈل ٹاؤن میں عرفان احمد سے رابطہ قائم کیا تو پتہ چلا کہ اس نے یہ گاڑی ایک شو روم کے توسط سے فروخت کر دی تھی۔ ماجھا اس شو روم پر پہنچ گیا۔ یہاں بھی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ شو روم کے مینیجر نے بتایا کہ چند روز پہلے یہ گاڑی فروخت ہو گئی تھی۔ خریدنے والا ایک جوان آدمی اور ایک خوبصورت عورت تھی۔ گاڑی کی ٹرانسفر کے لئے اس عورت کا نام اور پتہ لکھ کر دیا گیا تھا لیکن وہ کانڈ کہیں کھو گیا تھا جس کی وجہ سے ٹرانسفر کارروائی بھی نہیں ہو سکی تھی شو روم کا مینیجر منتظر تھا کہ وہ لوگ گاڑی کی ٹرانسفر کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے دوبارہ آئیں تو ان سے نام اور ایڈریس لے کر کارروائی مکمل کی جائے۔

”کس رجسٹر پر تو لکھا ہو گا کہ گاڑی کس کو فروخت کی گئی ہے۔“ ماجھا گجر نے کہا۔

”ہم گاڑیاں بیچنے اور خریدنے والوں کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے اس گاڑی کا خریدار کا نام رجسٹر میں درج نہیں کیا جاسکا۔ خیال یہ تھا کہ وہ لوگ جو نام اور پتہ کانڈ پر لکھ دے گئے تھے اسے رجسٹر میں درج کر لیا جائے گا لیکن بد قسمتی سے وہ کانڈ ہی کہیں کھو گیا ہے۔ لوگ یقیناً واپس آئیں گے تو ان کا نام پتہ ریکارڈ میں شامل کر لیا جائے گا۔“ مینیجر نے جواب دیا۔

آدی کی طرف بڑھا دیا جو ٹیلی فون لئے کھڑا تھا۔ مانجھے کے چہرے کی تاثرات ایک دم بدل گئے تھے اس کے کندھے اس طرح ڈھلک گئے تھے جیسے ان پر بہت بڑا بوجھ لا دیا گیا ہو۔ کاکا گائے کو ایک ہی ٹھوکر مارنے کے بعد ٹیلی فون کی وجہ سے رک گیا تھا۔ اب وہ دوبارہ گائے کی طرف بڑھا تو مانجھے نے اسے روک دیا۔

”نہیں۔ اسے چھوڑ دو۔ اس کی سفارش آگئی ہے۔“

”کیا مطلب! کس کی سفارش آگئی ہے؟“ کاکا نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”حاجی عبداللہ کی۔“ مابھا گجر نے کہا پھر گائے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیوں اوئے۔۔۔“

حاجی عبداللہ سے کیا تعلق ہے تم لوگوں کا؟“

”ہمارے تعلق کا اندازہ تو تم نے اس ٹیلی فون کال سے لگا ہی لیا ہو گا۔“ گائے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”جسے تم سفارش کہہ رہے ہو وہ دراصل ایسی خوفناک دھمکی ہو گی جس نے تمہیں گھنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔“

”اس مرتبہ تو میں تمہیں حاجی کے کہنے پر چھوڑ رہا ہوں لیکن اگلی مرتبہ جب میں تم پر ہاتھ ڈالوں گا تو اس سے پہلے ایسا بندوبست کر لوں گا کہ حاجی عبداللہ جیسے آدمیوں کو مداخلت کا موقع نہ ملے۔“ مابھا گجر نے کہا پھر اپنے آدمیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”کاکا! تم یہیں رہو اور تم لوگ اپنی اپنی پوزیشن پر جاؤ۔ حاجی عبداللہ کے دو آدمی یہاں آنے والے ہیں۔ گائے کو ان کے حوالے کر دیا جائے گا اور سب لوگ سن لو۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہئے۔ میں فی الحال حاجی عبداللہ جیسے آدمی سے کوئی ٹکر نہیں لینا چاہتا۔ جاؤ۔۔۔۔۔ اب تم لوگ جاؤ۔“

کاکا کے علاوہ سب لوگ کمرے سے نکل گئے۔ کوئی چھت پر چلا گیا کوئی لان کے کسی تاریک حصے میں پودوں کے پیچھے دبک کر بیٹھ گیا۔

چالیس منٹ سے بھی پہلے ایک گاڑی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے آ کر رکی اور اس کے دو منٹ بعد چوکیدار نے آ کر بتایا کہ گائے کے دوست اسے لینے کے لئے آئے ہیں۔

”اسے باہر چھوڑ آؤ کاکا۔“ مابھا گجر نے اشارہ کیا۔

گاما مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا کاکا کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مابھا گجر کے منہ سے بے اختیار گرا سانس نکل گیا۔ وہ اس وقت اپنے آپ کو شکست خوردہ اور دنیا کا سب سے بے بس انسان سمجھ رہا تھا۔

اٹھ گیا تو یہ میرے ہاتھوں خرچ ہو جائے گا۔“

کاکا نے تلتے قدم اٹھاتا ہوا گائے کے قریب پہنچ گیا۔ گاما سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرز دیکھ رہا تھا۔ کاکا نے اچانک ہی اس کے سر پر زور دار ٹھوکر مار دی۔ گاما چیخا ہوا قالین پر دوسری طرف الٹ گیا۔

ٹھیک اسی لمحہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ٹیلی فون کا ایک ایکس مینشن سیٹ اس کمرے میں بھی ایک کونے میں اسٹینڈ پر رکھا ہوا تھا۔ مانجھے نے اپنے ایک اور آدمی کو اشارہ کیا اس نے آ کر بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ ہیلو کہہ کر کچھ دیر وہ دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر وہ ٹیلی فون اٹھا کر مانجھے کے قریب آ گیا۔ ریسیور اس نے مانجھے کی طرف بڑھا دیا اور خود ٹیلی فون اٹھائے کھڑا رہا۔

”ہیلو!“ مابھا گجر ماوتھ پیس میں بولا۔

”مابھا گجر؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”ہاں۔ بول رہا ہوں۔ تم کون ہو؟“ مابھا گجر بولا۔

”میں رحمن بول رہا ہوں۔ حاجی عبداللہ کا خاص بندہ۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”کیا بات ہے رحمن جی! میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔“ مابھا بولا۔

”یہ بات حاجی عبداللہ کے کانوں تک پہنچ چکی ہے کہ تم گائے کو اٹھا کر لے گئے ہو اور اس وقت تمہاری تحویل میں ہے۔ ہمارے دو آدمی تمہاری کوٹھی پر آ رہے ہیں۔ گائے کو ان کے حوالے کر دو۔۔۔۔۔ صحیح سلامت۔ اگر اس کے جسم پر مار پیٹ کا کوئی ایک نشان بھی نظر آیا تو تم آ سکتے ہو کہ حاجی عبداللہ کس قدر ناراض ہو گا۔“

”حاجی صاحب تو بہت بڑے آدمی ہیں۔ ان سے کہو کہ ہم چھوٹوں کے معاملات میں الجھیں۔ ہمارے آپس کے چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں۔ انہیں ہم اپنے طور پر ہی حل کر لیں گے۔ حاجی صاحب مداخلت نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔“ مابھا گجر نے کہا۔

”میں نے جو کہا وہ شاید تم نے ٹھیک سے نہیں سنا۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”ہمارے آدمی گائے کو لینے کے لئے تمہاری کوٹھی پر آ رہے ہیں۔ گائے کی صحیح سلامت واپسی ہی تمہاری زندگی کی ضمانت ہے۔ اگر گائے کو کچھ ہوا تو تمہاری لاش کے اتنے ٹکڑے کوٹھی میں بکھرے گے کہ کوئی ماہر سے ماہر حساب دان بھی انہیں شمار نہیں کر سکے گا اور تم یہ بات بھی اچھی جانتے ہو کہ حاجی عبداللہ کوئی بات صرف کہتا ہی نہیں اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ ہمارے

روانہ ہو رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ چالیس منٹ میں تمہاری کوٹھی پر پہنچ جائیں گے۔“

مانجھے نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن دوسری طرف سے لائن کٹ دی گئی۔ مانجھے نے ریسیور

مہر رکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگر ساحل پر پہنچ کر وہ لوگ پکڑے گئے تو انجام کیا ہو گا۔

ساحل بظاہر جہاز سے قریب ہی لگتا تھا لیکن وہ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہی ساحل کے قریب پہنچ سکے تھے۔ نوکھانے موٹر بوٹ کی رفتار کم کر دی تھی۔ سناٹے میں بوٹ کے انجن کی پھٹ پھٹ کی آواز چاروں طرف گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی حالانکہ انجن کی آواز اتنی زیادہ نہیں تھی۔ ان چاروں کی نظریں ایک ساحل پر مرکوز تھیں۔ بائیں طرف چٹانوں کے ہیولے سے نظر آ رہے تھے۔ نوکھانے نظریں سرچ لائنوں کی طرح ساحل کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”شارق باؤ۔“ وہ شارق کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے ساحل پر اترنے کے لئے وہ چٹانیں ہی مناسب رہیں گی۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ وہاں ہم فوری طور پر کسی کی نظروں میں نہیں آئیں گے۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”بوٹ کو احتیاط سے اسی طرف لے چلو اور اس بات کا خیال رکھنا کہ کسی ٹان کو ٹکرات مار دینا۔“

”اندھیرا اتنا گرا ہے کہ کچھ نظر نہیں آ رہا۔ ہم خیریت سے چٹانوں کے قریب بھی پہنچ جائیں زحمت ہے۔“ نوکھانے جواب دیا۔

بوٹ کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ چٹانیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ انجن کی آواز کچھ زیادہ ہی شور مچاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا غالباً ان چٹانوں کی وجہ سے تھا جن سے بازگشت سی پیدا ہو رہی تھی۔

موٹر بوٹ بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اب پانی میں ابھری ہوئی چھوٹی چھوٹی چٹانیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ نوکھانے بڑی مہارت سے بوٹ کو ان چٹانوں سے بچاتا ہوا آگے لے جا رہا تھا۔

مزید قریب پہنچے تو انجن کی آواز اس شور میں دب گئی جو لہروں کے چٹانوں سے ٹکرانے سے براہ رہا تھا نوکھانے بڑی مہارت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ بوٹ اب چھوٹی چھوٹی چٹانوں کے بیچ میں لڑائی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ پھر دفعتاً بوٹ ایک چٹانی پتھر سے ٹکرا گئی۔ بوٹ کو ایک زور لگ جھٹکا لگا ٹینے اپنی سیٹ سے گر گئی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ شارق نے لہری سے اسے سنبھال لیا۔ نوکھانے انجن بند کر دیا۔

”شارق باؤ اب آگے نہیں جاسکتے۔“ اس نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سب سے پہلے ڈی کوشا نے اٹھ کر قریبی پتھر پر چھلانگ لگا دی پھر اس نے سارا دے کر

شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

جہاز نظر انداز ہو گیا تھا۔ سامنے بہت دور ساحل پر مدھم سی روشنیاں جھللاتی ہوئی نظر رہی تھیں۔ جہاز کا لیکینڈین کپتان شارق کے ساتھ عرشے کی ریٹنگ کے قریب کھڑا تھا۔ وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”وہ مقط ہے۔ جہاں بہت زیادہ روشنیاں جھللاتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ وہ بندرگاہ ہے۔ لائٹ ہاؤس کی روشنی تو تم دیکھ ہی رہے ہو۔ بائیں طرف روشنیاں بتدریج کم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ تم اپنی موٹر بوٹ کا رخ اسی تاریک ساحل کی طرف رکھو گے۔ مجھے یقین ہے کہ ساحل پر لوگوں کو کہیں نہ کہیں پناہ مل جائے گی اور پھر وہاں سے گوادور تک جانے کا بندوبست بھی تم آہ سے کر سکو گے۔“

”سنا ہے مقط اور گوادور کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ کیا ہم موٹر بوٹ پر گوادور کا رخ نہیں کر سکتے؟“ شارق نے پوچھا۔

”سمندر بھی اس صحرا کی طرح ہے جہاں بھٹک جانے کے بعد زندگی کی امید نہیں کی جا سکتی۔“ کپتان نے کہا۔ ”کسی ماہر طالع کے لئے تو مقط سے گوادور تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں ہو گا لیکن تم لوگ تو سمندری سفر کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے۔ بہتر یہی ہے کہ موٹر بوٹ کو ساحل پر کہیں چھوڑ دینا اور رات گزارنے کے لئے کوئی محفوظ جگہ تلاش کر لینا۔ تمہیں ایسے بہت سے آدمی مل جائیں گے جو معلومہ لے کر تم لوگوں کو گوادور پہنچا دیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم تمہارے مشورے پر عمل کریں گے۔“ شارق نے کہا۔

”یہ کچھ ڈالر ہیں۔ اپنے پاس رکھ لو۔ ویسے یہاں پاکستانی کرنسی بھی کام دے جائے گی۔“ کپتان نے ڈالر کی ایک چھوٹی سی گڈی اس کی طرف بڑھا دی۔ ”اور ایک بات کا اور خیال رکھنا۔ بوٹ کی لائٹ آن کرنے کی کوشش مت کرنا۔ تم لوگوں کے لئے تاریکی ہی بہتر رہے گی۔“

کپتان کے حکم پر موٹر بوٹ سمندر میں اتار دی گئی اور رسی کی سیڑھی کے ذریعے یہ لوگ بوٹ میں پہنچ گئے۔ جہاز کا ایک آدمی بھی ان کے ساتھ بوٹ میں آیا تھا۔ اس نے نوکھانے کو بوٹ کے بارے میں مختصر بتا دیا اور بوٹ کا انجن اشارت کر کے رسی کی سیڑھی کے ذریعے جہاز پر واپس چلا گیا نوکھانے بوٹ کا کنٹرول سنبھال لیا اور بوٹ آہستہ آہستہ جہاز سے دور ہٹنے لگی۔

بوٹ کا رخ تاریک ساحل کی طرف تھا۔ نوکھانے بڑی مہارت سے کنٹرول سنبھالے ہوئے تھا۔ ڈی کوشا نوکھانے کے قریب بیٹھا ہوا تھا اور ٹینے اور شارق دوسری سیٹ پر تھے۔ ٹینے شارق سے چپکی ہوئی تھی۔ ایک انجانا سا خوف اس کے ذہن پر طاری تھا۔ وہ چاروں طرف تاریکی میں گھو

تیز ہوا کی وجہ سے ٹینے کے کپڑے کسی حد تک سوکھ گئے تھے لیکن جوتے اب بھی خاصہ راری محسوس ہو رہے تھے۔ وہ چلتے چلتے رک گئے۔

”میرا خیال ہے ہمیں پہلے کسی منزل کا تعین کر لینا چاہئے۔“ شارق ادھر ادھر دیکھتے ہوئے لہ۔ ”ایسا نہ ہو ہم کسی ایسی مصیبت میں پھنس جائیں جس سے نکلنا ممکن نہ ہو۔“ ”یہ علاقہ ہمارے لئے اجنبی ہے۔ منزل کا تعین کیسے ہو گا۔“ ڈی کوٹا نے کہا۔ ”ایک منٹ۔“ شارق بولا۔ ”تم لوگ یہاں رکو۔۔۔ میں اس ٹیلے پر چڑھ کر دیکھتا ہوں۔“

ناپید کوئی نشان نظر آ جائے۔“

شارق انہیں چھوڑ کر ٹیلے پر چڑھ گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دائیں طرف بہت دور رہم سی روشنیاں جھلملاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اس طرف شہر تھا اور شہر کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ بائیں طرف دیکھنے لگے۔ اس طرف بہت دور ایک جگہ صرف ایک روشنی دکھائی دے رہی تھی جیسے تاریکی میں کوئی ستارہ ٹٹم رہا ہو۔ وہ کچھ دیر تک ادھر دیکھتا رہا۔ قرب و بار میں اور کوئی روشنی نہیں تھی۔ وہ ٹیلے سے اتر کر اپنے ساتھیوں کے قریب آ گیا۔ ”اس طرف صرف ایک جگہ روشنی نظر آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اسی طرف چلنا ہے۔“ شارق نے کہا۔

”کیا یہ رسک والی بات نہیں ہو گی؟“ ڈی کوٹا نے کہا۔

”رسک تو لینا ہی پڑے گا۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”یہ علاقہ ہمارے لئے اجنبی ہے۔ جہاں ہم کسی کو جانتے ہیں اور نہ ہی کوئی ہمیں جانتا ہے ہم کوئی بھی قدم رسک لئے بغیر نہیں اٹھا سکتے۔“

”تو ٹھیک ہے چلو۔“ ڈی کوٹا نے کندھے اچکا دیئے۔

وہ لوگ ٹیلے کے اوپر سے گھوم کر اسی طرف چلے گئے جہاں شارق نے وہ روشنی چمکتے ہوئے دیکھی تھی۔ یہاں سے وہ روشنی نظر نہیں آ رہی تھی لیکن وہ اندازے کی بنا پر اس طرف چلتے رہے۔ تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ روشنی دوبارہ دکھائی دینے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے تیز روشنی کا وہ بلب کسی بہت اونچی جگہ پر لگایا گیا ہو۔ لیکن وہ روشنی اب بھی خاصی دور لگ رہی تھی۔

شارق نے ایک بات خاص طور سے محسوس کی تھی کہ وہ لوگ ساحل سے زیادہ دور نہیں تھے۔ کبھی کبھی تو لہروں کے شور کی آواز بھی سنائی دینے لگتی تھی۔ اس سے شارق نے اندازہ لگایا تھا کہ بلندی پر چمکتی ہوئی وہ روشنی بھی ساحل کے قریب ہی تھی۔

شارق کو پتھر پر کھینچ لیا۔ شارق نے پتھر پر کھڑے ہو کر ٹینے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ بوٹ پاؤں سطح پر مسلسل ہل رہی تھی۔ ٹینے کے لئے کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ پتھر اور بوٹ کے درمیان تقریباً تین فٹ کا فاصلہ تھا ٹینے نے ایک پیر بوٹ کے کنارے پر رکھا۔ اس نے ہاتھ شارق کی طرف بڑھا دیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ شارق اس کا ہاتھ پکڑتا بوٹ کو ایک زور دار جھٹکا لگا کر پیر پھسل گیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ شہر آب پانی میں گر گئی۔

ٹینے مسلسل چیخ رہی تھی۔ نو لکھا اپنی جگہ سے اٹھ کر جلدی سے آگے بڑھا اور اس نے پھرتی سے ٹینے کا ہاتھ پکڑ لیا شارق بھی چھلانگ لگا کر بوٹ پر آ گیا تھا ان دونوں نے ٹینے کو کر پانی سے باہر نکالا۔

ٹینے خوف سے کاپ رہی تھی۔ اس کے لباس سے پانی نچر رہا تھا۔ وہ دونوں اسے دیکھتے کھڑے رہے۔ پھر شارق پتھر پر چلا گیا اور نو لکھا ٹینے کو سہارا دیئے کھڑا رہا۔ شارق نے ٹینے کا ہاتھ پکڑ کر اسے پتھر پر کھینچ لیا۔ اس کے بعد نو لکھا بھی چھلانگ لگا کر پتھر پر آ گیا۔

وہ کچھ دیر اس چٹانی پتھر پر کھڑے رہے پھر آگے بڑھنے لگے۔ ٹینے کے جوتوں میں بھی پانی آ گیا تھا اور بھگے ہوئے کپڑوں کی وجہ سے اس کے لئے چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ایک پتھر دوسرے پتھر پر چھلانگیں لگاتے ہوئے بالا خر چٹان کے ساتھ ہموار جگہ پر پہنچ گئے۔ اس سے آ بھی چھوٹی چھوٹی چٹانیں تھیں اور چٹانوں کا یہ سلسلہ پتہ نہیں کہاں تک چلا گیا تھا۔

وہ ان ٹیلے نما چٹانوں میں چلتے رہے۔ بھگے ہوئے جوتوں اور کپڑوں کی وجہ سے ٹینے کے چلنا اب بہت ہی مشکل ہو گیا تھا۔ بار بار چٹانوں پر اترنے چڑھنے سے اس کی سانس پھول گئی تھی۔ ”مجھ سے اب نہیں چلا جا رہا۔“ ٹینے کہہ رہی تھی۔ ”بھگے ہوئے کپڑے بہت بھاری ہو رہے ہیں۔“

وہ سب رک گئے۔ شارق متحس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”تم اس بڑے پتھر کے پیچھے چلی جاؤ۔“ شارق ایک چٹانی پتھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اپنے کپڑے اتار کر نچوڑ لو اور جوتے بھی صاف کر لینا۔“

ٹینے چند لمے جھکی پھر اس پتھر کے پیچھے چلی گئی۔ وہ تینوں بیٹھے بائیں کرتے رہے۔ آدھے گھنٹے بعد ٹینے واپس آ گئی۔ وہ ایک بار پھر چل پڑے۔ تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کے بعد ٹیلے نما چٹانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آگے ہموار میدان تھا جس میں جھاڑیاں بکثرت ہوئی تھیں۔

ہم میں کہا گیا تھا۔

”رک جاؤ۔“ ڈی کوشا نے کہا۔ ”وہ شخص دھمکی دے رہا ہے کہ اگر ہم نے ایک قدم بھی اچھے بڑھایا تو گولی مار دی جائے گی۔“

وہ چاروں اسی جگہ کھڑے ہو گئے۔ چند منٹ بعد گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا اور دو آدمی باہر آئے ان دونوں کے پاس آٹو جیک رانٹلیں تھیں۔ دونوں شلوار قمیض پہنے ہوئے تھے۔ دونوں کے سروں پر کالے رومال مخصوص انداز میں بندھے ہوئے تھے۔

”کون ہو تم لوگ اور اس طرف کیوں آئے ہو؟“ ان میں سے لمبے قد والے نے بلوچی زبان میں کہا اور باری باری ان چاروں کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہم لوگ اجنبی ہیں۔“ ڈی کوشا نے بلوچی زبان میں رک رک کر جواب دیا۔ وہ بلوچی زبان میں تو پوری طرح لیتا تھا لیکن بولنے میں اسے کچھ دشواری پیش آئی تھی۔ ”ہم مصیبت کے رے ہوئے لوگ ہیں۔ ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

وہ دونوں گن مین انہیں گھورتے رہے پھر لمبے قد والے نے آگے بڑھ کر ان کے لباس پر تپتے۔ وہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ ان کے پاس کسی قسم کا اسلحہ تو موجود نہیں ہے۔ پھر وہ مطمئن ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

”تم لوگوں کے ساتھ اور کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔ اس مرتبہ اس نے اردو میں بات کی تھی کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ صرف ایک آدمی کے علاوہ کوئی بھی بلوچی زبان نہیں سمجھتا تھا۔

”ہم یہی چاروں ہیں۔ ہمارے ساتھ اور کوئی نہیں ہے۔“ اس مرتبہ شارق نے جواب دیا۔ وہ آدمی چند لمحوں کے بعد سوچتا رہا اس کی نظریں بار بار تینوں کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔ تم لوگ اندر آ جاؤ۔ آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ وہ لوگ اندر آ گئے۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہی شارق کی نظریں میں حیرت ابھر آئی۔

احاطے کے بائیں طرف خوبصورت دو منزلہ عمارت تھی۔ اس کے سامنے وسیع اور خوبصورت لان تھا۔ لان کے اختتام پر وسیع و عریض پختہ چوتہ تھا۔ اور اس چوتے کے دوسری طرف ایک کٹھن نہر تھی جو بہت دور تک چلی گئی تھی۔ اس نہر کے دونوں طرف خاصی جگہ چھوڑ کر اونچی دیواریں تھیں۔ یہ نہر خاصی طویل لگتی تھی۔ انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ دراصل سمندری کھاڑی تھی جو خشکی میں خاصی اندر تک چلی گئی تھی اور اس کھاڑی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا تھا۔ چوتے سے چند گز آگے جینسی بنی ہوئی تھی اور سفید رنگ کی ایک خوبصورت لانچ اس جینسی کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ ایک لانچ دور سے اس کھاڑی کے اختتام پر بلکہ یوں

مزید آدھے گھنٹے بعد وہ روشنی کے قریب پہنچ گئے۔ شارق کا یہ خیال درست نکلا تھا کہ دور سے نظر آنے والی وہ روشنی کسی اونچی جگہ پر لگی ہوئی تھی اور اب چند اور روشنیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

وہ ایک وسیع و عریض احاطہ سا تھا۔ چار دیواری پر کئی جگہ بلب روشن تھے۔ یہ غالباً ان احاطے کی عقبی سمت تھی کیونکہ اس طرف کوئی گیٹ کا دروازہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ احاطے کے اندر ایک عمارت بھی نظر آ رہی تھی اور دور سے نظر آنے والا تیز روشنی کا وہ بلب عمارت کی چھت پر ایک اونچے پول پر لگا ہوا تھا۔ انہیں یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی کہ عمارت سمندر کے کنارے پر واقع تھی اور ممکن ہے اس کے دوسری طرف کوئی جینسی وغیرہ بنی ہوئی ہو۔

”کیا خیال ہے۔ عمارت کے سامنے کے رخ پر چلیں۔“ شارق نے کہا۔ اس کا لہجہ سرگوشیا تھا۔

”ظاہر ہے۔ یہاں تک آئے ہیں تو آگے بھی جانا ہی پڑے گا۔ لیکن....“ ڈی کوشا کچھ کہتے رک گیا۔

”لیکن کیا؟“ شارق نے ابھی ہوئی نظریں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اگر یہ عمارت ساحلی محافظوں کی کوئی چوکی ثابت ہوئی تو؟“ ڈی کوشا نے اپنے خدشہ اظہار کر دیا۔

”اوکھلی میں سر تو دے ہی چکے ہیں۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس لئے موملے برداشت کرنا ہی پڑیں گے۔“

”تو پھر چلو۔“ ڈی کوشا نے کہا۔ وہ چاروں دبے قدموں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے گئے۔ دیوار کی لمبائی سے اندازہ لگایا جا

تھا کہ احاطہ خاصا وسیع و عریض تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دوسری طرف مڑ گئے پھر شارق ٹھٹھک کر رک گیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنے ساتھیوں کو بھی رکنے کا اشارہ کر دیا۔

اس طرف احاطے کا گیٹ تھا جہاں تیز روشنی کے بلب جل رہے تھے۔ گیٹ کے سامنے سڑک تھی جو دائیں طرف کیس چلی گئی تھی۔ گیٹ کے سامنے ذرا ہٹ کر ایک سائبان سائبا تھا جس کے نیچے ایک پرانا سا چھوٹا ٹرک کھڑا نظر آ رہا تھا۔

شارق نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ لوگ گیٹ کی طرف چلتے گئے۔ وہ گیٹ قریب پہنچے ہی تھے کہ ایک غراتی ہوئی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔ جو کچھ بھی کہا گیا تھا

”یہ ملا بشریچ گوری کا ڈیرہ ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد لا۔ ”ہم اگر چاہیں تو تم لوگوں کو یہاں کی پولیس کے حوالے کر سکتے ہیں لیکن تم لوگ ملا بشریچ گوری کے ڈیرے تک پہنچ گئے ہو اس لئے تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ بھی وہی کرے گا۔“

”ملا بشریچ گوری!“ ڈی کوٹا یہ نام سن کر چونک گیا تھا۔ ”کیا اس سے ہماری ملاقات ہو سکتی ہے؟“

”وہ اس وقت شہر میں ہے۔ صبح اسے اطلاع کر دی جائے گی اور وہی یہاں آ کر تم لوگوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے گا۔ بوٹ کہاں چھوڑی تھی تم لوگوں نے؟“ وہ شخص سوالیہ نگاہوں سے شارق کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہاں سے تقریباً دو میل دور ساحلی چٹانوں میں۔“ شارق نے جواب دیا۔

وہ شخص چند لمحوں کے بعد سوچتا رہا پھر شینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”تم میرے ساتھ آؤ۔“

”تھک... کہاں...؟“ شینہ کا چہرہ ایک دم دھواں ہو گیا۔

”تمہیں ان لوگوں سے الگ رکھا جائے گا تاکہ تم سب مل کر کوئی گڑبڑ نہ کر سکو۔ تم ان سے الگ رہو گی تو ان کے دماغوں میں بھی کیڑے نہیں کلبلائیں گے۔“

”ہاں... ہاں... ہم لوگ۔“ کچھ نہیں کریں گے۔ مجھے یہیں رہنا ہے۔ اپنے ساتھیوں کے پاس۔“

شینہ ہٹائی۔

”اٹھو۔“ اس شخص کے حلق سے غراہٹ سی نکلی اور اس نے آگے بڑھ کر شینہ کو بازو سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھا دیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ رائفل تانے دروازے میں کھڑا تھا۔

وہ دونوں شینہ کو لے کر باہر نکل گئے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ شینہ کو اوپر والے بل کمرے میں بلے جا کر بند کر دیا گیا۔ لمبے قد والے نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور وہ حویلی سے نکل کر ساحلی چٹانوں کی طرف چلا گیا۔

”یہ لوگ شینہ کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کریں۔“ نوکھا بوڑھلا۔

”میرا خیال ہے یہ لوگ ایسا نہیں کریں گی۔“ ڈی کوٹا نے کہا۔ ”شینہ کو ہم سے اس لئے لے لیا گیا ہے کہ ہم ان لوگوں کے خلاف کوئی سازش نہ کریں۔ اور میرا خیال ہے کہ ہمیں بیان ہونے کی ضرورت ہمیں۔ ملا بشریچ گوری کو جب یہ پتہ چلے گا کہ ہم حاجی عبداللہ کے قتل میں ہیں تو وہ یقیناً ہماری مدد کرے گا۔“

”کیا مطلب!“ شارق نے اسے گھورا۔ ”کیا تم ملا بشریچ گوری کو جانتے ہو؟“

کہنا چاہئے کہ شروع میں نظر آ رہی تھی۔

دونوں گن مین بلوچی تھے اور گواد کے رہنے والے تھے۔ اس وقت یہاں ان دونوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ وہ ان لوگوں کو ایک کمرے میں لے آئے جہاں فرش پر سرخ رنگ کا قالین ہوا تھا اور چند کرسیاں سلیقے سے پڑی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک کافی ٹیبل بھی پڑی تھی۔

”بیٹھو۔“ لمبے قد والے گن مین نے کہا۔ ”اب بتاؤ تم لوگ کون ہو اور اس طرف کی آئے ہو۔ ایک بات یاد رکھنا۔ اگر جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو کلیاب نہیں ہو سکو گے۔ اپنے ذرائع سے معلوم کر لیں گے۔“

”ہمارا تعلق کراچی سے ہے۔“ شارق نے کہا۔ ”ہم کرائے کی ایک لالچ پر تفریح کے نکلے تھے لیکن کھلے سمندر میں ہماری لالچ ایک چٹان سے ٹکرا گئی اور پھر نجانے کس طرح اس میں آگ لگ گئی۔ لالچ کا ناکھدا اس کا ایک ماتحت اور ہمارا ایک آدمی لالچ کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئے۔ انہیں نکلنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ہم لوگوں نے سمندر میں کود کر اپنی جانیں بچائی تھیں ہم کسی نہ کسی طرح اس چٹان تک پہنچنے میں کلیاب ہو گئے۔ پوری رات اور آگلا آدھا دن بے یار و مددگار چٹان پر بیٹھے رہے۔ تین بجے کے لگ بھگ ہم لوگ اس طرف سے گزر ہوئے ایک مال بردار جہاز کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کلیاب ہو گئے۔ جہاز کے عملے نے ہمارے جانیں بچائیں۔ وہ مال بردار جہاز یورپ جا رہا تھا۔ شام کے وقت جہاز کے کپتان نے یہاں سے میل دور گھرے سمندر میں ہمیں ایک موٹر بوٹ پر اتار دیا۔ ہم بڑی مشکل سے ساحل تک سکے ہیں۔ وہ موٹر بوٹ اب بھی یہاں سے تقریباً دو میل دور چٹانوں میں موجود ہے۔ فاصلہ نہیں ہے۔ اگر تم چاہو تو چٹانوں میں موٹر بوٹ کی موجودگی کی تصدیق کر سکتے ہو۔“

”ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔“ گن مین نے شارق کو گھورا۔ ”سمندر تفریح کے لئے زیادہ سے زیادہ چار چھ میل اندر تک جانے کی بات تو مانی جاسکتی ہے لیکن آگ کے لئے سینکڑوں میل دور تک کھلے سمندر میں چلے جانا کچھ عجیب سی بات لگتی ہے۔ تم جس کا بتا رہے ہو وہ کراچی سے تقریباً ڈھائی سو میل دور ہے۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں اور چٹان نہیں ہے۔“

”کیا تمہارا تعلق کسی سرکاری محکمہ سے ہے؟“ شارق نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس شخص نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر یہ کونسی جگہ ہے؟“ شارق نے پوچھا۔

”یہ سب ایک ہی قبیل کے لوگ ہیں۔“ ڈی کوشا نے کہا۔ ”بلوچستان کا یہ ملا بشیر شیخ گور لاہور کا حاجی عبداللہ، کراچی کا سیٹھ ماجد، سرحدی قبائل کے ملک منور، بادشاہ گل خشک اور ملا یعقوب آفریدی.... یہ سب ایک ہی قبیل کے چٹے چٹے ہیں۔ بین الاقوامی اسمگلر.... یہ آپ دوسرے کو جانتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ہم پیالہ وہم نوالہ ہیں۔ ان میں سے کسی ایک پاس کہیں سے بڑی ڈیمانڈ آ جائے اور اس کے اپنے پاس مال موجود نہ ہو تو دوسرے سے لے لیتے ہیں۔ ان عالمی اسمگلروں کے اپنے کچھ قانون اور قاعدے ہوتے ہیں۔ جن پر یہ بڑی سختی کرتے ہیں۔ یہ لوگ پیسے کے لین دین کے بھی کھرے ہیں۔ ایک دوسرے پر اعتماد کر لیتے ہیں؛ کروڑوں ڈالر کا مال دوسرے کے حوالے کر دیں گے۔ فوری ادائیگی کا مطالبہ نہیں کریں گے؛ وہ جانتے ہیں کہ ان کی رقم پہنچ جائے گی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میرے علم میں نہیں ہے کہ حاجی عبداللہ اور ملا بشیر شیخ گوری میں بھی کوئی معاملہ ہے؛ لیکن ایک دو مرتبہ میں نے حاجی عبداللہ سے اس کا نام سنا ہے۔ یہ ایک ہی سمندر کی مچھلیاں اور مل جل کر رہنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔“

”کمال ہے بھئی۔“ نو لکھانے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا تو ڈیڑھ پاؤ کا سودا تھا لیکن پیسوں کے معاملہ میں کبھی ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کیا۔ پھر شارق پاؤ کے پاس پتہ چلا کہ میں تو کنویں کا مینڈک تھا۔ میری معلومات پاؤ ڈیڑھ پاؤ کے سودے تک ہی محدود شارق پاؤ کے پاس آنے کے بعد پتہ چلا کہ میں کنویں سے نکل کر دریا میں آ گیا ہوں جہاں سے پانچ اور دس کلو تک کے سودے ہوتے دیکھے۔ یہاں پیسوں کے لین دین پر بھی ایک دو پر تھوڑا بہت اعتماد دیکھا۔ ابھا گجر جیسے لوگ بھی دیکھے جو پاؤ ڈیڑھ پاؤ پوڈر کے لئے بندے کو کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ اور یہاں..... سمندر میں آ کر تو عجیب ہی انکشاف ہو رہے سمندر واقعی سمندر ہے۔ کروڑوں کا مال ادھر سے ادھر مگر پیسے کی پرواہ نہیں۔“

”پاؤ ڈیڑھ پاؤ کا خیال یہاں بھی رکھا جاتا ہے۔“ ڈمی کوٹھانے کہا۔ ”ساری بات تو پاؤ ڈیڑھ پاؤ کا خیال پر مبنی ہے۔ اگر ایک پڑیا کا حساب نہ رکھا جائے“

منوں اور نمنوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن بات ساری اعتماد کی ہے۔ ہمارے اس مشن پر اب تک لاکھوں روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ اور تم لوگوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ کئی ملین ڈالر کا مال جواز کے پکٹان کے حوالے کر دیا گیا لیکن کسی سے پیسے کی بات نہیں ہوئی۔ پیسہ خود بخود اپنی جگہ پہنچ جائے گا۔ میرا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ کروڑوں کا مال آنکھیں بند کر کے دوسرے کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات کروڑوں ڈوب بھی جاتے ہیں۔ اعتماد اور عدم اعتماد... یہ دونوں چیزیں اس بین الاقوامی کاروبار کی بنیاد ہیں۔ اب شارق کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ کسی بین الاقوامی رابطے میں یہ نام میں نے پہلی مرتبہ سنا تھا۔ حاجی عبداللہ نے جب فون پر مجھے بتایا کہ شارق آ رہا ہے تو میں نے کچھ احتجاج بھی کیا تھا۔ کسی نئے آدمی کو اتنا اوپر لے آنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ شارق اگر چاہتا تو یہ مال غائب کر سکتا تھا۔ مگر حاجی عبداللہ کو شارق پر اعتماد تھا اور شارق کو تم دونوں پر..... اگر اعتماد نہیں تھا تو شارق کو نیٹو وغیرہ پر نہیں تھا۔ ان لوگوں کے بارے میں شارق نے میرے سامنے جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ بالکل درست نکلے۔ لیکن جس طرح ان دونوں کو ٹھکانے لگایا گیا وہ بھی اپنی جگہ ایک اہم بات ہے اور پھر قاسم بیچ میں نپک پڑا۔ انہیں بھی ٹھکانے لگا دیا گیا۔ کراچی سے یہاں تک پانچ بندے مارے گئے لیکن شارق کا مشن کامیاب رہا۔ اس بزنس میں کسی کی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ترجیح مال کو دی جاتی ہے جسے ہر صورت میں منزل پر پہنچانا ہوتا ہے۔ اس کے لئے کتنے لوگوں کی زندگیاں قربان کی جاتی ہیں اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی جاتی۔“

”اور بھائی ڈکٹو۔“ نوکھانے اس کے نام کی ریڑھ لگاتے ہوئے کہا۔ ”پر اب اپنا کیا بنے گا؟ اگر اس ملا بشیر بیچ گوری نے حامی عبداللہ کو پہچانے ہی سے انکار کر دیا تو کیا ہو گا؟“

”ڈرتے ہو؟“ ڈی کوٹانے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”میں موت سے نہیں ڈرتا۔ شارق یہ بات اچھی طرح جانتا ہے۔ موت کا تو ایک وقت مقرر ہے۔ وہ نہ ایک منٹ پہلے آ سکتی ہے اور نہ ایک منٹ بعد میں۔ لیکن بھائی ڈکوتا۔“ نوکھانے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”موت کی کوئی وجہ بھی تو ہوتا۔ اگر لالچ پر قاسم کے آدمیوں یا میٹو کے ہاتھوں مارا جاتا تو کوئی پرواہ نہ ہوتی۔ لیکن دیکھو تا۔ سارے کام نمٹ نمٹا جانے کے بعد ہمیں یہاں قتل کر دیا جائے تو افسوس تو ہو گا تا۔“

”ہاں۔ یہ بات تو ہے۔“ ڈی کوٹا نے کہا۔ ”لیکن اطمینان رکھو۔ یہاں موت کا خوف ذہن پر نہیں رکھنا چاہئے۔ اگر ملا بشیر بیچ گوری، حاجی عبداللہ کو پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے اور ہماری کسی بات کا یقین نہیں کرتا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ ہمیں حکام کے حوالے کر دے گا اور ہمارے

خلاف غیر قانونی طور پر اس ریاست کی سرحد میں داخل ہونے کا مقدمہ چلے گا اور تین چار مہینوں کی سزا ہو جائے گی اور بس۔“

”پھر تو کوئی بات نہیں۔“ نوکھانے اس طرح گرا سانس لیا جیسے سر سے کوئی بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ ”سرکاری مہمان خانوں میں آمد و رفت کے تو ہم عادی ہیں۔ سنا ہے باہر کی ملکوں کی جیلیں بھی بڑی شاندار ہوتی ہیں۔“

”لیکن عرب اور خلیجی ممالک کی جیلیں دنیا کی دوسری جیلوں سے ذرا مختلف ہیں۔“ ڈی کوسٹا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کبھی تو یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی کو جیل میں ڈال کر بھول جاتے ہیں اور بیچارہ ساری زندگی جیل میں پڑا رہتا رہتا ہے۔“

”تم تو ڈرا رہے ہو بھائی ڈکوتا۔“ نوکھانے کہا۔ ”پہلے ہی بھوک سے جان نکلی جا رہی ہے۔ کم بخت! یہ لوگ ہمیں کمرے میں بند کر کے بھول تو نہیں گئے۔“

”نہیں۔ یہ لوگ ہمیں نہیں بھولیں گے۔“ ڈی کوسٹا نے کہا۔ ”ذرا اٹھ کر زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑاؤ۔ دیکھو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔“

نوکھانے اٹھ کر دروازے کے قریب آگیا اور اسے زور زور سے دھڑ دھڑانے لگا چند سیکنڈ بعد ہی دروازہ کھلا اور وہی لمبے قد والا گن مین اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر کرختگی تھی۔

”کیا بات ہے کیوں شور مچا رہے ہو؟“ اس کے لمبے میں بھی کرختگی تھی۔

”ہم تمہارے مہمان ہیں۔ اور سنا ہے بلوچ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں لیکن تم نے تو ہمیں پانی تک کو نہیں پوچھا۔ ارے بھائی صاحب! بھوک لگ رہی ہے بڑے زور کی۔“ نوکھانے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”بلوچ تو اپنے دشمن کو بھی بھوکا نہیں مرنے دیتے اور تم لوگوں کے بارے میں تو ابھی فیصلہ نہیں ہوا کہ دوست ہو یا دشمن۔ میں تم لوگوں کے لے کھانا لے کر آتا ہوں مگر تھوڑا دیر لے گا۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”اس لڑکی کو بھی کھلا دینا۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ رات بھر بھوکی بیٹھی رہے۔“ نوکھانے کہا۔

”فکر مت کرو۔ اس کو بھی کھلا دے گا۔“ اس شخص نے جواب دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

کھانا انہیں تقریباً ایک گھنٹے بعد مل سکا تھا۔ انڈے کا آلیٹ اور توتے پر پکی ہوئی موٹی موٹی آڑھی ترچھی روٹیاں۔ ظاہر ہے انڈے کا آلیٹ اور یہ روٹیاں ان دونوں میں سے کسی نے پکاؤ تھیں۔ کھانا لے کر وہ دونوں آئے تھے۔ لمبے قد والے نے رائفل تان رکھی تھی اور دوسرا آدمی نے کھانا اٹھا رکھا تھا جسے میز پر رکھ دیا گیا۔

”اپنا نام تو بتا دو یار۔ ہم کوئی تمہارے دشمن تو نہیں ہیں۔“ نوکھانے لمبے قد والے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرا نام واجہ رحیم بخش ہے۔ اور یہ محمد دین ہے۔“ لمبے قد والے نے تعارف کرا دیا۔ محمد دین پانی کا جگ اور دو گلاس بھی لے آیا تھا۔ نوکھانے پوچھنے پر واجہ رحیم بخش نے بتایا کہ لڑکی کو بھی کھانا دے دیا گیا ہے۔

”اسے ہمارے پاس ہی رہنے دو تا یار واجہ رحیم بخش۔ وہ بیچاری الگ تھلگ قید میں ڈرتی رہے گی۔“ نوکھانے کہا۔

”اسے ضمانت کے طور پر تم لوگوں سے الگ رکھا گیا ہے تاکہ تم لوگ ہمارے خلاف کوئی سازش نہ کر سکو۔“ واجہ رحیم بخش نے کہا۔ ”ویسے تمہیں اس کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو کچھ نہیں ہو گا اور ہاں... تم لوگوں کا موٹر بوٹ ہم لوگوں کو مل گیا ہے۔ اسے ہم اپنی جینسی پر لے آئے ہیں۔“

”تو پھر ملا بشریچ گوری کو بھی ہمارے بارے میں اطلاع کر دو نا۔ میرا خیال ہے یہاں ٹیلی فون تو ہو گا۔“ نوکھانے کہا۔

”یہاں ٹیلی فون ہے اور ملا بشریچ گوری کو اطلاع دے دی گئی ہے۔ وہ صبح سویرے یہاں آ جائے گا۔“ واجہ رحیم بخش نے جواب دیا۔

”پترا! تو میرے ہاتھ لگ گیا تو تیرا تو میں واجہ وجا دوں گا۔“ نوکھانے بڑبڑاتے ہوئے یہ جملہ پنجابی زبان میں کہا تھا جسے واجہ رحیم بخش نہیں سمجھ سکا تھا۔

وہ لوگ کھانا کھا چکے تو محمد دین نے برتن اٹھائے اور دروازہ ایک بار پھر بند کر دیا گیا۔ یہ لوگ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر قالین پر لیٹ گئے۔ ڈی کوسٹا تو تھوڑی دیر بعد سو گیا مگر شارق اور نوکھانے ایک دوسرے کے قریب لیٹے سرگوشیاں کرتے رہے۔ شارق کو ٹمین کی فکر تھی۔ اسے نجانے اس وسیع و عریض عمارت کے کس حصے میں رکھا گیا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

”اگر انہوں نے ٹمینہ بمن کے ساتھ کوئی زیادتی کی تو میں ان میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ نوکھانے ٹھوس لمبے میں کہا۔

رات دھیرے دھیرے بتتی رہی۔ اور پھر یہ دونوں بھی نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔ پھر دفعتاً کسی گاڑی کی آواز سن کر شارق کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پہلے انجن کو ریس دی گئی تھی پھر اسے آف کر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کا دروازہ کھلنے اور

بند ہونے کی آواز سنائی دی تھی۔ شارق اٹھ کر دروازے کے قریب آگیا اور دو پنوں کے درمیان باریک سی جھری سے جھانک کر باہر دیکھنے لگا۔ فضا میں طلوع ہوتے ہوئے دن کا ہلکا سا اجالا تھا۔ دو آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان میں واجہ رحیم بخش کی آواز شارق نے پہچان لی تھی لیکن دوسری آواز اس کے لئے اجنبی تھی۔ وہ لوگ بلوچی زبان میں باتیں کر رہے تھے اور ایک لفظ بھی شارق کے پلے نہیں پڑا تھا۔

شارق نے ڈی کوسٹا اور نوکھٹا کو جگا دیا اور سرگوشی میں انہیں بتانے لگا کہ شاید ملا بشیر بخش گوری آگیا ہے۔ وہ دونوں بھی دروازے کے قریب آکر باتیں سننے کی کوشش کرنے لگے مگر آوازیں وہاں سے بہت دور جا چکی تھیں۔

یہ تینوں قالین پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ قدموں کی آواز سنائی دی جو دروازے کے سامنے آکر رک گئی۔ اس کے چند سیکنڈ بعد دروازہ کھل گیا اور واجہ رحیم بخش اندر داخل ہوا۔ وہ سمجھا تھا کہ یہ لوگ سو رہے ہوں گے لیکن انہیں جاگتے پا کر بھی اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔

”ملا بشیر بخش گوری آگیا ہے۔ چلو بلایا ہے تم لوگوں کو۔“ واجہ رحیم بخش نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ تینوں اٹھ کر کمرے سے باہر آگئے۔ محمد دین بھی برآمدے کے سامنے لینڈ کروزر کے پاس آٹو بیک رانفل لئے کھڑا تھا۔ لینڈ کروزر کا ڈرائیور لان میں گھاس پر ٹانگیں پارے بیٹھا تھا۔ اس نے بھی شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور سر پر سیاہ ریشمی رومال بندھا ہوا تھا۔

واجہ رحیم بخش ان تینوں کو لے کر ایک اور کمرہ میں آگیا۔ اس کمرے میں بھی دبیز قالین بچھا ہوا تھا لیکن یہاں کرسیاں یا صوفے وغیرہ نہیں تھے۔ گاؤں تکتے اور خوبصورت کشن جگہ جگہ رکھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ سامنے دیوار کے قریب سرخ کور والے گاؤں تکتے سے ایک آدمی ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ فریہ جسم چھوٹی گولی داڑھی جس میں کچھ سفید بال بھی چمک رہے تھے۔ سوسی قسم کے دھاری دار کپڑے کا لمبا جودہ اور سیاہ ریشمی رومال جس کے بارڈر پر سرخ دھاریاں تھیں، مخصوص انداز میں سر پر بندھا ہوا تھا۔ آنوسی رنگت پر موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے سفید دانت بڑے عجیب لگ رہے تھے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں موٹے موٹے سرخ دانوں والی تسبیح تھی۔ وہ گاؤں تکتے سے اس طرح ٹیک لگائے بیٹھا تھا کہ ایک گھٹنا اوپر اٹھا ہوا تھا تسبیح والا ہاتھ گھٹنے پر ٹکا ہوا تھا۔ تسبیح کے سرخ دانے آہستہ آہستہ گھوم

ہے تھے۔

وہ ملا بشیر بخش گوری تھا۔

وہ تینوں اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اور واجہ رحیم بخش بلوچی میں ملا بشیر بخش گوری کو کچھ بتا رہا تھا۔ لیکن ملا بشیر بخش گوری کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ اس کی باتیں نہ نہ رہا ہو۔ وہ گہری نظروں سے باری باری ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم لوگ یہاں کیسے پہنچے؟“ بلاخر ملا بشیر بخش گوری نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں عجیب سی سرراہٹ تھی۔

”ہم لوگ کراچی سے کرائے کی ایک لانچ پر تفریح کے لئے....“

”میں نے کوئی داستان سننے کے لئے نہیں کہا تھا۔“ ملا بشیر بخش گوری نے شارق کی بات لٹ دی۔ ”مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم لوگ جمعرات کی شب نور چاچا کی لانچ پر کراچی کے اطل سے روانہ ہوئے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ چٹان کے قریب اس لانچ کو آگ لگ گئی تھی یا لگائی گئی تھی۔ مجھے کوئی قصہ سننے کی ضرورت نہیں۔ میں نے پوچھا تھا یہاں تک بے پہنچے؟“

”ایک مال بردار جہاز نے ہماری جانیں بچائی تھیں۔“ شارق نے جواب دیا۔ اسے یہ جان کر ی حیرت ہوئی تھی کہ ملا بشیر بخش گوری کو ان باتوں کا پتہ کیسے چل گیا تھا۔ لانچ میں آگ لگنے کے رے میں تو ہو سکتا ہے اسی جہاز کے کپتان نے کراچی کی بندرگاہ کو اطلاع دی ہو۔ سمندری زندگی سے تعلق رکھنے والوں کو ایسی باتوں کا فوراً پتہ چل جاتا ہے لیکن اسے یہ کیسے پتہ چلا کہ یہ لوگ نور چاچا کی لانچ پر جمعرات کی شب ساحل سے روانہ ہوئے تھے؟ یہ شخص یقیناً اور بھی بہت کچھ جانتا ہو گا۔ اس لئے شارق محتاط ہو گیا تھا۔ ”وہ جہاز ہمیں یہاں سے کئی میل دور ایک موٹر بوٹ اتار کر چلا گیا۔ جہاز کے کپتان نے کہا تھا کہ ہمیں یہاں پناہ مل جائے گی۔“

”پناہ؟“ ملا بشیر بخش گوری کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آگئی۔ ”یہاں موت بھی تم لوگوں کا مقدر بن سکتی ہے۔ چلو... اس حد تک مان لیتا ہوں کہ تم لوگ کسی جہاز سے موٹر بوٹ پر آئے تھے۔ لیکن موٹر بوٹ کا رخ کسی اور طرف کیوں نہیں ہوا۔ میرے ڈیرے کی طرف آنے کا قصد کیا تھا؟ میں سچ جانتا چاہتا ہوں؟“

وہ تینوں کانپ کر رہ گئے۔ انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ملا بشیر بخش گوری کسی غلط فہمی کا کار ہو گیا تھا۔ کہیں وہ یہ تو نہیں سمجھ رہا کہ یہ لوگ کسی بری نیت سے اس کے ڈیرے کی طرف آئے تھے اور پکڑے گئے تھے۔ ایسی صورت میں موت ہی ان کا مقدر بن سکتی تھی۔ شارق نے

کن انکھوں سے ڈی کوشا کی طرف دیکھا۔

”واجہ بیچ گوری۔“ ڈی کوشا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔ ”سچ بات تو یہ ہے کہ ہم لوگ حاجی عبداللہ کے آدمی ہیں۔“

”حاجی عبداللہ..... لاہور والا۔“ ملا بشیر بیچ گوری کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

”جی واجہ۔“ ڈی کوشا نے کہا۔ ”ہم لوگ ایک اہم کام سے نکلے تھے لیکن سمندر میں اس چٹان کے قریب پہنچ کر ہمیں دھوکے سے قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی دوران نجانے کس طرح لالچ کو آگ لگ گئی اور ہم بڑی مشکل سے اپنی جانیں بچا سکے۔“

”اس میں مجھے اب بھی تھوڑا سا جھوٹ نظر آ رہا ہے۔“ ملا بیچ گوری نے ڈی کوشا کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا اور پھر نو لکھا اور شارق کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ سچ ہے واجہ۔“ ڈی کوشا نے کہا۔ ”ٹیلی فون آپ کے پاس موجود ہے۔ حاجی عبداللہ آپ کا دوست ہے۔ آپ چاہیں تو تصدیق کر سکتے ہیں۔“

”وہ تو میں کر ہی لوں گا۔“ ملا بشیر بیچ گوری نے کہا۔ ”لیکن لالچ میں آگ لگ جانے والی بات حلق سے نہیں اترتی۔“

”لالچ کو آگ ہم نے خود لگائی تھی۔“ اس مرتبہ شارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ ملا بشیر بیچ گوری نے اسے گھورا۔

”یہ تاثر دینے کے لئے کہ لالچ کے ساتھ اس کے مسافر بھی ختم ہو چکے ہیں۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”نورود چاچا کے بیٹے قاسم نے ہمیں دھوکے سے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے ایک رات پہلے بھی لالچ پر ہنگامہ ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ کرائے کے دو آدمی تھے انہیں کسی طرح پتہ چل گیا کہ لالچ میں کیا ہے۔ پہلے انہوں نے ہمیں ٹھکانے لگانے کی کوشش کی لیکن خود ہی مچھلیوں کی خوراک بن گئے۔ پھر قاسم نے مجھے بلیک میل کرنا چاہا اور بعد میں ہمیں قتل کرنے کی کوشش کی.... یہ کلوروبار ہی ایسا ہے۔ یہاں انسانی زندگی کوئی وقعت نہیں۔ اگر ہم بھی قتل ہو جاتے تو شاید کسی کو افسوس نہ ہوتا۔“

”اور تم جانتے ہو کہ قتل کی سزا بھی موت ہوتی ہے۔“ بیچ گوری نے کہا۔

”یہ ریاست ہم پر قتل کا مقدمہ نہیں چلا سکتی۔“ شارق نے کہا۔ ”لالچ پر جو کچھ بھی ہوا پاکستان کی سمندری حدود میں ہوا تھا۔ اور کوئی بھی اس واقعہ کا چشم دید گواہ نہیں ہے۔ سمندر میں حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ جہاں تک اس ریاست کا تعلق ہے تو میں یہ اعتراف ضرور کروں گا کہ ہم غیر قانونی طور پر اس کی حدود میں داخل ہوئے ہیں اور اس ریاست کے قانون کے مطابق ہمیں

صرف اسی جرم کی سزا مل سکتی ہے۔“

”دلیر آدمی ہو۔“ ملا بشیر بیچ گوری اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ پھر رحیم بخش کی طرف رخ کر کے کچھ کہا۔

رحیم بخش نے کمرے کے کونے میں رکھا ہوا ٹیلی فون اٹھا کر ملا بشیر بیچ گوری کے سامنے رکھ کر بیچ گوری نے ریسیور اٹھایا۔ نمبر ڈائل کئے۔ چند لمحے تیز لہجے میں کسی سے بات کرتا رہا پھر ریسیور رکھ دیا اور شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”دلیر آدمی ہو.... اور میں بہادروں کی قدر کرتا ہوں۔“

شارق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تقریباً تین منٹ بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ملا بشیر بیچ گوری نے ریسیور اٹھالیا۔ ہیلو کہہ کر چند لمحے انتظار کیا پھر اردو میں کسی سے بات کرنے لگا۔ ان تینوں نے چروں پر طمانیت سی آگئی۔ ملا بشیر بیچ گوری دوستانہ لہجے میں ٹیلی فون پر حاجی عبداللہ سے بات رہا تھا۔ فون پر بات کرتے ہوئے وہ باری باری ان تینوں کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ریسیور رکھ دیا اور ایک بار پھر باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم تینوں میں شارق کون ہے؟“

”شارق میرا نام ہے۔“ شارق نے جواب دیا۔

”آفرین ہے۔“ ملا بشیر بیچ گوری نے کہا۔ ”آؤ بیٹھو.... بیٹھو تم لوگ۔ حاجی عبداللہ نے بتایا ہے کہ تم پہلی مرتبہ کسی ایسے مشن پر بھیجے گئے ہو۔ لیکن تم نے جس طرح امانت کی حفاظت کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ قاسم نے تمہارے ساتھ دھوکا کیا تھا اسے مر ہی جانا چاہئے تھا۔“

”مجبوری تھی۔“ شارق نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اگر ہم انہیں نہ مارتے تو وہ لے ہمیں مار دیتے۔ کسی کے اعتماد کو نہیں پہچانا میری فطرت میں شامل نہیں ہے۔ حاجی عبداللہ نے مجھ پر اعتماد کیا تھا۔ امانت کی حفاظت کے لئے میری جان بھی چلی جاتی تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔“

”آفرین۔“ ملا بشیر بیچ گوری نے کہا پھر بولا۔ ”تم لوگ رحیم بخش کے ساتھ جاؤ.... منہ ہاتھ نو۔ اپنا حلیہ درست کرو اور رحیم بخش۔“ وہ رحیم بخش کی طرف دیکھنے لگا۔ ”ان کے لئے ناشتے لانے کا بندوبست کرو۔ یہ ہمارے مہمان ہیں انہیں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔“

”جی واجہ۔“ رحیم بخش نے جواب دیا۔

”واجہ! نو لکھا، ملا بشیر بیچ گوری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہمارے ساتھ ایک....“

”وہ لڑکی بھی تمہارے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرے گی۔ فکر مت کرو۔“ ملا بشیر بیچ گوری نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات کاٹ دی۔

وہ تینوں واجہ رحیم بخش کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئے۔

ایک گھنٹے بعد وہ ایک بار پھر ملا بشیر بچ گوری کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس مرتبہ ان کے ساتھ ثینہ بھی تھی۔ ان کے سامنے قالین پر دسترخوان بچھا ہوا تھا اور محمد دین ناشتہ لگا رہا تھا۔ ناشتے کے بعد برتن اور دسترخوان اٹھایا گیا تو ملا بشیر بچ گوری شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اب بتاؤ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو؟“

”ہم پاکستان واپس جانا چاہتے ہیں۔“ شارق نے کہا۔ ”آپ کی لائیں تو گوارہ تک آتی جاتی رہتی ہیں۔ ہمیں بھی اپنی کسی لالچ پر بھجوا دیں۔ اگر کسی اور کی لالچ میں بھی بندوبست ہو جائے تو ہم معاوضہ دینے کو تیار ہیں۔“

”ہمیں کسی اور کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ملا بشیر بچ گوری نے کہا۔ اس کی انگلیاں بدستور تسبیح کے موتیوں پر چل رہی تھیں۔ ”میری ایک لالچ گوارہ گئی ہوئی ہے۔ وہ ایک دو دن تک آجائے گی تو میں تم لوگوں کو بھجوا دوں گا۔ تم لوگ دو تین دن یہاں رہو۔ ہمارے مہمان بن کر۔ تم لوگوں کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا ہو گا کہ تم لوگ دن کے وقت اس حویلی کے گیٹ سے باہر نہیں نکلو گے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی تم لوگوں کو دیکھ لے تو معاملہ گڑبڑ ہو جائے۔“

”دو تین دن!“ شارق بولا۔

”ہاں مجبوری ہے۔“ ملا بشیر بچ گوری نے کہا۔ وہ چند لمحوں خاموش رہا پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔ موقع ملا تو شام کو چکر لگاؤں گا۔ شرم میں میری مصروفیت اتنی ہے کہ سر کھانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔“

وہ چاروں بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئے۔ ڈرائیور برآمدے میں کھڑا تھا۔ وہ بچ گوری کو دیکھ کر لینڈ کروزر کی طرف لپکا۔ واجہ رحیم بخش نے بھی جلدی سے آگے بڑھ کر ملا بشیر بچ گوری کے لئے لینڈ کروزر کا دروازہ کھول دیا۔

”رحیم بخش۔“ بچ گوری گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے رحیم بخش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ واجہ۔ ان کا خیال رکھنا..... مہمان ہیں ہمارے۔ بہت دور سے آئے ہیں۔ کوئی تکلیف نہ ہونے پائے ان کو۔“

”جی واجہ۔ آپ فکر نہ کریں۔“ رحیم بخش نے جواب دیا۔

ملا بشیر بچ گوری سیٹ پر بیٹھ گیا رحیم بخش نے دروازہ بند کر دیا۔ بچ گوری نے ان کی طرف

کر ہاتھ ہلایا اور لینڈ کروزر حرکت میں آگئی۔

دھوپ پھیل رہی تھی۔ یہ لوگ برآمدے میں کھڑے ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ لان کے ارد گرد کے کی صورت میں ناریل کے درخت لگے ہوئے تھے۔ لان بڑا خوبصورت تھا۔ گھاس خاصی ختمی اور کیاریوں میں لگے ہوئے پودوں پر رنگ برنگے پھول بھی مسکرا رہے تھے۔ لان کو دیکھ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔

ثینہ اور شارق برآمدے سے نکل کر لان میں آگئے اور پھر اس چوترے کی طرف بڑھنے جس کے دوسری طرف کھاڑی تھی اور سفید لالچ اس کھاڑی میں کھڑی تھی۔ وہ چوترے کے پختہ روش پر آگے بڑھتے رہے۔ محمد دین نے اگرچہ انہیں اس طرف جاتے دیکھا تھا مگر انہیں نہ یا روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ملا بشیر بچ گوری سے ملاقات کے بات ان دونوں کا رویہ لیا تھا۔ اب وہ بڑے احترام سے ان سے بات کرتے تھے۔

وہ دونوں پلیٹ فارم نما روش پر چلتے ہوئے کھاڑی کے آخری سرے پر آگئے۔ دراصل یہ شروع ہی یہاں سے ہوتی تھی۔ سمندر کا ایک کشادہ کٹاؤ تھا جو اندر تک چلا گیا تھا۔ ممکن نہ کٹاؤ پہلے اتنا طویل نہ ہو اور بعد میں زمین کی کھدائی کر کے اسے بھی کھاڑی کے ساتھ کر لیا گیا ہو۔

یہ کھاڑی کا دہانہ تھا جو تقریباً سو فٹ چوڑا تھا۔ دہانے پر ایک بہت لمبے آہنی پائپ کا بیریز لگا ہوا تھا۔ دائیں طرف دیوار کے قریب ایک ستون کے ہک میں موٹا سارہ لپٹا ہوا تھا۔ اس سے لے دینے سے پائپ اوپر اٹھ جاتا اور کسی لالچ یا کشتی کی آمد و رفت کے لئے راستہ کھل جاتا۔ دہانے کے قریب بیریز کے اندر کی طرف ایک بہت بڑی لالچ لنگر انداز تھی۔ جسے دیکھ کر ہوتا تھا کہ یہ لالچ اب اس قدر پرانی ہو چکی تھی کہ اب شاید استعمال کے قابل نہیں رہی لیکن حقیقت یہ تھی کہ بظاہر کباڑ نظر آنے والی یہ لالچ بھی اسمگلنگ کے کاروبار میں اکثر و نہال ہوتی رہتی تھی۔ اس لالچ کے پہلو میں بائیں طرف وہ موٹر بوٹ بھی ایک رے کے جینسی سے بندھی ہوئی تھی جس پر وہ لوگ گزشتہ رات جہاز سے چٹانوں تک پہنچے تھے۔

دونوں وہاں کھڑے بہت دیر تک سمندر کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر دھوپ چھینے لگی تو ان کے لئے مڑ گئے۔ دور سے یہ عمارت بڑی خوبصورت لگ رہی تھی عمارت کے دائیں طرف ایک سی مسجد بھی تھی۔ صرف ایک کمرہ تھا جس کے دائیں طرف ایک چھوٹا سا مینار بنا ہوا تھا۔ والے اس کمرے کے سامنے ایک مختصر سا پختہ صحن بھی تھا وہ دونوں شلتے ہوئے دوسری طرف لے گئے۔ یہاں الگ تھلک گودام نما کمرے بنے ہوئے تھے جن کے دروازے خاصے مضبوط

”اور یہ دو تین دن ہم یہاں قید میں رہیں گے۔“ نوکھا بولا۔

”مجبوری ہے۔“ شارق نے کندھے اچکا دیئے۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”شکر کرو کہ ہم وہیں۔ اپنی مرضی سے اس وسیع و عریض احاطے میں گھوم پھر سکتے ہیں۔ اگر کہیں پکڑے جاتے ہیں کی چھوٹی سی کوشری میں بند ہوتے اور تم دروازے کی آہنی سلاخوں کو دونوں ہاتھوں میں بے ہیر وارث شاہ یا مایا گا رہے ہوتے۔“

”ہاں بھائی.... یہ بات تو ہے۔“ نوکھا نے کہا۔ ”لیکن اس طرح یہاں بیٹھے بیٹھے تو ہم تختے طرح اکڑ جائیں گے۔“

”شہر.... ہمیں وقت گزارنے کے لئے اپنے لئے کوئی دلچسپی تلاش کرنی ہوگی۔ میں واجہ ہم بخش سے پوچھتا ہوں۔ تاش وغیرہ مل جائے تو کام بن سکتا ہے۔“ شارق کہتے ہوئے اٹھ کر رے سے باہر نکل گیا۔

پندرہ منٹ بعد واپس آیا تو اس کے پاس بوسیدہ سے تاش تھے۔ وہ چاروں بیٹھ کر تاش کھیلنے لگے۔ اس طرح وقت گزارنے میں کچھ آسانی ہو گئی۔

وہ دن بھر تاش کھیلے رہے۔ دوپہر کا کھانا بھی انہوں نے اسی کمرے میں کھایا تھا۔ شام سے پہلے وہ لان میں آکر بیٹھ گئے۔ چائے بھی انہوں نے یہیں بیٹھ کر پی تھی۔

شام کا اندھیرا پھیلنے میں ابھی تھوڑی دیر تھی کی فضا میں پھٹ پھٹ کی مدھم سی آواز سنائی دینے لگی۔ ان چاروں نے بیک وقت آسمان کی طرف دیکھا۔ آواز ہیلی کاپٹر سے کچھ ملتی جلتی تھی۔ ان صاف آسمان پر دور دور تک ہیلی کاپٹر کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر دفعتاً یوں لگا کہ وہ آواز سمندر کی طرف سے آرہی ہو۔

”میرا خیال ہے کوئی موٹر بوٹ ہے۔ تم لوگ یہیں بیٹھو۔ میں دیکھتا ہوں۔“ شارق کہتے ہوئے اٹھ کر کھاڑی کے دہانے کی طرف چل پڑا۔

پرانی لانچ کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا اور سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ بائیں طرف سے ایک لڑوٹ آتی ہوئی نظر آئی جس پر دو آدمی تھے۔ ان کے جسموں پر وردی تھی جس سے اندازہ لجا سکتا تھا کہ ان کا تعلق کسی سرکاری ادارے سے تھا۔ شارق لانچ کی آڑ میں ہو گیا۔ اس نے ہٹ کر بھی دیکھا تھا۔ واجہ رحیم بخش ثمنہ وغیرہ کو ایک کمرے کی طرف لے جا رہا تھا۔

شارق ایک بار پھر سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک آدمی اب بوٹ میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس بوٹ میں اڑسا ہوا ریوالبور بھی صاف نظر آ رہا تھا۔

”واجہ! میں تم کو ادھر ڈھونڈ رہا ہوں اور تم یہاں کھڑے ہو۔ وہ لوگ تمہیں دیکھ لیں گے تو

تھے۔ وہ کچھ دیر ادھر ادھر ٹہکتے رہے اور پھر واپس آ گئے۔ نوکھا اور ڈی کوشا برآمدے میں بیٹھ گئے۔ کسی کمرے میں جا چکے تھے۔ وہ دونوں انہیں تلاش کرتے رہے لیکن وہ کسی کمرے میں تو نہیں آئے۔ اسی وقت رحیم بخش ادھر سے گزرا تو شارق نے اسے روک لیا۔

”ہمارے ساتھی کہاں گئے واجہ؟“ اس نے پوچھا۔ ڈی کوشا سے اسے پتہ چل گیا تھا کہ بل کسی کو احترام سے بلانے کے لئے واجہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جیسے جناب یا بھائی صاحب وغیرہ۔ ”وہ لوگ اوپر کمرے میں ہیں۔“ رحیم بخش نے جواب دیا۔ ”آپ لوگ بھی گھومو پھرو۔ مگر واجہ حویلی کے گیٹ سے باہر مت جانا۔ نہیں تو ہماری شامت آ جائے گی۔“

”فکر مت کرو۔ ہم لوگ حویلی سے باہر نہیں جائیں گے۔“ شارق نے جواب دیا۔ وہ لوگ اوپر کی منزل پر آ گئے۔ بظاہر چھوٹی نظر آنے والی یہ عمارت خاصی وسیع تھی۔ کمرے تھے۔ دوسری منزل کے اوپر بھی ایک گول کمرہ بنا ہوا تھا۔ اس کمرے میں چاروں طرف چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک طرف سے دور تک سمندر دکھائی دے رہا تھا اور دوسری طرف جزیرے کا اندرونی علاقہ۔ شارق اور ثمنہ ایک کھڑکی کے سامنے کھڑے دیر تک باہر رہے۔ ریگستانی علاقہ تھا اور بھول یا اسی قسم کی جھاڑیاں بکثرت نظر آرہی تھیں۔

وہ لوگ اس گول کمرے سے نکل کر دوسری منزل پر آ گئے اور بالآخر ایک کمرے میں آ گئے۔ نوکھا اور ڈی کوشا نظر آ گئے۔ وہ قالین پر ٹانگیں سپارے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شارق اور بھی ان کے قریب بیٹھ گئے۔

”معلوم ہوتا ہے کہ انہیں قالین کہیں سے مفت میں مل گئے تھے۔ ہر کمرے میں قالین قالین بچھے ہوئے ہیں۔“ نوکھا نے کہا۔ ”اور تو اور دیواروں پر بھی قالین لٹکے ہوئے ہیں۔ وہ کتنی خوبصورت سیزی بنی ہوئی ہے اس قالین پر۔“

شارق دیوار پر لٹکے ہوئے قالین کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ قالین چھ فٹ لمبا اور چار فٹ تھا جس پر کسی مغلستان کی سیزی بنی ہوئی تھی۔ اس قسم کے قالین وہ مختلف کمروں میں دیکھ چکا تھا۔ یہ افغانی اور ایرانی قالین تھے جو آرائش کے لئے خصوصی طور پر تیار کئے جاتے تھے۔

نوکھا کی بات پر کسی نے تبصرہ نہیں کیا تھا۔

”اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ لوگ ہمیں یہاں سے کب جانے دیتے ہیں۔“ اس مرتبہ بھی ہی نے لب کشائی کی تھی۔

”ملا بیشر بیچ گوری نے کہا تو ہے کہ دو تین دن میں ہمیں یہاں سے بھیج دے گا۔ او خیال ہے ہمیں اس کی بات پر یقین کر لینا چاہئے۔“ شارق نے جواب دیا۔

”ارے واج! تم قدم تو آگے بڑھاؤ۔ پھر دیکھو میں تمہیں قانون کا کیسا تماشہ دکھاتا ہوں۔“
رحیم بخش کی آواز میں ہلکی سی غراہٹ تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ اس آدمی کی شکست خوردہ سی آواز سنائی دی۔ ”ہم دوبارہ یہاں آئیں گے۔ اور پھر دیکھوں گا کہ تم ہمیں اندر داخل ہونے سے کیسے روکتے ہو۔“
تھوڑی دیر بعد موٹر بوٹ کی آواز سنائی دی جو بتدریج دور ہوتی چلی گئی۔ شارق لالچ کے کینے سے باہر آگیا۔

”اگر یہ مزید فورس لے کر واپس آگیا تو؟“ شارق نے رحیم بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”فکر مت کرو۔“ رحیم بخش بولا۔ ”دفتر واپس پہنچنے سے پہلے پہلے اس کی نوکری ختم ہو چکی ہوگی۔“

وہ دونوں حویلی کی طرف واپس آ گئے۔ رحیم بخش ایک کمرے میں گھس گیا اور فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ کچھ دیر تک بلوچی زبان میں کسی سے باتیں کرتا رہا پھر اس نے فون بند کر دیا اور شارق کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔
شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ آٹھ بجے کے لگ بھگ انہوں نے کھانا کھالیا۔ مرغابی کا گوشت تھا۔ بے حد لذیذ۔

وہ لوگ کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ایک گاڑی حویلی کے گیٹ کے سامنے آ کر رکی۔
رحیم بخش نے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھولا اور جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ ان میں ایک خوب لمبا ترنگا تھا۔ چہرے سے وہ بلوچ نہیں لگتا تھا۔ اس نے سفید ٹی شرٹ اور کالی پتلون پہن رکھی تھی۔ دوسرا درمیانے قد کا تھا۔ وہ بلوچ تھا۔ وہ لوگ دیر تک کھڑے باتیں کرتے رہے۔ پھر اس کمرے میں آ گئے جہاں شارق وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ لمبے قد والا آدمی بڑی گہری نظروں سے ٹینے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ٹینے کو اس کی نظریں اپنے جسم میں چبھتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔

”ملا بشیر بیچ گوری نے ان دونوں آدمیوں کو حویلی اور تم لوگوں کی حفاظت کے لئے بھیجا ہے۔“ رحیم بخش نے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہاں ریڈ کا خطرہ ہے کیا؟“ شارق نے پوچھا۔

”نہیں واج!“ رحیم بخش نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ان دونوں آدمیوں کو تو واپس اپنے دفتر پہنچنے سے پہلے ہی نہ صرف نوکری سے نکال دیا گیا ہے بلکہ مداخلت بے جا کے الزام میں انہیں گرفتار بھی کر لیا گیا ہے۔ اگرچہ اب کوئی اور اس طرف آنے کی ہمت نہیں کرے گا لیکن

غضب ہو جائے گا۔ اس لالچ کے کینے میں کھس جاؤ اور جب تک میں نہ کھوں باہر مت آؤ جلدی کرو۔“

وہ رحیم بخش تھا۔

شارق آڑ لیتا ہوا لالچ کے کینے میں گھس گیا۔ اس نے رحیم بخش کو تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کھاڑی کے دہانے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ آٹو میک رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔
موٹر بوٹ رک گئی۔ انجن بھی بند ہو گیا۔ شارق انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان کی آواز سنائی دے رہی تھیں۔

”کیا بات ہے واج! تم لوگ ادھر کس واسطے آئے ہو؟“ یہ آواز واج رحیم بخش کی تھی۔
”کل رات کچھ لوگ ساحل پر اترتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ ہم انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ یہ اس آدمی کی آواز تھی جو موٹر بوٹ سے اترتا تھا۔ وہ اردو بول رہا تھا اور لمبے بالکل صاف قد شارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کوئی پاکستانی تھا۔ خلیج کی ریاستوں کی پولیس، فوج اور دیگر سرکاری محکموں میں پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔“
”بہت اچھے واج بہت اچھے۔“ رحیم بخش نے کہا۔ ”ان لوگوں کو کل رات ساحل پر اترے ہوئے دیکھا گیا تھا اور تلاش تم لوگ اب کر رہے ہو۔ کیا تمہارے خیال میں وہ لوگ ساحل کینیں بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”ان کے بارے میں ہمیں آج دہپہر کو اطلاع ملی تھی۔ ہم لوگ انہیں ساحلی بیسیوں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔
”ہم لوگ اس ڈیرے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔“

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا واج!“ رحیم بخش کے لمبے میں اس مرتبہ سختی تھی۔
”تمہیں نہیں معلوم یہ ملا بشیر بیچ گوری کا ڈیرہ ہے اور اجازت کے بغیر کوئی اس کے اندر قدم نہیں رکھ سکتا۔“

”یہ ڈیرہ ملا بشیر بیچ گوری کا ہو یا کسی اور کا۔ قانون سے کوئی بھی بالاتر نہیں ہے۔ ہم ڈیرے کی تلاشی لیں گے۔“ اس شخص نے کہا۔

”تو پھر ہمت ہے تو قدم آگے بڑھاؤ واج۔“ رحیم بخش نے کہا۔ ”اس رائفل کی سارا گولیاں تمہارے جسم میں اتار دوں گا۔“

”دیکھو!“ دوسرے آدمی کی آواز سنائی دی۔ ”تم ہمارے کام میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہو۔ تمہارے خلاف بھی کارروائی ہو سکتی ہے۔“

نزار ہونے کی کوشش نہ کریں۔“

”رات تو گزرا لی جائے۔ صبح میں فون پر ملا بشیر بچ گوری سے بات کرنے کی کوشش کروں گا۔“ شارق نے کہا۔

وہ کچھ دیر اور باتیں کرتے رہے پھر ڈی کوسٹا بھی اونگھنے لگا۔

اس وقت شاید رات کے گیارہ بجے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ ثینہ شارق کے قریب ہی لیٹی ہوئی تھی دفعتاً وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا؟“ شارق نے اس کی طرف دیکھا۔

”دل گھبرا رہا ہے۔ سانس گھٹ رہی ہے۔“ ثینہ سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”چلو باہر لان میں چلتے ہیں۔ تازہ ہوا میں طبیعت سنبھل جائے گی۔“ شارق نے کہا۔

وہ دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔ کچھ دیر آرامے میں کھڑے رہے پھر لان میں آ کر ٹبلے لگے۔ حویلی کے محاذوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ اگر کسی نے انہیں دیکھا بھی تھا تو ٹوکا نہیں تھا۔

”وہ سامنے سمندر میں کچھ روشنیاں دیکھ رہی ہو۔“ شارق نے اشارہ کیا۔ ”میرا خیال ہے کوئی جہاز ہے۔ چلو۔ جینسی کی طرف چلتے ہیں۔“

وہ لوگ چبوترے پر چڑھ کر جینسی کے پلیٹ فارم پر آ گئے اور پرانی لانچ کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ وہ لوگ سمندر میں تیرتی ہوئی ان روشنیوں کو دیکھ رہے تھے جو بہت دور دائیں سے بائیں جاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

دفعتاً اپنے عقب میں آہٹ سن کر شارق چونک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا لیکن اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کے سر پر کسی وزنی چیز سے ضرب لگی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی ٹاپنے لگیں۔ وہ تورا کر گرا۔

شارق کو آخری آواز جو سنائی دی تھی وہ ثینہ کی چیخ تھی اور اس کے بعد شارق کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔



سر پھرے لوگ بہت ہیں۔ اس لئے ملا بشیر بچ گوری نے ان لوگوں کو یہاں بھیج دیا ہے۔ اب تم لوگ فکر مت کرو۔“

فکر تو بہر حال انہیں تھی۔ وہ جب تک یہاں سے نکل نہ جاتے ان کی پریشانی ختم نہیں ہو سکتی تھی اور یہاں سے نکلنا ان کی اپنی مرضی پر منحصر نہیں تھا۔ اس کا انحصار ملا بشیر بچ گوری پر تھا کہ اس کی لانچ کب آتی ہے اور وہ انہیں گوار کب روانہ کرتا ہے۔

اس رات وہ سب ایک ہی کمرے میں تھے اور دیر تک جاگتے رہے۔ نجانے کیا بات تھی کہ ثینہ اپنے دل میں ایک عجیب سا خوف محسوس کرنے لگی تھی۔ شام کو نئے آنے والوں میں سے لمبے قد والے نے جب گھورتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا تو یہ خوف اسی وقت اس کے دل میں پیدا ہوا تھا اور کوشش کے باوجود اس سے نجات نہیں پاسکی تھی۔

رات خیریت سے گزر گئی۔ صبح ناشتے کے بعد انہیں پتہ چلا کہ لمبے قد والا جس کا نام سجاد تھا شر واپس چلا گیا تھا۔ ثینہ نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

وہ دن بھی انہوں نے ناش کھینے اور جینسی لان اور حویلی میں گھومتے پھرتے گزارا تھا شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد سجاد واپس آ گیا۔ اسے دیکھ کر ثینہ کے ذہن میں ایک بار پھر خوف سا ابھر آیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ پھر ایک کمرے میں بند ہو گئے۔ نو لکھا تھوڑی دیر بعد ہی اونگھنے لگا تھا۔ شارق اور ڈی کوسٹا باتیں کرتے رہے تھے۔ کل صبح ملا بشیر بچ گوری سے ملاقات ہوئی تھی تو اس نے کہا تھا کہ وہ شام کو چکر لگائے گا لیکن وہ نہ تو کل شام کو واپس آیا تھا اور نہ ہی آج اس نے ان کی خبر لی تھی۔ البتہ اس کے ملازمین ان کی بڑی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ یہاں اگرچہ انہیں کوئی تکلیف نہیں تھی لیکن اب ان پر وحشت سی طاری ہونے لگی تھی۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے ساتھ کسی قسم کا دھوکا کیا جا رہا ہو۔“ ثینہ نے ان کی باتوں میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

”دھوکا! میں سمجھا نہیں۔“ شارق نے اسے گھورا۔

”حاجی عبداللہ کا کام تو ہو گیا۔ اس نے ملا بشیر بچ گوری کو یہ ہدایت کی ہو کہ ہمیں ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اس قسم کے لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔“ ثینہ نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔“ ڈی کوسٹا نے کہا۔ ”اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو ہماری اس طرح خاطر مدارات نہ کی جاتی اور نہ ہی ہماری حفاظت کا بندوبست کیا جاتا۔“

”جسے تم ہماری حفاظت کا بندوبست کہہ رہے ہو یہ نگرانی بھی تو ہو سکتی ہے تاکہ ہم کہیں

”شارق.... شارق باؤ.... ہوش میں آؤ۔“ نوکھا اسے کندھے سے جھنجھوڑنے لگا۔ مگر شارق ہوش میں نہیں آیا۔

”ڈکوٹا۔“ نوکھا اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”تم اسے سنبھالو۔ میں ٹینہ کو تلاش کرتا ہوں۔“

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ان کی موٹر بوٹ غائب تھی اور بیریز والا پائپ بھی اوپر اٹھا ہوا تھا۔

”ٹینہ.... ٹینہ بی بی.... کہاں ہو تم....“ اس نے تاریکی میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پکارا لیکن جواب میں کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

نوکھا کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر واپس آ گیا۔ ڈی کوٹا، شارق کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کون ہے ادھر؟ ادھر کیا ہو رہا ہے؟“ وہ واجہ رحیم بخش کی آواز تھی۔ نوکھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم بخش عمارت کے دائیں

طرف والے برآمدے میں کھڑا تھا۔ اس طرف چلنے والے بلب کی مدھم سی روشنی میں اس کے ہاتھ میں آٹومیک رائفل بھی نظر آ رہی تھی۔

”اوائے واجہ!“ نوکھا نے اسے پکارا۔ ”ادھر آ“ میں تیرا باجہ بجاتا ہوں۔ آکر دیکھ یہ کیا ہو گیا ہے۔“

واجہ رحیم بخش نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد جبینی والے ایریا میں بھی دو بلب روشن ہو گئے۔ روشنی ہوتے ہی نوکھا پھر شارق کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے پچھلے

پے پر چوٹ تھی۔ سر کے بال اور گردن خون آلود تھی۔ وہ اس کا سر اور جسم کے دوسرے حصے

ڈال کر دیکھنے لگا۔ چوٹ صرف سر میں لگی تھی۔ جسم کے کسی اور حصے پر بظاہر کوئی اور نشان نظر

میں آ رہا تھا۔ نوکھا کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ چوٹ گرنے سے نہیں آئی تھی بلکہ شارق کے سر پر کسی چیز سے زور دار ضرب لگائی گئی تھی۔

”یہ.... یہ کیا ہوا؟ کون ہے یہ؟“ رحیم بخش کی آواز سن کر نوکھا نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہ اپنا شارق باؤ ہے۔“ نوکھا نے کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے ہم نے ٹینہ کے پیچھے کی آواز سنی تھی۔ یہاں آئے تو شارق باؤ یہاں بے ہوش پڑا تھا۔ ٹینہ بی بی کا کچھ پتہ نہیں اور ہماری موٹر

بٹ بھی غائب ہے۔“

بچپن کی آواز سن کر وہ دونوں گڑبڑا کر اٹھ گئے۔

”یہ.... یہ کیسی آواز تھی، کون چیخا تھا؟“ ڈی کوٹا، نوکھا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ٹینہ!“ نوکھا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”یہ ٹینہ کے علاوہ کسی اور کی آواز نہیں ہو سکتی۔“

وہ اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑا۔ ڈی کوٹا نے بھی اپنی جگہ سے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ ان دونوں نے بیک وقت دروازے سے نکلنے کی کوشش کی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آپس میں ٹکرا گئے۔ نوکھا تو سنبھل گیا مگر ڈی کوٹا اس کی ٹکراؤ سے دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس کا سر دروازے کی چوٹ سے لگا تھا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑے نیچے جھٹکا چلا گیا۔

”سنبھل کے بھائی ڈکوٹا، اٹھو، جلدی کرو۔“ نوکھا نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

ڈی کوٹا کو اچھی خاصی چوٹ لگی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے سر سہلا رہا تھا۔

چیخ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی لیکن اس مرتبہ آواز بہت دور کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کسی موٹر بوٹ کے انجن کی پھٹ پھٹ کی ہلکی سی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

وہ دونوں برآمدے سے نکل کر جبینی کی طرف دوڑنے لگے۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ دفعتاً نوکھا کسی چیز سے

ٹکرایا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش نہ کی مگر لوکھڑا کر گر گیا۔ وہ اس چیز کو ٹٹول کر دیکھنے لگا جس سے ٹکرا کر گرا تھا۔ اور پھر اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ ایک انسانی جسم تھا۔

نوکھا نے جیب سے ماچس نکال کر دیا سلائی جلائی۔ دیا سلائی کی زرد روشنی میں شارق کا چہرہ دیکھ کر وہ بری طرح بدحواس ہو گیا۔

ڈی کوٹا بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔ شارق کو دیکھ کر وہ بھی بدحواس ہو گیا تھا۔ وہ بے ہوش تھا۔ نوکھا کی انگلیوں میں جلتی ہوئی دیا سلائی بچھ گئی۔ اس نے دوسری دیا سلائی جلائی اور اب اسے شارق کے سر سے ہٹا ہوا خون بھی نظر آ گیا۔

”کیا بولتا پڑا ہے واجہ؟“ رحیم بخش کے لہجے میں حیرت تھی۔
 ”میں ٹھیک بولتا پڑا ہوں۔“ نوکھا نے اس کے لہجے کی نقل اتاری۔ ”کوئی شینہ کو اغواء کر کے لے گیا ہے اور یہاں کی بٹیاں کیوں نبھی ہوئی تھیں حالانکہ یہاں رات بھر بٹیاں جلتی رہتی ہیں۔“
 ”مجھے پتہ نہیں کس نے بجھائی تھیں۔ مگر وہ کون لوگ تھے؟ شینہ کو کون اٹھا کر لے گیا ہے؟ وہ کون لوگ تھے؟“ رحیم بخش نے کہا۔

”اگر یہ پتہ ہوتا تو ہم تمہارے انتظار میں یہاں بیٹھے نہ ہوتے۔“ نوکھا کے لہجے میں تلخی تھی۔ ”وہ لوگ شینہ کو موٹر بوٹ میں لے گئے ہیں، ان کا پیچھا کر۔“
 رحیم بخش کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ وہ شارق کی طرف دیکھنے لگا۔
 ”کیا... کیا یہ...“ وہ ہٹلا کر رہ گیا۔
 ”بے ہوش ہے، مرا نہیں ہے۔“ نوکھا نے کہا۔
 ”اس کو ادھر کمرے میں لے چلو۔ ہوش میں لاؤ اور پوچھو وہ کون لوگ تھے؟“ واجہ رحیم بخش نے کہا۔

”وہ اس کے رشتے دار نہیں تھے جنہیں یہ پہچانتا ہو۔“ نوکھا نے جواب دیا۔ ”پتہ نہیں کون تھے۔ اگر ان کا پیچھا نہ کیا گیا تو وہ شینہ کو لے کر کہیں دور نکل جائیں گے۔“
 ”تم لوگ اسے لے کر کمرے میں چلو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ رحیم بخش کہتا ہوا عمارت طرف دوڑ گیا۔

نوکھا اور ڈی کوٹا نے بے ہوش شارق کو اٹھایا اور اسے کمرے میں لا کر لٹا دیا۔ تھوڑی دیر بعد رحیم بخش بھی پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ محمد دین اور لمبا تڑنگا سجاد بھی تھا۔ وہ دونوں جہ سے شارق کو دیکھ رہے تھے۔
 ”محمد دین۔“ رحیم بخش نے کہا۔ ”تم اسے ہوش میں لاؤ اور سر کے زخم پر دوائی بھی لگا اور سجاد۔۔۔ تم میرے ساتھ آؤ۔۔۔ چلو نوکھا۔“

وہ تینوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے جینسی پر آ گئے۔ رحیم بخش نے سفید لالچ کا بیٹی ہک سے بندھا ہوا رسہ کھولا اور وہ تینوں لالچ پر آ گئے۔ رحیم بخش دھیل کیبن میں آ گیا۔ نے لالچ کی بٹیاں جلائیں اور پھر انجن اشارت کرنے لگا۔ ایک ہی مرتبہ ٹپن دبانے سے اشارت ہو گیا تھا۔

”یہ لالچ واجہ ملا بشریچ گوری کے ذاتی استعمال کے لئے ہے۔ اسے کسی اور کام کے

نکل نہیں کیا جاتا۔“ رحیم بخش نے قریب کھڑے ہوئے نوکھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن وقت مجبوری ہے، ہمارے پاس کوئی اور بوٹ وغیرہ بھی نہیں ہے۔“
 ایک دو مرتبہ آگے پیچھے حرکت دینے کے بعد لالچ کا رخ کھاڑی کے دہانے کی طرف ہو گیا۔ بڑی مہارت سے لالچ کو کھاڑی سے نکال لایا۔
 ”وہ لوگ کس طرف گئے تھے، دیکھا تھا تم نے؟“ رحیم بخش نے نوکھا کی طرف دیکھتے ہوئے

چھا۔

”دیکھا تو نہیں تھا لیکن بوٹ کی آواز اس طرف سے آئی تھی۔“ نوکھا نے اشارہ کیا۔
 رحیم بخش نے سمندر میں آنے کے بعد لالچ کا رخ اسی طرف موڑ دیا۔ لالچ ساحل سے نیچا سوگڑ کے فاصلے پر ہلکی رفتار سے چلتی رہی۔ اس طرف ساحل کا وہی علاقہ تھا جہاں اس رات لوگ ساحل پر اترے تھے اور بوٹ چٹانوں میں جھوڑ دی تھی۔

”ساحل کی طرف دیکھتے رہو۔ اگر وہ بوٹ کہیں نظر آ جائے تو بتا دیتا۔“ رحیم بخش نے کہا۔
 نوکھا دھیل کیبن سے نکل کر عرشے پر آ گیا۔ سجاد پہلے ہی عرشے کی ریلنگ کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں آٹو بیگ رانفل تھی۔ نوکھا بھی دونوں ہاتھ ریلنگ کے پائپ پر جما کر کھڑا ہو گیا۔ لالچ کے چاروں طرف سرچ لائیں لگی ہوئی تھیں جن کی روشنی خاصی تیز تھی۔ اصل کی یہ چٹانیں اس روشنی میں صاف نظر آرہی تھیں۔

نوکھا گہری نظروں سے ساحل کی طرف دیکھ رہا تھا لالچ کبھی ساحل کے بہت قریب آ جاتی۔ کبھی دور ہٹ جاتی۔ رحیم بخش اس ساحل کے چپے چپے سے واقف تھا۔ وہ اسی حساب سے لالچ کو کبھی ساحل کے قریب لے جاتا اور کبھی دور لے جاتا۔

وہ چٹانیں اب بہت پیچھے رہ گئی تھیں جہاں اس رات وہ لوگ ساحل پر اترے تھے۔ اب ساحل کے ساتھ ساتھ گنجان جھاڑیوں کا سلسلہ تھا اور ان سے آگے خاصی دور بندرگاہ کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ نوکھا کو یقین تھا کہ وہ لوگ شینہ کو لے کر بندرگاہ کی طرف نہیں گئے ہوں گے بلکہ اس سے پہلے ہی کسی جگہ ساحل پر اتر گئے ہوں گی۔ اس لئے نوکھا بڑی توجہ سے ساحل کی طرف دیکھ رہا تھا کہ شاید کہیں وہ موٹر بوٹ نظر آ جائے اور بلاخر وہ چنچ اٹھا۔

”روکو۔۔۔ لالچ روکو واجہ۔“

رحیم بخش نے اس کی آواز سن لی۔ لالچ چند سوگڑ آگے جا کر رک گئی۔ رحیم بخش کیبن سے نکل کر اس کے قریب آ گیا۔

”وہ ادھر جھاڑیوں میں۔“ نوکھا نے اشارہ کیا۔ ”مجھے یوں لگا تھا کہ جیسے وہاں گنجان جھاڑیوں

وہ دونوں دوڑتے ہوئے جھاڑیوں میں کھڑی ہوئی گاڑی کے قریب پہنچ گئے۔ وہ کوئی لینڈ کروزر تھی۔ ریگستانی علاقوں میں عام طور پر اسی قسم کی گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں۔ وہ دونوں گاڑی میں جھانکنے لگے۔ گاڑی خالی تھی۔

”میرا خیال ہے یہ انہی لوگوں کی گاڑی ہے جو شینہ کو اغواء کر کے لے گئے ہیں۔ شاید گاڑی کسی وجہ سے خراب ہو گئی ہے جسے وہ یہاں چھوڑ گئے ہیں۔“ نوکھانے کہا۔

”ایسا ہی لگتا ہے۔“ سجاد نے کہا۔

”اس گاڑی کے نمبر سے اس کے مالک کا پتہ چلایا جاسکتا ہے اور پھر یہ معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں ہو گا کہ یہ گاڑی کس کے استعمال میں تھی۔“

نوکھا جھک کر گاڑی کا نمبر دیکھنے لگا۔ اسی لمحہ اس کی چمچی حس خطرے کا احساس دلانے لگی۔ وہ ایک دم سیدھا ہوا مگر اسے دیر ہو گئی تھی۔ سجاد رانفل کو ٹال کی طرف سے پکڑے اس پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ نوکھا بڑی پھرتی سے ایک طرف جھکا مگر وہ پوری طرح اپنے آپ کو بچا نہیں سکا۔ رانفل کا بٹ اس کے کندھے پر لگا۔ سجاد نے نشانہ تو اس کے سر کو بنایا تھا مگر نوکھا کے بدقت آگاہ ہو جانے سے رانفل کا بٹ سر کی بجائے اس کے کندھے پر لگا تھا۔ اس کے منہ سے کراہی نکل گئی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ لیکن اس نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ ٹھیک اسی لمحہ سجاد نے اس پر دوبارہ حملہ کیا لیکن اس مرتبہ نوکھا نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رانفل کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اس کے ساتھ ہی ایک زور وار جھٹکا دیا۔

نوکھا کا یہ رد عمل غالباً سجاد کے لئے بالکل غیر متوقع تھا۔ وہ اس کے اوپر سے قلابازی کھاتا اور جھاڑیوں میں گرا۔ رانفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی اور نوکھا کی گرفت بھی رانفل پر میں رہی تھی۔ وہ بڑی پھرتی سے اٹھ کر سجاد کی طرف لپکا۔ اس نے سجاد پر چھلانگ لگائی تھی۔ مگر سجاد نے اپنا ایک پیر اوپر اٹھا دیا۔ نوکھا اس کے پیر سے ٹکرا کر زمین پر گرا۔

سجاد نے فوراً ہی اسے چھاپ لیا۔ وہ اس کے سینے پر سوار ہو کر اس کے گلے پر گرفت بنانے کی کوشش کر رہا تھا مگر نوکھا بھی اس سے کمزور نہیں تھا۔ وہ بھی اس قسم کی لڑائیوں کا ماہر تھا۔

انہوں نے سجاد کی دونوں کلائیوں گرفت میں لے لیں اور پوری قوت سے جھٹکا دیا۔ سجاد اس کے اوپر سے لڑھک کر بائیں طرف گرا۔ نوکھا فوراً ہی سنبھل گیا۔ اس دوران سجاد بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے اور ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے کے لئے تیار رہے تھے اور پھر یوں لگا جیسے دو پہاڑ آپس میں ٹکرائے ہوں۔ دونوں ایک ساتھ نیچے گرے۔ وہ دونوں دیر تک ایک دوسرے کو جھاڑیوں میں رگیدتے رہے۔

میں کوئی کشتی چھپی ہوئی ہے۔“

رحیم بخش غور سے اس طرف دیکھنے لگا۔ اس جگہ ساحل عمودی کنارے کی طرح تھا اور گنجان جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

”میرا خیال ہے وہاں کوئی چیز موجود ضرور ہے۔“ رحیم بخش نے کہا۔ ”سجاد! ربر کی کشتی اتار اور تم دونوں وہاں دیکھ کر آؤ۔“

سجاد نے ربر کی کشتی پانی میں اتار دی۔ اس میں صرف دو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ رسی کی سیڑھی کے ذریعے سجاد اور نوکھا کشتی میں اتر آئے۔ سجاد نے اپنی رانفل اپنے پیروں کے قریب رکھ لی اور چپوؤں کی مدد سے کشتی کو چلانے لگا۔ پلاسٹک کے یہ چپو خاصے مضبوط تھے۔ جھاڑیاں وہاں سے تقریباً پچاس گز دور تھیں۔ نوکھا گہری نظروں سے اس طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ جیچ اٹھا۔

”وہ اس طرف۔“ اس نے اشارہ کیا۔ وہ کشتی ہی ہے اور یقیناً وہی موٹر بوٹ ہے۔“

سجاد نے اس کے اشارے کی طرف دیکھا اور کشتی کا رخ اسی طرف موڑ دیا۔ وہ موٹر بوٹ تھی جو گنجان جھاڑیوں میں چھپی ہوئی تھی۔ کشتی بوٹ کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ وہ دونوں متحسس لگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ انہیں جھاڑیوں کے درمیان ایک تنگ سا راستہ نظر آگیا جو پینتالیس درجے کا زاویہ بناتا ہوا اوپر کی طرف چلا گیا تھا۔ یہ راستہ اس بھر پوری چٹان کا ٹکڑا بنایا گیا تھا۔ سجاد کشتی کو اس راستے کے قریب لے آیا۔ کشتی سے منسلک ٹائلوں کی رسی سرا اس نے ایک جھاڑی کی شاخ سے باندھ دیا اور رانفل اٹھا کر بڑی احتیاط سے اس کٹاؤ پر چڑھ گیا۔ چند سینکڑ بعد نوکھا بھی اس کے قریب موجود تھا۔ وہ دونوں کٹاؤ پر چڑھتے ہوئے اوپر آ گئے۔ تقریباً پندرہ فٹ اوپر وہ مسطح جگہ پر پہنچ گئے۔ ان کے چاروں طرف جھاڑیاں تھیں۔ وہاں جھاڑیوں میں چلتے ہوئے چند قدم آگے جا کر رک گئے۔ یہ جگہ تھوڑے صاف تھی۔ سجاد رانفل دونوں ہاتھوں میں سنبھالے، ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور نوکھا اس طرح نتھنے پھلا پچکا رہا تھا جیسے سوچنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”تم بو محسوس کر رہے ہو..... پیڑوں کی بو؟“ نوکھانے کہا۔

”ہاں..... محسوس تو ہو رہی ہے۔“ سجاد نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کچھ دیر پہلے یہاں کوئی ایسی گاڑی موجود تھی جس سے پیڑوں کے قطرے ٹپک رہے ہوں گے۔“

نوکھا چند قدم اور آگے بڑھ گیا اور پھر دفعتاً وہ جیچ اٹھا۔

”وہ..... وہ دیکھو..... کوئی گاڑی کھڑی ہے۔“

ڈھلان سے اتر کر پانی کے کنارے پر پہنچ گئے۔ نوکھانے پہلے اسے ربر کی کشتی میں اتارا اور پھر خود بھی کشتی میں آگیا۔

”چلو... چپو چلاؤ۔“ نوکھانے حکمانہ لہجے میں کہا۔ وہ سجاد کے سامنے بیٹھا تھا اور سجاد کو اس نے رانفل کی زد پر لے رکھا تھا۔

سجاد نے جھاڑی کی شاخ سے بندھی ہوئی رسی کھولی اور چپو سنبھل لئے۔ اب وہ لالچ کی روشنی کی زد میں تھے۔ کشتی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لالچ کے قریب پہنچ گئی۔

”کیا ہوا...؟ یہ فائرنگ کیسی تھی؟“ رحیم بخش نے رینگ پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

”یہ غدار سجاد اوپر آ رہا ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔“ نوکھانے چیخ کر کہا۔

پہلے سجاد رسی کی میڑھی سے اوپر چڑھا۔ نوکھانے ربر کی کشتی کی رسی سے والی میڑھی سے باندھ دی اور پھر خود اوپر چڑھ گیا۔

سجاد عرشے پر ٹانگ پھیلانے بیٹھا ہوا تھا۔ پنڈلی سے خون بہہ رہا تھا اور رحیم بخش نے اسے رانفل کی زد میں لے رکھا تھا۔ نوکھانے اوپر آ کر رسوں والی میڑھی اور ربر کی کشتی اوپر کھینچ لی۔ وہ بری طرح ہانپ گیا تھا۔

”کیا ہوا؟ یہ زخمی کیسے ہوا اور اس نے کیا غداری کی ہے؟“ رحیم بخش نے پوچھا۔

”یہ انہی لوگوں کا ساتھی ہے جو شینہ کو اغواء کر کے لے گئے ہیں۔“ نوکھانے کہا اور پھر تفصیل سے اسے سب کچھ بتانے لگا۔ ”میں نے جب اس سے گاڑی کا نمبر نوٹ کرنے والی بات کی تو اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی لیکن بالآخر میرے قابو میں آ ہی گیا۔“

”یہ... یہ جھوٹ بولتا ہے۔“ سجاد نے کراہتے ہوئے کہا۔

”نہیں... یہ جھوٹ نہیں بول رہا۔“ رحیم بخش نے کہا۔ ”یہ تمہیں جانتا تک نہیں۔ تم سے اس کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے جو یہ تم پر جھوٹا الزام لگائے گا۔ یہ تو میں ڈیرے پر جا کر معلوم کر لوں گا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔“ وہ نوکھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”نوکھانے... وہ اوپر ایک رسی پڑی ہوئی ہے۔ اس کے ہاتھ پیر باندھ دو۔ ڈیرے پر جا کر معلوم کرتے ہیں کہ وہ کون دگ تھے۔ لڑکی کو کہاں لے گئے ہیں اس کا ان سے کیا تعلق ہے؟“

نوکھانے رسی اٹھا کر لے آیا اور سجاد کے ہاتھ پیر باندھ کر اسے عرشے پر ڈال دیا۔ رحیم بخش کہیں میں گیا۔ اس نے لالچ کی ساری فالتو باتیں بھجادیں اور لالچ کو حرکت میں لے آیا۔ انہیں اڑے تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ دین محمد کھاڑی کے دہانے کے قریب کھڑا تھا۔ لالچ بچے ہی اندر داخل ہوئی اس نے بیر گر دیا اور دوڑتا ہوا جیسی پر آگیا۔

سجاد کا ہاتھ جھاڑیوں میں پڑی ہوئی رانفل پر پڑ گیا۔ نوکھانے بھی رانفل پر ہاتھ ڈال دیا۔ اب ان دونوں میں رانفل کے لئے کشش ہونے لگی۔ رانفل کا رخ نیچے کی طرف تھا۔ کشش میں ٹرائیگر دب گیا۔ فائر کی آواز سے ویرانہ گونج اٹھا۔ گولی نوکھانے کے بالکل قریب جھاڑیوں میں دھنس گئی تھی۔

سجاد نے رانفل کو ایک زور وار جھٹکا دیا۔ رانفل ان دونوں کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اڑتی ہوئی دور جھاڑیوں میں جا گری۔ اس کے ساتھ ہی نوکھانے بھی لڑکھڑا کر اٹھا۔ اس کا خیال تھا کہ سجاد اس پر حملہ آور ہو گا لیکن دوسرے ہی لمحہ سجاد نے جھاڑیوں میں ایک طرف دوڑ لگا دی۔ نوکھانے بڑی پھرتی سے اٹھ کر اس کے پیچھے دوڑا۔ اس کے پیر کو جھاڑیوں میں پڑی ہوئی رانفل سے ٹھوکر لگی۔ اس نے بڑی پھرتی سے جھک کر رانفل اٹھالی اور وہیں رک کر سجاد کی طرف نشانہ باندھنے لگا۔ سجاد تقریباً پچاس گز آگے نکل چکا تھا۔ نوکھانے رانفل سیدھی کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔ رانفل کا رخ قدرے نیچے کی طرف تھا۔

ویرانہ ایک بار پھر فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی سجاد کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ نوکھانے سجاد کو گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ نوکھانے اس طرف دوڑا جس جگہ سجاد گرا تھا۔ وہاں رک کر وہ متحسنگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک طرف جھاڑیوں میں سرسراہٹ کی آواز سنائی دی تو وہ اس طرف لپکا۔ سجاد جھاڑیوں میں رینگتا ہوا وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اب ایک انچ بھی آگے سرکے تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔“ نوکھانے حلق سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی۔ ”اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔“

”مم... میں زخمی ہوں۔ میری ٹانگ میں گولی لگی ہے۔“ سجاد کراہا۔

”اگر تم ایک سینڈ میں اٹھ کر کھڑے نہ ہوئے تو دوسری گولی تمہاری کھوپڑی میں لگے گی۔“ نوکھانے غرایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رانفل کی ٹال سے اس کی گردن پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تھا۔

”اٹھ... اٹھ رہا ہوں۔“ سجاد کراہا۔ گولی اس کی پنڈلی میں لگی تھی جس سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بڑی مشکل سے اٹھ کر کھڑا ہو سکا تھا۔

”چلو... اب ساحل کی طرف چلو۔“ نوکھانے اس کی پشت پر رانفل کی ٹال سے دباؤ ڈالنے ہوئے کہا۔

”میں... میں چل تو نہیں سکتا۔“ سجاد کراہا۔

”میں تمہیں گود میں تو نہیں اٹھا سکتا۔“ نوکھانے غرایا۔ ”چلو آگے بڑھو۔“

سجاد لڑکھڑاتا ہوا آگے چلنے لگا۔ نوکھانے اسے بار بار رانفل سے ٹھوکر دے رہا تھا۔ وہ تنگ

”ان کا کچھ پتہ چلا..... ارے..... اس کو کیوں باندھا ہے؟“ وہ حیرت سے سجاد کی طرف دیکھ کر لگا۔

”یہ غدار ہے محمد دین۔“ رحیم بخش نے کہیں سے نکلتے ہوئے کہا۔ ”شارق ہوش میں آیا اب کیسا ہے وہ؟“

”ہاں، ہوش میں آگیا ہے۔ چوٹ زیادہ گہری نہیں ہے۔ میں نے دوائی لگا دی تھی۔ دو تین دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔“ دین محمد نے جواب دیا۔

اسی دوران ڈی کوشا اور شارق بھی وہاں آگئے۔ شارق کے سر پر پٹی باندھی ہوئی تھی۔ محمد دین اور نوکھانے سجاد کو نیچے اتارا اور اسے ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے کمرے تک لے آئے۔

”ٹھینہ کا کچھ پتہ چلا؟“ شارق نے نوکھانے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی نہیں۔“ نوکھانے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”لیکن پتہ چل جائے گا۔ یہ جو باڈر بلا ہے نا۔ اس نے سجاد کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ان لوگوں کے ساتھ ملا ہوا ہے جو ٹھینہ کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ اس نے مجھے بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں تو بچ گیا اور یہ خود میرے ہاتھ آ گیا۔“ نوکھانے اسے تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔

”واجہ سجاد!“ رحیم بخش اس کے قریب آکر بولا۔ ”تم نے ہم لوگوں کا ناک کنوا دیا ہے۔ بلوچ تو مہمانوں کے لئے اپنی جان بھی قربان کر دیتے ہیں مگر تمہاری اس حرکت سے ہمارے ہر جھک گئے ہیں۔ یہ لوگ کیا سمجھیں گے کہ بلوچ ایسے دھوکے باز اور بے ایمان ہوتے ہیں کہ مہمانوں کو بھی نہیں بخشے۔ اب تم سب کچھ مجھے بتا دو گے یا میں ٹیلی فون کروں ملا بشریچ گوری کو؟“

”یہ مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہا ہے۔“ سجاد نے نوکھانے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”یہ پردیسی لوگ ہیں۔“ رحیم بخش نے جواب دیا۔ ”زندگی میں پہلی مرتبہ تم کو دیکھا ہے تم پر جھوٹا الزام کیوں لگائے گا۔ کیا دشمنی ہے اس کی تم سے.... لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے ملا بشریچ گوری کو اطلاع دینی پڑے گی۔ یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے جسے آسانی سے چھوڑ دیا جائے....“

رحیم بخش چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کمرے سے نکل کر باہر چلا آیا۔

”یہ سب کچھ کیسے ہوا شارق باؤ۔“ نوکھانے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم لوگ آدھی رات کو اس طرف کیا لینے گئے تھے؟“

”تمہارے سامنے ہی تو ہم کمرے سے نکلے تھے۔“ شارق نے کہا۔ ”کمرے میں بیٹھے بیٹھے

ٹھینہ کا دم گھٹنے لگا تھا۔ ہم لوگ کمرے سے نکل کر ٹھیلے ہوئے جینسی پر چلے گئے تھے۔ جینسی پر اندھیرا تھا۔ ہم لوگ پرانی لالچ کے قریب کھڑے ہو گئے۔ دور سمندر میں ایک جہاز کی بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہم جینسی پر کھڑے تھے کہ اچانک ہی کسی نے تاریکی میں ہم پر حملہ کر دیا۔ میرے سر پر کسی ٹھوس چیز سے زور دار ضرب لگی تھی۔ میں نے ٹھینہ کی چیخ سنی تھی۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔“

”جب تم لوگ اس طرف گئے تھے تو جینسی پر اندھیرا تھا یا بتیاں بعد میں بجھی تھیں؟“ یہ سوال ڈی کوشانے کیا تھا۔

”بتیاں پہلے ہی سے بجھی ہوئی تھیں۔ جس پر مجھے حیرت بھی ہوئی تھی۔ حالانکہ جینسی پر تو رات بھر بتیاں جلتی رہتی ہیں بہر حال، میں نے توجہ نہیں دی تھی کہ بتیاں کیوں بجھی ہوئی ہیں۔“ شارق نے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ یہ سب کچھ باقاعدہ پلاننگ سے ہوا ہے اور اس پلاننگ میں ڈیرے کا کوئی آدمی بھی شامل ہے۔“ ڈی کوشانے کہا۔

”یہی ہے اور کون ہو سکتا ہے۔“ نوکھانے سجاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیوں اوئے بچو! وہ کون تھے اور ان سے کیا رشتہ داری ہے تمہاری؟“

”نکواس کر رہے ہو تم.... میں کچھ نہیں جانتا۔“ سجاد نے جواب دیا۔

”رحیم بخش کو واپس آ لینے دو.... تم سے تو میں ایک منٹ میں اگلا لوں گا۔“ نوکھانے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”ویسے ایک بات سن لو.... اگر ٹھینہ بی بی کو ذرا سا نقصان بھی پہنچا تو میں تمہارے جسم کی اتنی بوٹیاں کروں گا کہ کوئی گن نہیں سکے گا۔“

اسی دوران رحیم بخش واپس آگیا۔

”میں نے فون پر ملا بشریچ گوری کو بتا دیا ہے وہ کچھ دیر میں یہاں پہنچ جائے گا۔ بیچ گوری وہ آدمی ہے جو اپنے وفاداروں کے لئے تو موت سے بھی لڑ جاتا ہے لیکن غداروں کو وہ کبھی معاف نہیں کرتا۔“ اس نے سجاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مم... میں نے کچھ نہیں کہا۔“ سجاد جلدی سے بول اٹھا۔

”تمہارا شروع سے اب تک یہی ایک جواب رہا ہے۔“ رحیم بخش نے کہا۔ ”اب تو بشریچ گوری ہی تم سے پوچھے گا کہ بے قصور کون ہے اور قصور کس کا ہے۔“

”دیکھو رحیم بخش۔“ سجاد اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہم پرانے ساتھی ہیں۔ ایک سال ہو گیا ہے ہمیں ایک ساتھ رہتے ہوئے۔ تم جانتے ہو اس ایک سال میں کبھی ایسی کوئی بات نہیں

کسی خوبصورت لڑکی کا ہو تو وہاں کسی دشمنی کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ شینہ جیسی حسین لڑکیاں بہت کم نظر آتی ہیں۔ اسی کو دیکھ کر اس کی نیت میں فتور آگیا ہو گا۔ تھوڑی دیر پہلے رحیم بخش نے بتایا تھا کہ یہ سجاو ایک سال پہلے بمبئی کے متان دادا کے پاس تھا۔ اس کے ساتھ کوئی فراڈ کر کے بھاگا تھا اور ملا بشریخ گوری نے اسے پناہ دی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے وہ بھی ایک ڈرامہ ہی تھا۔ اس قسم کے لوگ بڑے لمبے منصوبے بنایا کرتے ہیں۔“

”متان دادا کون ہے؟“ اس مرتبہ شارق نے پوچھا۔

”بمبئی کا سونے کا بہت بڑا اسمگلر۔“ ڈی کوٹا نے جواب دیا۔ ”کچھ عرصہ پہلے تک تو وہ صرف سونے کی اسمگلنگ کیا کرتا تھا لیکن پھر سنا تھا کہ ہیروئن کا پیسہ بھی اس کے منہ کو لگ گیا تھا۔ خلیج کی ریاستوں سے جتنا سونا وہ اسمگل کرتا ہے اتنا اس خطے کے سات اسمگلر مل کر بھی نہیں کرتے ہوں گے۔۔۔ تم لوگ اس لائن میں نئے نئے آئے ہو۔ آہستہ آہستہ سب کے بارے میں جان جاؤ گے کہ کون کیا کرتا ہے۔“

”اب بات میری سمجھ میں آرہی ہے۔“ شارق نے کہا۔ ”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت بمبئی کے متان دادا کا گروہ چھوڑ کر آیا تھا اور ملا بشریخ گوری کے گروہ میں محض اس لئے شامل ہوا تھا کہ اس کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد اس کے راز متان دادا کو پہنچاتا رہے؟“

”میرا مطلب بالکل یہی تھا۔“ ڈی کوٹا نے کہا۔ ”اب تو یہ ملا بشریخ گوری کو ہی پتہ ہو گا کہ اس ایک سال کے عرصہ میں اس گینڈے کی وجہ سے اسے کوئی نقصان اٹھانا پڑا ہے یا نہیں۔“

”ایک اور بات میرے ذہن میں آرہی ہے۔“ نوکھانے کہا۔ ”جس روز ہم لوگ یہاں آئے تھے اس کے اگلے ہی روز کوٹ گارڈ والے ہمارے بارے میں معلوم کرنے آئے تھے جنہیں رحیم بخش نے بھاگا دیا تھا اور ملا بشریخ گوری سے ان کی شکایت بھی کی تھی اور انہیں اسی روز ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ اس سے ایک بات تو یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اس ملا بشریخ گوری کے تعلقات بہت ہیں۔ اور دوسری بات جو میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ انہوں نے ملا بشریخ گوری سے انتقام لینے کے لئے یہ سب کچھ کیا ہو۔ انہوں نے کسی طرح سجاو کو اپنے ساتھ ملا لیا ہو اور کہا ہو کہ اگر ہم لوگ یہاں چھپے ہوئے ہوں تو انہیں اطلاع دے دے۔ برے ذہن میں یہ شبہ اس لئے بھی ابھرتا ہے کہ سجاو آج دن بھر ڈیرے سے غائب رہا تھا۔ ممکن ہے اس نے ان لوگوں سے مل کر پروگرام بنایا ہو اور جینیسی والے حصے کی بتیاں بھی اسی نے بھجوائیں ہوں حالانکہ وہ بتیاں رات بھر جلتی رہتی ہیں۔“

ہوئی۔ میں ہمیشہ ملا بشریخ گوری کا وفادار رہا ہوں۔“

”تم جیسے لوگوں کا ایمان بدلتے دیر نہیں لگتی۔“ رحیم بخش نے کہا۔ ”ایک سال پہلے تم بمبئی میں متان دادا کے پاس تھے نا۔۔۔ اسے چھوڑ کر تم ملا بشریخ گوری کے پاس آ گئے تھے۔ متان دادا کے پاس تم نے کوئی لمبا ہی ہاتھ مارا تھا کیونکہ وہ تقریباً چار مہینے تک ملا بشریخ گوری کے پیچھے لگا رہا تھا کہ تمہیں اس کے حوالے کر دیا جائے مگر ملا بشریخ گوری تمہیں پناہ دے چکا تھا۔ اس نے کسی قیمت پر بھی تمہیں متان دادا کے حوالے نہیں کیا۔ اور تم نے اس نیکی کا یہ صلہ دیا کہ مہمانوں کے سامنے اس کی عزت خاک میں ملا دی۔ ملا بشریخ گوری تھوڑی دیر میں یہاں آنے والا ہے۔ وہ خود ہی تم سے سب کچھ معلوم کر لے گا۔“

”میں بے قصور ہو رحیم بخش۔“ سجاو کراہا۔ ”دیکھو۔۔۔ دیکھو میری ٹانگ زخمی ہے۔۔۔ خون بر رہا ہے۔ اس کا کوئی۔۔۔“

”اگر تھورا سا خون بہہ بھی جائے تو تم جیسے گینڈے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔“ رحیم بخش نے کہا۔ ”تھوڑی دیر اور انتظار کر لو۔ ملا بشریخ گوری ہی آ کر یہ فیصلہ کرے گا کہ اس زخم پر مرہم لگایا جائے یا اس زخم کو اور پھیلایا جائے۔“

”اب بھی وقت ہے واجہ۔“ محمد دین نے سجاو کی طرف دیکھا۔ ”سب کچھ بتا دو۔ لڑکی کو ہم برآمد کر لیں گے اور ملا بشریخ گوری کو بھی سنبھال لیں گے۔“

”یہ کچھ نہیں بتائے گا محمد دین۔“ رحیم بخش نے کہا۔ ”تم گیٹ پر جاؤ۔ واجہ بشریخ گوری آنے ہی والا ہو گا۔ وہ میری بات سنتے ہی غصے میں آگیا تھا اور فوراً ہی روانہ ہو گیا تھا۔“

”جاتا ہوں واجہ۔“ محمد دین نے کہا اور اپنی رائفل سنبھالے گیٹ سے نکل گیا۔

”تم لوگ میرے ساتھ دوسرے کمرے میں آ جاؤ۔ اب اس کے پاس بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ رحیم بخش نے شارق وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ تینوں رحیم بخش کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گئے۔ رحیم بخش تو انہیں چھوڑ کر کمرہ اور چلا گیا اور وہ تینوں صورت حال پر اظہار خیال کرنے لگے۔

”ہم یہاں بالکل اجنبی ہیں کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم یہاں پر موجود ہیں پھر وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟“ شارق نے کہا۔

”یہ ساری اسی کی سازش ہے۔“ نوکھانے اشارہ سجاو کی طرف تھا۔ ”لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو ہم سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“

”تم بھی بہت بھولے ہو نوکھانے۔“ ڈی کوٹا نے کہا۔ ”بات دشمنی کی نہیں لیکن اگر معاملہ

نست اچھی تھی کہ میں بچ گیا۔ اور پھر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن راقل میرے ہاتھ میں آگئی اور میں نے گولی چلا دی جو اس کی ٹانگ میں لگی اور وہ زخمی ہو کر گر پڑا۔ میں اسے لے کر لانچ پر آگیا۔ ہم سے بھلا اس کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ یہ تو آپ کے خلاف سازش ہے۔ آپ کو بدنام کرنے کے لئے اور یہ آج دن میں غائب بھی رہا تھا۔ مجھے تو شک ہے کہ یہ سازش اس نے دن کے وقت ہی کسی کے ساتھ مل کر تیار کی تھی۔ جیسی کے ایریا میں رات کو بتیاں جلی رہتی ہیں لیکن آج وہ بتیاں بھی بجھی ہوئی تھیں۔

”یہ کہاں گیا تھا رحیم بخش؟“ ملا پنج گوری نے پوچھا۔

”یہ تو یہ بول کر گیا تھا کہ اسے شہر سے اپنی کچھ چیزیں لانی ہیں۔“ رحیم بخش نے جواب دیا۔

”اور جیسی کی بتیاں کیسے بجھی ہوئی تھیں؟“ ملا پنج گوری نے پوچھا۔

”بات یہ ہے واجہ میں اور محمد دین دو تین دن سے مسلسل جاگتے رہے تھے۔ آج ہم نے جلا کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔ میں اور محمد دین اپنے کمرے میں جا کر سو گئے تھے۔ پھر چیخوں کی آواز سن کر میری آنکھ کھلی تھی۔“

”اس طرح تو شک اسی پر جاتا ہے۔“ پنج گوری اٹھتے ہوئے بولا۔ ”تو چلو ذرا اس سے معلوم کرتے ہیں۔“

وہ تینوں بھی اٹھ گئے۔ وہ لوگ کمرے سے نکل کر برآمدے میں چلتے ہوئے اس کمرے کی طرف چلنے لگے جہاں سجاد کو رکھا گیا تھا۔ برآمدے کے سامنے گاڑیوں کے قریب ملا پنج گوری کے گن مین کھڑے تھے۔

وہ لوگ کمرے میں داخل ہو گئے۔ سجاد بندھا ہوا فرش پر پڑا تھا۔ ملا پنج گوری کو دیکھ کر اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

”سنا ہے تم زخمی ہو گئے ہو۔ کیا ہوا واجہ سجاد۔۔۔۔۔ کس نے گولی ماری ہے تمہیں اس کا نام بتاؤ۔۔۔۔۔ ابھی دیکھو تمہارے سامنے اس کے کٹڑے کرتا ہوں۔“ ملا بشیر پنج گوری نے سجاد کی طرف دیکھتے ہوئے ہمدردانہ اور نرم لہجے میں کہا۔ ”کس میں اتنی اہمیت ہے کہ ہمارے ہی علاقے میں ہمارے ہی آدمی کو گولی مار دے؟“

ملا بشیر پنج گوری کے چہرے پر نرمی اور لہجے میں ہمدردی پا کر سجاد کے چہرے پر کچھ رونق سی لگی۔ وہ اہمیت پا کر نوکھا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”یہ ہے واجہ۔۔۔۔۔ اس نے مجھے گولی ماری تھی۔ اس نے تو مجھے قتل کرنا چاہا تھا مگر نست اچھی تھی کہ میں بچ گیا۔“

”ہو سکتا ہے یہ بات بھی ہو۔“ ڈی کوشا نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال‘ حقیقت کیا ہے؟ یہ تو ملا پنج گوری کے آنے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔ وہ سب کچھ معلوم کر لے گا۔“

وہ باتیں کر رہے تھے کہ حویلی کے اندر دو تین گاڑیاں رکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ تینوں اٹھ کر دروازے میں آگئے۔ ایک مرسیڈز کار تھی اور اس کے آگے اور پیچھے دو جیپیں تھیں۔ ہر جیپ میں چار چار گن مین بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تینوں وہیں کھڑے گاڑیوں کی طرف دیکھتے رہے۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے اور اس وقت ملا پنج گوری کی آمد کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اس معاملے کو بہت زیادہ اہمیت دی تھی۔

مرسیڈز کار کا دروازہ کھلا اور ملا بشیر پنج گوری برآمد ہوا۔ اس نے دیسا ہی لباس پہن رکھا تھا۔ لمبا سا چنہ‘ سر پر سیاہ ریشمی رومال اور ہاتھ میں تسبیح۔ اس نے کار سے اتر کر ان لوگوں کی طرف سرسری سے انداز میں دیکھا تھا پھر اپنے مخصوص کمرے میں چلا گیا۔ رحیم بخش بھی اس کے ساتھ ہی کمرے میں گیا تھا۔ وہ تینوں برآمدے میں کھڑے انتظار کرتے رہے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد رحیم بخش کمرے سے باہر آیا اور اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے اشارہ کیا۔ وہ تینوں اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گئے۔ ملا پنج گوری مخصوص انداز میں گاڑی سے نیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں تسبیح تھی اور تسبیح کے دانے مسلسل چل رہے تھے۔ اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ سنجیدگی تھی۔ اس نے ان تینوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ اس کے سامنے قالین پر بیٹھ گئے۔

”یہ جو کچھ بھی ہوا مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔“ ملا پنج گوری نے کہا۔ ”اس سے ہم بلوچوں کی روایت کو نہ صرف شدید دھچکا پہنچا ہے بلکہ میرے اعتماد کو بھی نہیں پہنچائی گئی ہے۔ ہم بلوچ تو مہمانوں کے لئے اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ ہمارا کوئی جانی دشمن بھی مہمان بن کر آ جائے تو ہم اپنی روایات کے مطابق اپنی حیثیت سے بڑھ کر اس کی خدمت کرتے ہیں۔ لیکن یہاں جو کچھ بھی ہوا اس سے اگرچہ میرا لیا میرے آدمیوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ لیکن مجھے اس پر بہت شرمندگی ہے۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ جہاں مختلف لوگ گروہ کی صورت میں کام کر رہے ہوں ان میں ایک آدھ کالی بھیڑ بھی گھس ہی آتی ہے۔ یہاں بھی معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ ابھی پتہ چل جائے گا کہ قصہ کیا ہے مگر نوکھا بھائی۔۔۔۔۔ پہلے تم بتاؤ۔۔۔۔۔ کیا ہوا تھا؟“

نوکھا اسے صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔

”جب میں نے یہ کہا کہ اس گاڑی کے نمبر سے ان لوگوں کے بارے میں معلوم کیا جا سکتا ہے اور پھر میں نمبر دیکھنے کے لئے جھکا تو سجاد نے راقل کے بٹ سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ وہ تو

”کیوں واجہ نوکھا؟“ ملا بشیر بچ گوری نوکھا کی طرف گھوم گیا۔ ”کیا تم کو پتہ نہیں تھا کہ میرا آدمی ہے۔“

”واجہ بچ گوری.... ابھی تو.... آپ....“ نوکھا ہلکا کر رہ گیا۔ شارق اور ڈی کوٹا کے چروں پر بھی ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔

”کیا تمہیں پتہ نہیں تھا کہ ایک سال پہلے جب یہ بمبئی کے متان دادا کے پاس سے بھاگ کر آیا تھا تو میں نے اسے پناہ دی تھی اور میں جس کو پناہ دیتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بدترین دشمن بھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ کیا تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ جب سے یہ سجاد میرے پاس آیا ہے میں تین مرتبہ بھاری نقصان اٹھا چکا ہوں۔ دو مرتبہ میری لانیچیں پکڑی گئیں اور تیسری مرتبہ بمبئی میں میرے گودام پر چھاپہ مار کر میرا لاکھوں کا مال پکڑا گیا۔ کیا تمہیں پتہ نہیں تھا کہ میں اس کی ساری حرکتوں کو نظر انداز کرتا رہا تھا اور اسے ڈھیل دے رکھی تھی....“

نوکھا اور شارق وغیرہ کے چروں کی رنگت اعتدال پر آنے لگی۔ انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ سجاد کے جرائم گنوا رہا تھا اور اسے باور کروا رہا تھا کہ وہ اس کی حرکتوں سے کبھی بھی باخبر نہیں رہا تھا۔ اس کے برعکس سجاد کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے ابھرنے لگے تھے۔ وہ وحشت زدہ سی نظروں سے ملا بشیر بچ گوری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ واجہ بچ گوری بدستور نرم لمبے میں کہہ رہا تھا۔

”جب پہلی مرتبہ سمندر میں مال سے بھری ہوئی میری لانیچ پکڑی گئی تھی تو میں اسے محض ایک اتفاق سمجھا تھا لیکن اس کے ایک مہینے بعد جب دوسری لانیچ پکڑی گئی تو مجھے شبہ ہوا کہ مخبری کی گئی ہے۔ میں سوچے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ میرے آدمیوں میں ایسا کون ہو سکتا ہے جو میرے خلاف مخبری کرنے کی جرات کر سکتا ہو۔ مجھے اس شخص پر شبہ تھا۔ میں نے یہ بات اس کے کانوں میں ڈال دی کہ دو دن بعد میرا مال بمبئی کے گودام میں پہنچنے والا ہے۔ میری توقع کے عین مطابق تین دن بعد گودام پر چھاپہ پڑا۔ پولیس کو وہاں سے کچھ نہیں ملا تھا لیکن میں نے اس کے سامنے بتایا کہ میرا لاکھوں کا مال پکڑا گیا ہے۔ اس نے افسوس کا اظہار کیا لیکن اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک میں نے دیکھ لی تھی۔ اگرچہ میرے شبہ کی تصدیق ہو گئی تھی کہ وہ مخبری ہی ہے مگر میں نے اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ یہ تقریباً پندرہ دن پہلے کی بات ہے۔ میں اسے ایک اور موقع دینا چاہتا تھا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تین چار دن پہلے میں نے اسے بتایا کہ پاکستان کی ایک پارٹی کے کچھ آدمی میرے پاس آئے ہوئے ہیں۔ اس سے اچھے

ہی روز کوٹ گارڈ کے دو آدمی چیکنگ کے لئے یہاں بھی پہنچ گئے۔ رحیم بخش نے مجھے اطلاع دی تو میں نے انہیں نوکری ہی سے نکلوا دیا۔ سجاد کے بارے میں میرا خیال تھا کہ یہ تم لوگوں کے ساتھ مل کر میرے خلاف کوئی سازش کرے گا۔ لیکن اس نے شاید کچھ اور سوچا تھا۔ مجھے معلوم ہے اس لڑکی کو کون اٹھا کر لے گیا ہو گا اور میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اسے برآمد کر سکتا ہوں لیکن میں اس کی زبان سے سنتا چاہتا ہوں کہ لڑکی کہاں ہے....“ وہ سجاد کی طرف گھوم گیا۔ ”کیوں واجہ سجاد؟“ اس مرتبہ اس کے ہونٹوں سے نکلنے والی آواز سانپ کی پھنکار سے مشابہہ تھی۔ ”خود بتاؤ گے وہ لڑکی کہاں ہے یا میں اپنے آدمیوں سے کچھ کہوں؟“

”مہ... میں کچھ نہیں جانتا واجہ۔“ سجاد کانپ گیا۔

”نہیں کالفظ میں نے کبھی نہیں سنا۔“ ملا بچ گوری پھنکارا۔

”واجہ میں....“

”رحیم بخش....“ ملا بشیر بچ گوری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے رحیم بخش کی طرف دیکھا۔ ”ہم دوسرے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ اس سے پانچ منٹ میں معلوم کرو کہ لڑکی کہاں ہے؟ اگر تم چاہو تو باہر سے کسی کو مدد کے لئے بلا سکتے ہو اور محمد دین.... واجہ تم ہم لوگوں کو چائے تو پلاؤ۔“

ملا بشیر بچ گوری شارق وغیرہ کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد سجاد کی چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی۔

تقریباً پندرہ منٹ گزر گئے۔ محمد دین قہو لے کر آ گیا لیکن رحیم بخش نے ابھی تک آکر رپورٹ نہیں دی تھی۔ وہ لوگ چائے پی رہے تھے کہ رحیم بخش آ گیا۔

”کیا بولا اس نے؟“ ملا بشیر بچ گوری نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”لڑکی کو سلمان اور اس کے ساتھی اٹھا کر لے گئے ہیں۔“ رحیم بخش نے بتایا۔

”سلمان کون ہے؟“ ملا بچ گوری نے پوچھا۔

”کوٹ گارڈ کا وہ آدمی جو یہاں آیا تھا اور جسے آپ کے کہنے پر نوکری سے نکال دیا گیا تھا۔“ رحیم بخش نے بتایا۔

”مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔“ ملا بچ گوری بولا۔ ”وہ لوگ شاید لڑکی کو اپنے محکمہ کے افسروں کے سامنے پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ میں نے اپنے ڈیرے میں غیر ملکیتوں کی موجودگی کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ وہ مجھے جھوٹا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکی کو کہاں لے کر گئے ہیں؟“

”مرشد کے ڈیرے پر۔“ رحیم بخش نے بتایا۔

”تین چار آدمیوں کو لے کر جاؤ اور لڑکی کو لے کر آؤ۔ ان کے کتنے بھی آدمی مرتے ہیں، مر

جانے دو۔۔۔ میں مج سے پہلے پہلے لڑکی کو یہاں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ ملائچ گوری نے کہا۔
”سجاد کا کیا کریں واجہ؟“ رحیم بخش نے پوچھا۔

ملا بشریچ گوری نے منہ سے جواب دینے کے بجائے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے نیچے کی طرف اشارہ کر دیا۔

”ٹھیک ہے واجہ، سمجھ گیا۔“ رحیم بخش نے کہا۔

”واجہ! اگر آپ اجازت دو تو میں اس کے ساتھ چلا جاؤں۔“ نوکھا نے کہا۔

ملا بشریچ گوری چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اس نے نوکھا کو ان لوگوں کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔

نوکھا رحیم بخش کے ساتھ اس کمرے میں آگیا جہاں وہ لوگ سجاد کو چھوڑ کر گئے تھے۔ اس وقت سجاد کو دیکھ کر نوکھا کانپ اٹھا۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں سے خون نہ بہ رہا ہو۔ فرش بھی دور دور تک خون سے تر ہو رہا تھا۔ سجاد مرا نہیں تھا زندہ تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر وہ ہوش میں تھا آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں لیکن اس کی آنکھیں فوراً ہی بند ہو گئیں۔

رحیم بخش نے دو آدمیوں کو باہر سے بلوایا۔ وہ بھی سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے اور ان کے سروں پر بھی روایتی انداز میں سیاہ روبل بندھے ہوئے تھے۔

”اس کو اٹھا کر جیب میں ڈالو اور ایک بڑی رسی بھی لے لو۔“ مولا داد اور دادو سے کہو وہ بھی جیب میں بیٹھ جائیں۔ تم لوگ بھی جیب میں بیٹھو اور اپنا اسلحہ پاس رکھو۔“ رحیم بخش نے کہا۔

وہ دونوں زخموں سے چور سجاد کو اٹھا کر ایک جیب کی طرف لے گئے۔ ان میں سے ایک کا نام مولا بخش تھا اور دوسرے کو رحیم بخش نے تربتی کے نام سے مخاطب کیا تھا۔

رحیم بخش کے اپنے پاس بھی ایک آئوٹنک رائفل موجود تھی جس میں ایک میگزین توف تھا اور ایک فاضل میگزین اس کے ساتھ ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ وہ ایک کمرے سے جا کر ایک اور رائفل لے آیا۔ اس کے ساتھ بھی دو میگزین تھے۔

”رائفل چلانا جانتے ہو نا واجہ نوکھا؟“ اس نے دوسری رائفل نوکھا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”زندگی میں یہی سب کچھ تو سیکھا ہے واجہ۔“ نوکھا اس سے رائفل لے کر چیک کرنے لگا۔ وہ سب لوگ ایک جیب پر سوار ہو گئے۔ جیب کے پچھلے حصے میں دو سیٹیں آنے ساتھ تھیں۔ مولا بخش اور دادو ایک سیٹ پر بیٹھے تھے اور تربتی اور مولا داد سامنے والی سیٹ پر۔ ان

چاروں کے پاس اسی قسم کی آئوٹنک رائفلیں تھیں۔ ان کے درمیان فرش پر سجاد پڑا تھا۔ اس کے جسم کو بار بار ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔

رحیم بخش ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا اور نوکھا اس کے ساتھ والی سیٹ پر۔ جیب اشارت ہو کر حویلی کے گیٹ سے نکلی۔ کچھ دور تک پختہ سڑک پر دوڑتی رہی پھر سڑک چھوڑ دی گئی۔ اب جیب ریگستان میں دوڑ رہی تھی۔ ریت سخت تھی اور ہیڈ لمپس کی روشنی میں جھاڑیاں بکثرت نظر آ رہی تھیں۔

جیب تقریباً ایک میل تک ویرانے میں دوڑتی رہی پھر ایک جگہ رک گئی۔ ہیڈ لمپس کی روشنی میں ٹیلا نما چھوٹی چھوٹی چٹائیں نظر آ رہی تھیں۔ سائے میں شور کی آواز سن کر نوکھا کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ ان چٹانوں کے دوسری طرف سمندر تھا جس کی لہریں چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

رحیم بخش کی ہدایت پر دادو اور تربتی نے زخمی سجاد کو جیب سے اتار کر زمین پر ڈال دیا۔ مولا داد ایک بڑا سا پتھر اٹھا لایا جسے رسی کی مدد سے سجاد کے سینے پر باندھ دیا گیا اور پھر تربتی اور دادو سجاد کو اٹھا کر چٹانوں کی طرف لے گئے۔ وہ کچھ دیر تک ہیڈ لمپس کی روشنی میں نظر آتے رہے پھر چٹانوں کے پیچھے غائب ہو گئے۔ دس منٹ بعد وہ خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ نوکھا کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ لوگ سجاد کو سمندر میں پھینک آئے تھے۔ تربتی اور دادو نے کچھ ریت اٹھا کر جیب کے فرش پر ڈال دی جہاں سجاد کے جسم سے بننے والا خون بکھرا ہوا تھا۔ وہ لوگ جیب پر بیٹھ گئے اور جیب ایک بار پھر حرکت میں آگئی۔ اس مرتبہ جیب کا رخ مخالف سمت میں تھا۔

جب وہ لوگ حویلی سے روانہ ہوئے تھے تو تین بجے تھے۔ جیب تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک تیز رفتاری سے دوڑتی رہی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دادو وغیرہ بلوچی زبان میں باتیں کر رہے تھے بلکہ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا نوکھا ہیڈ لمپس کی روشنی میں خاموشی سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ دائیں طرف بہت دور کہیں کہیں جھللاتی ہوئی سی روشنیاں دکھائی دی تھیں مگر ان کے راستے میں ویرانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

دفعتاً رحیم بخش نے جیب کی تمام بتیاں بجھا دیں۔ نوکھا ایک دم اچھل پڑا۔ روشنیاں بند کر دینے کے باوجود جیب کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا یہ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ جیب کسی نہ دیکھے کھڈ میں بھی گر سکتی تھی۔ لیکن رحیم بخش تقریباً پندرہ منٹ تک جیب کو اسی رفتار سے ڈالتا رہا پھر جب اس نے رفتار کم کی تو نوکھا کے منہ سے بے اختیار گمراہ سانس نکل گیا تھا۔ جیب اب ڈھلان پر تھی لیکن اس کی رفتار بتدریج کم ہو رہی تھی۔ رحیم بخش شاید اس

تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر رک گئے۔ اب آگے جھاڑیاں کچھ چھدری ہو گئی تھیں اور ویسے بھی اب آگے بڑھنے میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی کیونکہ وہ لوگ بھی غیر محتاط نہیں ہوں گے۔

”دادو.... مولا بخش.....“ رحیم بخش نے سرگوشی کی۔ ”تم دونوں اس طرف جاؤ اور دیوار کے ساتھ گھوم کر دوسری طرف سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرو۔ مولا دادو اور ترقی تم دونوں سامنے سے دیوار پر چڑھو گے۔ لیکن تم دونوں کے درمیان کم از کم پندرہ فٹ کا فاصلہ ہونا چاہئے۔ تم لوگ اس وقت تک فائر نہیں کرو گے جب تک کسی اور طرف سے فائر نہ ہو اور نوکھا.... تم میرے ساتھ آؤ۔“

وہ چاروں رحیم بخش کی ہدایات کے مطابق بتائی ہوئی سستوں میں چل دیئے جبکہ نوکھا، رحیم بخش کے ساتھ دائیں طرف چلنے لگا۔ جھاڑیاں اب بہت ہی چھدری ہو گئی تھیں اور اندیشہ تھا کہ تاریکی ہونے کے باوجود وہ کسی کی نظروں میں نہ آجائیں۔

دیوار کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے اور پھر اس کے ساتھ چپک کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ رحیم بخش آگے تھا اور اس کے چار قدم کے فاصلے پر نوکھا۔ دیوار کے موڑ پر پہنچ کر وہ ایک بار پھر رک گئے۔ رحیم بخش نے جھانک کر دوسری طرف دیکھا اور پھر نوکھا کو اشارہ کرتا ہوا دوسری طرف مڑ گیا۔ نوکھا بھی بہت احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا اس طرف مڑ گیا۔

اس طرف تقریباً بیس گز آگے گیٹ تھا مگر وہاں روشنی کا بندوبست نہیں تھا۔ اگر کوئی بندوبست تھا بھی تو بتی نہیں جلائی گئی تھی۔ وہ ابھی گیٹ سے چند گز کے فاصلے پر تھے کہ حویلی کے پچھلی طرف سے اچانک ہی فائر کی آواز سنائے میں گونج اٹھی۔ جس طرف سے فائر کی آواز سنائی دی تھی اس طرف دادو اور مولا بخش گئے تھے۔ غالباً انہیں دیکھ لیا گیا تھا لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ پہلی گولی کس نے چلائی تھی۔ دادو وغیرہ نے یا مخالف پارٹی کے کسی آدمی نے۔

رحیم بخش دوڑتا ہوا گیٹ کے قریب پہنچ گیا۔ نوکھا نے بھی اس کا ساتھ دینے میں تاخیر نہیں کی تھی۔ رحیم بخش گیٹ پر چڑھ رہا تھا کہ ذیلی دروازہ کھلا اور ایک آدمی چپتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں آٹومیک رائفل تھی۔ وہ رحیم بخش کی طرف رائفل سیدھی کرتا ہی چاہتا تھا کہ نوکھا نے اپنی رائفل کو نال سے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھما دیا۔ رائفل کا بٹ اس شخص کی کھوپڑی پر لگا۔ وہ شخص چپتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ اس کی کھوپڑی پاش پاش ہو گئی تھی۔ رائفل اس کے ہاتھ سے پھوٹ کر گر گئی تھی۔

اب حویلی میں مختلف سستوں میں فائرنگ ہو رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ دونوں پارٹیاں ٹکرا

ڈھلان کی وجہ سے محتاط ہو گیا تھا۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ مزید طے ہو جانے کے بعد جیب کی رفتار مزید کم ہو گئی.... سامنے بہت دور کسی قدر دائیں طرف ٹھنماتی ہوئی سی ایک روشنی نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے کسی اونچی جگہ کوئی بلب لگایا گیا ہو۔ رحیم بخش نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر دادو سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ اس نے بھی جواب میں کچھ کہا اور رحیم بخش نے جیب بائیں طرف موڑ دی۔

اس طرف کچھ ہی آگے جا کر قد آدم جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جھاڑیوں میں کافی اندر جانے کے بعد رحیم بخش نے جیب روک لی اور انجن بند کر دیا۔ انجن بند ہوتے ہی وہ سب لوگ نیچے اتر آئے اور جھاڑیوں میں ایک طرف چلنے لگے۔ نوکھا، رحیم بخش کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ جھاڑیاں کانٹے دار تھیں۔ نوکھا کے ہاتھوں پر ایک دو جگہ خراشیں بھی آئی تھیں جن میں جلن سی ہونے لگی تھی۔

تقریباً ایک میل تک جھاڑیوں میں چلتے ہوئے وہ دائیں طرف مڑ گئے۔ اب وہ اس روشنی کی طرف بڑھ رہے تھے جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ نوکھا کو سمجھنے میں یہ نہیں لگی کہ یہی وہ جگہ تھی جہاں انہیں چھاپہ مار کارروائی کرنا تھی اور غالباً اسی جگہ کو رحیم بخش نے مرشد کے ڈیرے کا نام دیا تھا۔

تقریباً نصف میل تک چلتے رہنے کی بعد وہ ایک جگہ رک گئے۔ اب وہ عمارت بھی نظر رہی تھی جس پر بلب جل رہا تھا۔ اس کے اطراف میں اونچی چار دیواری تھی۔ اور داخلے کا گیٹ غالباً دوسری طرف تھا۔ نوکھا کے اندازے کے مطابق وہ عمارت وہاں سے تقریباً دو سو گز دور تھی۔ وہ سب لوگ رک کر بلوچی زبان میں آپس میں مشورہ کرنے لگے۔

نوکھا خاموش کھڑا تاریکی میں ادھر ادھر گھورتا رہا۔ ان کی باتوں کا ایک لفظ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ تقریباً پانچ منٹ تک آپس میں مشورے کرتے رہے اور پھر آگے چل پڑے۔ اب وہ محتاط انداز میں چل رہے تھے۔ ان سب نے رائفلیں تان رکھی تھیں جنہیں کسی بھی لمحہ استعمال کیا جاسکتا تھا۔ نوکھا نے بہت سی ایسی فلمیں دیکھی تھیں جن میں چند فوجی کمانڈرز کسی خاص مشن پر روانہ ہوتے ہیں۔ اس وقت نوکھا بھی اپنے آپ کو کسی ایسے ہی مشن کا ایک حصہ سمجھ رہا تھا اور حقیقت بھی یہ تھی کہ یہ ایک کمانڈو آپریشن ہی تھا۔ جس میں جان جانے کا خطرہ بھی تھا۔ نوکھا اپنے آپ میں عجیب سی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ اپنے ملک میں رہتے ہوئے اس کا کئی مرتبہ پولیس مقابلہ ہوا تھا، مخالف پارٹیوں سے محاذ آزمائی ہوتی رہتی تھی لیکن ایسی سنسنی اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ اجنبی ملک تھا۔ اجنبی لوگ تھے۔

علاوہ کوئی اور بھی وہاں موجود ہو۔ حویلی میں موجود آدمیوں کی تعداد کے اندازے میں بھی نوکھا کو غلطی ہو سکتی تھی۔ ممکن ہے وہاں چھ سے زیادہ آدمی موجود ہوں۔

نوکھانے برآمدے کی طرف دیکھا اور پھر چوترے کی طرف دیکھنے لگا۔ چوترے تک اس کا پہنچنا بہت ضروری تھا۔ اس نے رانفل کو آٹومیک پر سیٹ کیا اور برآمدے کی طرف گولیاں برساتا ہوا چوترے کی طرف دوڑا۔ جواب میں برآمدے کی طرف سے بھی شدید فائرنگ کی گئی لیکن نوکھا محفوظ جگہ پر پہنچ چکا تھا۔ برآمدے کی طرف سے چلائی جانے والی تمام گولیاں لینڈ کروزر میں لگیں۔ کم از کم دو گولیاں گاڑی کی پیڑول ٹینکی میں لگی تھیں ایک زور دار دھماکہ ہوا اور لینڈ کروزر کے پرچے اڑ گئے۔

نوکھا چوترے کی آڑ میں پہنچ چکا تھا۔ وہ وحشت زدہ سی نظروں سے آگ کے اس گولے کو دیکھ رہا تھا جو اوپر اٹھتا جا رہا تھا۔ لینڈ کروزر کے کئی ٹکڑے بھی ہوا میں اڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ نوکھا یہ سوچ کر ہی کانپ اٹھا تھا کہ اگر وہ گاڑی کے قریب موجود ہوتا تو اس کے جسم کے ٹکڑے بھی اسی طرح چاروں طرف فضا میں بکھر جاتے۔

وہ دراصل چوتہ نہیں تھا بلکہ حوض تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ یہ پانی غالباً پودوں وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اگر پینے کے لئے ہوتا تو حوض پر کوئی ڈھکنا ہوتا۔

نوکھا حوض کی آڑ سے برآمدے کی طرف دیکھنے لگا۔ یہاں سے برآمدہ صاف نظر آ رہا تھا۔ لیکن اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہاں کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ برآمدے میں کمروں کی ایک قطار تھی جن کے وسط میں غالباً اوپر جانے کے لئے زینہ تھا۔ جہاں بہت مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ غالباً اوپر کسی جگہ بلب جل رہا تھا جس کی بہت مدھم روشنی نیچے بھی پہنچ رہی تھی۔ نوکھا کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ برآمدے میں جو کوئی بھی تھا وہ اوپر جا چکا تھا۔ نوکھانے ایک لمحہ انتظار کیا پھر حوض کی آڑ سے نکل کر دوڑتا ہوا برآمدے میں آ گیا۔ ٹھیک اسی وقت ایک اور آدمی کسی طرف سے دوڑتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔ نوکھانے رانفل تان لی لیکن اس سے پہلے کہ ٹرائیگر دباتا ایک جاپانی پہچانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”میں ہوں نوکھا، گولی مت چلاتا۔“

وہ رحیم بخش تھا۔

”بچ گئے واجہ۔“ نوکھانے کہا۔ ”اگر تم بولتے نہیں تو میں گولی چلا دیتا۔“

”بچانے والا اللہ ہے واجہ نوکھا۔“ رحیم بخش نے جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں جلتی ہوئی گاڑی کی روشنی میں ادھر آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔“

گئی تھیں۔ رحیم بخش اس دوران گیٹ کے اوپر پہنچ چکا تھا لیکن نوکھا اس سے پہلے ہی ذیلی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ دفعتاً عمارت کی طرف سے ایک شعلہ چمکتے دیکھ کر نوکھا بڑی پھرتی سے زمین پر گر گیا۔ ٹھیک اسی لمحہ سنسناتی ہوئی گولی اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ اگر ایک لمحہ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو یہ گولی نوکھا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ڈھیر کر دیتی۔

نوکھانے اس طرف دیکھا جہاں سے گولی چلائی گئی تھی۔ جس شخص نے گولی چلائی تھی وہ برآمدے کے ایک ستون کی آڑ میں تھا۔ برآمدے میں تاریکی تھی۔ ایک ستون کے قریب حرکت محسوس کرتے ہی نوکھانے فائر کر دیا اور خود بھی بڑی پھرتی سے وہاں سے ہٹ گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد برآمدے کی طرف سے گولی چلائی گئی تھی جو ٹھیک اسی جگہ لگی تھی جہاں چند سیکنڈ پہلے نوکھا موجود تھا۔

نوکھانے ادھر ادھر دیکھا۔ رحیم بخش اب اسے کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ بائیں طرف ایک لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ نوکھا رینگتا ہوا اس گاڑی کے پیچھے چلا گیا اور گاڑی کی آڑ میں رک کر ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تقریباً دس گز آگے ایک چھوٹا سا چوترہ تھا۔ نوکھا اس چوترے کی طرف بڑھتا ہی چاہتا تھا کہ ایک فائر ہوا۔ گولی اس سے تقریباً تین فٹ آگے زمین پر لگی تھی۔ نوکھا دوبارہ گاڑی کی آڑ میں دب گیا۔ وہ اس چوترے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر وہاں تک پہنچ جائے تو عمارت میں داخل ہونا آسان ہو جائے گا۔

تین چار سمتوں سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ اس فائرنگ سے نوکھا کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس حویلی میں کم از کم چھ آدمی موجود تھے اور وہ سب کے سب فائرنگ کر رہے تھے۔

دفعتاً دائیں طرف سے چیخ کی ایک آواز سنائی دی۔ چھ میں سے ایک آدمی یا تو کوئی گولی لگنے سے ختم ہو گیا تھا یا زخمی ہوا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی ایک اور چیخ سنائی دی۔

نوکھا برآمدے کی طرف دیکھنے لگا کچھ ہی دیر بعد اس نے ایک سائے کو ستون کی آڑ سے نکل کر دوسرے ستون کی طرف دوڑتے دیکھ کر ٹرائیگر دبا دیا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی برآمدے سے ایک چیخ ابھری اور نوکھانے اس سائے کو گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ لینڈ کروزر کی آڑ سے نکلتا ہی چاہتا تھا کہ برآمدے کی طرف سے پھر فائر ہوا۔ نوکھا ایک بار پھر گاڑی کے پیچھے دب گیا۔ گولی ونڈ اسکرین کا شیشہ توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔

عمارت کے طویل برآمدے میں لاتعداد محرابیں بنی ہوئی تھیں اور کئی ستون تھے۔ ایک آدمی نوکھا کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا اور دوسرا اب بھی کسی ستون کے پیچھے موجود تھا۔ ممکن ہے اس کے

عمارت کے پچھلی طرف سے فائرنگ کی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔

”اوپر چلو واجہ نوکھا۔“ رحیم بخش نے کہا۔ ”اوپر دو تین آدمی ہیں اور میرا خیال ہے لڑکی بھی اوپر ہی ہے۔“

وہ دونوں بڑے محتاط انداز میں سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ ایک دائیں طرف کی دیوار کے ساتھ تھا اور دوسرا بائیں طرف۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ رحیم بخش نے جھانک کر دیکھا۔ اوپر ایک راہداری تھی جو خالی تھی۔ اس نے نوکھا کو اشارہ کیا۔

”تم اس طرف جاؤ۔ میں اس طرف جاتا ہوں۔“ رحیم بخش نے سرگوشی کی۔

نوکھا راتقل سنبھالے راہداری میں دائیں طرف گیا۔ اس طرف تین کمرے تھے تینوں دروازے بند تھے۔ ایک کمرے سے فائرنگ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ فائرنگ غالباً پچھلی کھڑکی سے کی جا رہی تھی۔

دفعۃً درمیان والے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک آدمی بڑی عجلت میں باہر نکلا اس کے ہاتھ میں راتقل تھی۔ نوکھا کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ اس نے راتقل سیدھی کرنا چاہی لیکن نوکھا اس سی پیلے ہی ٹرائیگر دبا چکا تھا۔ اس کی راتقل سے نکلنے والی دو گولیاں اس شخص کے سینے میں پیوست ہو گئیں اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

نوکھا دوڑتا ہوا دروازے میں گھس گیا۔ اس کمرے میں دو آدمی تھے اور وہ دونوں پچھلی طرف کی کھڑکیوں میں سے فائرنگ کر رہے تھے۔ وہ دونوں تیزی سے مڑے ان میں سے ایک کو تو نوکھا کی گولیوں نے ٹھنڈا کر دیا اور دوسرے نے راتقل پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ اسی کمرے میں فرش پر شینے بھی رسیوں سے بندھی ہوئی پڑی تھی۔

”میں آگیا ہوں شینے بی بی۔ گھبراؤ نہیں۔“ نوکھا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اس آدمی کی طرف رخ کر کے بولا۔ ”دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“ وہ شخص ایک لمحہ ضائع کئے بغیر دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر دیوار پر ٹکا دیئے تھے۔

”تم بلوچ تو نہیں لگتے۔ کیا نام ہے تمہارا؟“ نوکھا نے پوچھا۔

”میرا نام سلمان ہے۔ کراچی کا رہنے والا ہوں۔ یہاں کوسٹ گارڈز میں ملازم ہوں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”ہوں نہیں بلکہ تھے۔“ نوکھا نے کہا۔ ”چند روز پہلے تم نے ہم لوگوں کی تلاش میں ملا بشریج گوری کے ڈیرے پر چھاپہ مارا تھا اور ملا بشریج گوری نے تمہیں نوکری سے نکلا دیا تھا تم نے اس کا

نظام لینے کے لئے اس کی مہمان عورت کو اغواء کر لیا۔ تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو کہ بلوچ لوگ ماٹوں کے لئے اپنی جان بھی قربان کر دیتے ہیں۔ میں اگر چاہوں تو تمہیں اسی وقت گولی مار لوں۔ لیکن.... نہیں، میں تمہیں ملا بشریج گوری کے حوالے کروں گا۔ سزا تمہیں وہی دے گا۔“

”بچ تم لوگ بھی نہیں سکو گے۔“ سلمان نے کہا۔ ”میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا میں تو اپنی بیٹی دے رہا تھا۔ یہ میرا فرض تھا۔ لیکن ملا بشریج گوری نے مجھے نوکری سے نکلا دیا۔ میں اپنے بڑوں پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ملا کے ڈیرے پر جا کر میں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ تمہاری غمی کو میں نے اسی لئے اغوا کیا تھا کہ اسے ثبوت کے طور پر صبح اپنے افسروں کے سامنے پیش رکھوں۔ لیکن ملا بشریج گوری کے آدمی بڑی جلدی یہاں تک پہنچ گئے۔“

”تم نے ملا کے جس آدمی کو اپنے ساتھ ملایا تھا وہ دیکھنے میں تو بہت جی دار لگتا تھا لیکن بڑا مہمساکھا۔ دو ہاتھ بھی برداشت نہیں کر سکا اور اس نے سب کچھ اگل دیا کہ لڑکی کو اٹھا کر لے جانے والے کون لوگ ہیں اور اسے کہاں رکھا گیا ہے۔ اس لئے ہم لوگوں کو یہاں تک پہنچے میں براہ دیر نہیں گئی۔ لیکن تمہارے یہاں کے ساتھی بھی بڑے ڈھیلے نکلے۔ چند منٹ بھی تو مقابلہ کر سکے۔ ویسے یہ مرشد کون ہے؟“

”مرشد اس علاقے میں ملا بشریج گوری کا سب سے بڑا حریف ہے۔“ سلمان نے کہا۔ ”وہ ملا بشریج گوری کی طرح اتنا زیادہ طاقتور نہیں ہے لیکن میں جانتا تھا کہ ملا بشریج گوری کے خلاف ایک ایسا آدمی ہے جو اس معاملے میں میرا ساتھ دے سکتا ہے۔ میں نے اس سے بات کی تو وہ ی میرا ساتھ دینے کو تیار ہو گیا۔ سچا تو پہلے بھی میری دوستی تھی۔ وہ بمبئی کے متان داوا ماگا ہوا نہیں ہے بلکہ ایک خاص مقصد سے ملا بشریج گوری کے گردہ میں داخل ہوا ہے۔ وہ آدمی ہے۔ فوراً ہی میرے لئے کام کرنے کو تیار ہو گیا۔ اس نے پہلے ہی روز مجھے اطلاع دے دی۔ تم لوگ ملا بشریج گوری کے ڈیرے پر موجود ہو۔ ہم نے لڑکی کو اغواء کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن یہ منصوبہ یہاں پہنچ کر ناکام ہو گیا۔ اگر صبح تک ہمیں مہلت مل جاتی تو ملا بشریج گوری کے ساتھ بھی کوئی کام نہیں دے سکتے تھے۔“

”لیکن اب تمہارا جو انجام ہو گا اس کا تم سوچ بھی نہیں سکو گے۔“ نوکھا نے کہا اور شینے رہب بیٹھ گیا۔

شینے کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ پیر بھی بندھے تھے۔ نوکھا نے پہلے اس کے منہ سے کپڑا نکالا پھر اس کے ہاتھ کھولنے لگا۔ وہ سلمان کی اسے بھی غافل نہیں تھا۔ شینے کے ہاتھ کھول کر وہ کھڑا ہو گیا۔ شینے اپنے پیروں پر بندھی

ہوئی رسی خود ہی کھولنے لگی۔

”ثینہ بی بی.... یہ رانقل اٹھا لو.... اگر یہ اپنی جگہ سے حرکت کرے تو گولی سے اڑا دیتا میں ابھی آ رہا ہوں۔“

ثینہ نے فوراً ہی فرش پر پڑی ہوئی رانقل اٹھا کر سلمان پر تان لی۔ نوکھا دروازے سے نکل کر راہداری میں آ گیا۔ عمارت کے پچھلی طرف اب بھی فائرنگ ہو رہی تھی۔ لیکن راہداری سنان تھی۔ نوکھا دو قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک کمرے میں رحیم بخش ایک آدمی کو رانقل کی زد پر لے کر راہداری میں آ گیا۔

”واج رحیم بخش!“ نوکھا بولا۔ ”ثینہ مل گئی ہے اور سلمان بھی اس کمرے میں موجود ہے۔“

”اوہ! چلو.... جلدی کرو۔“ رحیم بخش بولا۔

وہ دوبارہ اس کمرے میں آ گئے۔ ثینہ بڑی مستعدی سے سلمان کو رانقل کی زد پر لئے کھڑی تھی۔

”تم ذرا کھڑکی پر چڑھو نا واج۔“ رحیم بخش نے اس آدمی کو دھکا دیا جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

وہ آدمی چند لمحے خوفزدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اسے رحیم بخش کے حکم کی تعمیل تو کرنا ہی پڑی تھی۔ وہ کھڑکی پر چڑھ گیا اور مڑ کر خوفزدہ سی نظروں سے رحیم بخش کی طرف دیکھنے لگا۔

”چھلانگ لگا دو۔“ رحیم بخش نے کہا۔ ”سمجھو تمہیں بھاگنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس موڑ سے فائدہ اٹھا لو اور چھلانگ لگا دو باہر۔“

”مہم.... مجھے معاف کر دو....“ وہ شخص ہکلا یا۔

”چھلانگ لگا دو ورنہ....“ رحیم بخش نے رانقل سیدھی کر لی۔

اس شخص نے ایک دم باہر چھلانگ لگا دی۔ اس کی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ نوکھا کو یقین کہ اندھیرے میں دوسری منزل سے چھلانگ لگانے کے بعد اس کی ایک آدھ بڑی ضرور ٹوٹ ہوگی۔

”واج نوکھا۔“ رحیم بخش نے کہا۔ ”اس کے ہاتھ پیچھے باندھ دو اور لے کر نکلو یہا سے۔“

نوکھا نے رانقل ثینہ کے حوالے کی اور رسی اٹھا کر سلمان کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے

دھکیلا ہوا رحیم بخش وغیرہ کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔

فائرنگ بند ہو گئی تھی۔ نیچے کمپاؤنڈ میں آ کر رحیم بخش نے چیخ کر اپنے آدمیوں کو مخصوص دیا۔ وہ سب کمپاؤنڈ میں آ گئے۔ تربیتی زخمی ہوا تھا۔ سلمان کے تین آدمی مارے گئے تھے اور فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے جبکہ وہ خود ان کی حراست میں آ گیا تھا۔

وہ لوگ حویلی سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے حویلی کے پچھلی طرف جھاڑیوں میں اس پنچے جہاں انہوں نے جیب چھوڑی تھی۔ اس وقت دن کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ اس لئے راستہ چلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

سلمان کو جیب کے فرش پر اوندھالٹا دیا گیا۔ داؤد وغیرہ آئے سامنے کی سیڑیوں پر اس طرح گئے کہ ان چاروں نے اپنے پیر سلمان کے جسم پر رکھے ہوئے تھے۔ ثینہ اگلی سیٹ پر نوکھا ساتھ بیٹھ گئی تھی۔

رات کو اس طرف آتے ہوئے یہ فاصلہ طے کرنے میں تقریباً دو گھنٹے لگے تھے۔ لیکن واپسی صرف ڈیڑھ گھنٹہ لگا تھا۔ حویلی کا گیٹ محمد دین نے کھولا تھا۔ اس نے بتایا کہ ڈی کوشا اور اپنے کمرے میں سو رہے ہیں اور ملاشیئر چیخ گوری مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے۔

برآمدے کے سامنے جیب رکھتے ہی نوکھا اور ثینہ اتر آئے۔ وہ دونوں اس کمرے کی طرف گئے جس میں شارق اور ڈی کوشا موجود تھے۔ سلمان کو ایک اور کمرے میں لے جایا گیا تھا۔ بخش اور اس کے ساتھی برآمدے ہی میں کھڑے رہ گئے تھے۔

نوکھا نے دروازہ کھولا تو اس کی نظر سامنے ہی قالین پر لیٹے ہوئے شارق پر پڑی وہ جاگ رہا انہیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ڈی کوشا سو رہا تھا۔ ثینہ دوڑ کر شارق کے پاس پہنچ گئی۔ وہ ل بڑی گرجوٹی سے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر دبائے لگے۔

”اوہ! تم ٹھیک ہو نا؟ ہم تو پریشان ہو گئے تھے؟“ شارق نے ثینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔ تمہیں کیا ہوا؟ سر پر یہ پٹی کیسی ہے؟“ ثینہ بولی۔

”جب تمہیں اغواء کیا گیا تو میں نے تمہیں بچانے کی کوشش کی تھی اور اسی وقت میرے سر کی دہلیز سے زور دار ضرب لگائی گئی تھی۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔“ شارق نے

”اوہاں.... میں نے تمہاری چیخ سنی تھی۔“ ثینہ نے کہا۔

ڈی کوشا بھی اکی باتوں کی آواز سن کر اٹھ گیا۔ اسے ثینہ کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی تھی۔

”ان لوگوں نے تو واقعی کمال کر دیا۔“ ڈی کوشا بولا۔ ”اتنی دیر میں تو کسی جاننے والے کا پتہ

وہ لوگ بھی کمرے سے نکل آئے۔ منہ ہاتھ دھوئے اور ضروریات سے فارغ ہونے میں ہاتھ نہ لگا دیا۔

”میں ناشتہ کرنے کے بعد شہر چلا جاؤں گا۔“ ملا بشریچ گوری نے ناشتہ کے دوران کہا۔ ”تم آج رات گیارہ بجے یہاں سے روانہ ہو جاؤ گے۔ رحیم بخش اور تین آدمی تم لوگوں کے ساتھ جائیں گے۔ یہ لوگ تمہیں سو نیانی چھوڑ دیں گے۔ وہاں سے تم لوگ آسانی سے کراچی جاؤ گے۔ رحیم بخش تم لوگوں کو سو نیانی کے ایک پولیس آفیسر سے بھی ملو اے گا تاکہ وہاں سے کراچی جانے میں تم لوگوں کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔“

”سو نیانی تو ہمارا اپنا علاقہ ہے۔ وہاں ہمیں کون پریشان کرے گا۔“ شارق نے اس کی طرف بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”پریشانی اپنوں ہی سے اٹھانی پڑتی ہے۔“ پتلی گوری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ناشتے کے تھوڑی دیر بعد ملا پتلی گوری رخصت ہو گیا۔ رخصت ہونے سے پہلے وہ ان لوگوں سے اس طرح ملا تھا جیسے اپنوں سے گھڑ رہا ہو۔ رحیم بخش بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا تھا اور پتلی میں ان کے ساتھ صرف محمد دین رہ گیا تھا۔

رحیم بخش کی واپسی مغرب سے تھوڑی دیر پہلے ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ تین آدمی اور تین ایک تو دادو ہی تھا اور دو نئے چہرے تھے۔ رحیم بخش نے ایک بڑا سوٹ کیس شارق کے والے کر دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ شارق نے پوچھا۔

”ملا بشریچ گوری نے تم لوگوں کے لئے کچھ تحائف دیئے ہیں۔ کھول کر دیکھ لو۔“ رحیم بخش نے جواب دیا۔

ثمنیہ نے جلدی سے سوٹ کیس کھول لیا۔ اس میں چار پیکٹ رکھے ہوئے تھے اور ہر پیکٹ پر نام لکھا ہوا تھا۔ سب نے اپنے اپنے نام کا پیکٹ اٹھا لیا۔ ثمنیہ نے اپنے نام کا پیکٹ کھولا تو اس میں کئی سوٹوں کا کپڑا، دو قیمتی گھڑیاں اور کچھ اور تحائف کے علاوہ ہیرے کے جڑاؤ والا سونے کا ایک سیٹ بھی تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ثمنیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ دوسروں کے پیکٹوں میں زیور کے سیٹ کے علاوہ کپڑے، گھڑیاں اور کچھ اور چیزیں بھی تھیں۔ وہ سب لوگ یہ تحائف دیکھ کر بہت حیران بھی ہوئے اور خوش بھی تھے۔

”معلوم کرنا بھی مشکل ہوتا ہے اور یہ لوگ تمہیں دشمن کے قبضے سے چھڑا کر بھی لے آئے۔“

”جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے نا پھر ناک ٹوٹیوں میں وقت ضائع نہیں کیا جاتا۔“ نوکھانے کہہ کر اس کی کارروائی پر مجھے بھی حیرت ہوئی ہے۔ کم از کم تین چار آدمی مرے ہیں اس کارروائی میں اور وہ جو فساد کی اصل جز تھا اسے زندہ پکڑ کر لے آئے ہیں؟“

”وہ کون ہے؟“ ڈی کوٹھانے پوچھا۔

”مسلمان۔“ نوکھانے جواب دیا۔ ”کوٹھانے گاڑ کا وہی آدمی جس کے بارے میں میں نے بھی شبہ کا اظہار کیا تھا۔ اس نے ملا پتلی گوری سے انتقام لینے کے لئے یہ حرکت کی تھی۔ لیکن یہ حرکت اسے بہت مہنگی پڑی۔ اب ملا پتلی گوری اسے جو سزا دے گا وہ بھی قابل دید ہوگی۔“

”اور اس کا کیا ہوا... سجاد کا؟“ شارق نے پوچھا۔

”جسم پر بھاری پتھر باندھ کر اسے سمندر میں پھینک دیا گیا تھا۔ اب تک تو اس کا سارا گوشت مچھلیاں کھا چکی ہوں گی۔“ نوکھانے جواب دیا۔

”ایسے لوگوں کا یہی انجام ہونا چاہئے۔“ شارق نے کہا۔

”سجاد کون ہے؟“ ثمنیہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہی لبا ترنگا آدمی جو بعد میں یہاں آیا تھا۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”مسلمان نے اس کے ساتھ مل کر یہ سازش تیار کی تھی لیکن نوکھانے اسے پکڑ لیا اور رحیم بخش نے اس سے سب اگوا لیا تھا۔ اسی لئے تو یہ لوگ اتنی جلدی تم تک پہنچ گئے تھے۔“

”تقریباً آدھے گھنٹے بعد محمد دین قہو لے کر آگیا۔ اس وقت سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اس نے ان سب کے سامنے ایک ایک کپ رکھ دیا۔“

”آپ لوگ چائے پیئیں پھر واجہ پتلی گوری سے ناشتے پر ملاقات ہوگی۔“ محمد دین کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

وہ لوگ خاموشی سے چائے پینے لگے۔ صبح کی پہلی چائے بڑی خوش ذائقہ محسوس ہوئی چائے پینے کے بعد شارق اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہ کھڑکی مشرق کے پر تھی۔ اس سے آگے حویلی کی اونچی دیوار تھی جس کی وجہ سے دھوپ ابھی تک کھڑکی تک پہنچ پائی تھی البتہ اوپر کی منزل کی دیواروں پر دھوپ چمک رہی تھی۔

سازھے سات بجے کے قریب محمد دین دوبارہ آگیا۔

”ناشتہ تیار ہے۔ آپ لوگ منہ ہاتھ دھو کر واجہ پتلی گوری کے کمرے میں آجائیے۔“

دین کہہ کر باہر چلا گیا۔

دی۔ کشتی آہستہ آہستہ اسی روشنی کی طرف بڑھتی رہی اور بالاخر ساحل پر چھوٹی چھوٹی چٹانوں میں پہنچ کر رک گئی۔

”عمر دراز۔“ رحیم بخش نے ساحل کی طرف رخ کر کے ہولے سے آواز دی۔

”ٹھیک ہے۔ آجاؤ تم لوگ۔“ ساحلی چٹانوں سے جواب میں ایک آواز ابھری اس کے ساتھ ہی ٹارچ کی روشنی بھی چمک اٹھی تھی۔

”چلو۔۔۔ اترو۔“ رحیم بخش نے شارق وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ٹارچ کی روشنی سے انہیں راستہ دکھانے لگا۔

پہلے شارق ایک پتھر پر اترا پھر اس نے سہارا دے کر ٹینے کو کشتی سے اتارا۔ اس کے بعد بی کوٹا اور آخر میں نوکھا کشتی سے اترا۔ بھاری سوٹ کیس اسی نے اٹھا رکھا تھا۔

”دادو!“ رحیم بخش نے دادو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم واپس جاؤ اور لاچ کو مچھلی گھاٹ پر لے جاؤ۔ میں صبح وہیں آ جاؤں گا۔“

”اچھا واج۔۔۔ خدا حافظ۔“ دادو نے جواب دیا اور کشتی کو واپس موڑنے لگا۔

وہ لوگ کشتی سے اتر کر رحیم بخش کی رہنمائی میں پتھروں پر پھلانگتے ہوئے ساحل پر آ گئے۔

شارق نے ٹینے کو سہارا دے رکھا تھا تاکہ وہ کہیں گر نہ جائے۔ ایک آدی اچانک ہی ایک بڑے بھری آڑ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ وہ درمیانے قد کا ایک دبلا پتلا سا آدی تھا۔ اس نے بھی سیاہ لباس پہن رکھا تھا اور سر پر مخصوص رومال بندھا ہوا تھا۔ وہ عمر دراز تھا۔ اس نے بڑی گرجوٹی

، ہاتھ ملایا۔ تاریکی میں وہ ٹینے کو پہچان نہیں سکا تھا کہ وہ مرد ہے یا عورت۔ اس نے ٹینے کی طرف بھی ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ لیکن جب ٹینے نے ہاتھ نہیں ملایا تو وہ ٹارچ جلا کر اسے دیکھنے لگا۔

”اوہ! معاف کرنا بی بی۔“ وہ ندامت بھرے لہجے میں بولا۔ ”میں سمجھا تھا کہ تم بھی ان لوگوں طرح مرد ہو۔“

”گاڑی کہاں ہے عمر دراز؟“ رحیم بخش نے پوچھا۔

”آگے کھڑی ہے۔ ان چٹانوں کے پیچھے۔“ عمر دراز نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

وہ لوگ عمر دراز کی رہنمائی میں چٹانوں کے گرد چکراتے ہوئے چلنے لگے۔ اس وقت ان لوگوں کی وجہ سے تاریکی کچھ زیادہ ہی گہری تھی۔ اگر عمر دراز نے ٹارچ روشن نہ کر رکھی ہوتی تو ان کے لئے راستہ چلنا مشکل ہو جاتا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ ایک کھلی جگہ پر نکل آئے۔ ایک چٹان کے قریب ایک پرانی سی فورڈ اپ کھڑی تھی جس پر سیاہ کینوس کا ڈنڈا لگا ہوا تھا۔ ان چاروں کو پیچھے بٹھا دیا گیا اور رحیم بخش

رات نو بجے وہ لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ ساڑھے دس بجے وہ لوگ ملا بیٹریج گوری کی لاچ پر سوار ہو چکے تھے۔ اس لاچ میں عرشے کے نیچے بھی تین کینیں تھیں۔ لاچ کا کنٹرول رحیم بخش کے ہاتھ میں تھا۔ وہ لاچ کو کھاڑی سے نکل کر دہانے پر لے آیا۔ لاچ کا انجن اشارت تھا اور رحیم بخش بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ ٹھیک گیارہ بجے بائیں طرف آسمان پر ایک سبز روشنی چمکتی ہوئی نظر آئی۔ یوں لگا تھا جیسے کسی نے آتش بازی کا فلیئر چھوڑا ہو۔ سبز روشنی کا ایک گولا سا تھا جو ہوا میں تیرتا ہوا آہستہ آہستہ نیچے آ رہا تھا۔

یہ مخصوص سنگل تھا۔ آسمان پر تیرتی ہوئی وہ سبز روشنی معدوم ہونے سے پہلے ہی رحیم بخش لاچ کو حرکت میں لے آیا۔ لاچ کی تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ وہ پہلے بہت لمبی رفتار سے چلی رہی پھر ساحل سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر پہنچ کر اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس کا رخ پاکستان کے ساحل کی طرف تھا۔

ٹینے اور شارق وغیرہ عرشے کی ریٹنگ کے قریب کھڑے مسقط کے ساحل کی دور ہوتی ہوئی روشنیوں کو دیکھ رہے تھے۔

سو نیلانی کے ساحل پر آنے سے پہلے انہیں کم از کم ایک گھنٹہ سمندر میں کھڑا رہنا پڑا تھا رحیم بخش بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا اور پھر اس نے ننگر اٹھا دیا۔ ساحل سے تقریباً دو سو گز دور آ کر اس نے لاچ ایک بار پھر روک لی۔ ننگر گرا دیا گیا۔ ایک بڑی کشتی سمندر میں اتار دی گئی رحیم بخش نے اپنا ایک آدی بھی ساتھ لے لیا اور شارق وغیرہ کے ساتھ کشتی میں اتر گیا۔

شارق اور اس کے ساتھی خاموش بیٹھے ہوئے ویران ساحل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ٹینے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ تھی۔ رحیم بخش کشتی کے اگلے حصے میں کھڑا تھا۔ اس کے کندھے پر رائفل لٹکی ہوئی تھی اور ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ وہ گہری نظروں سے تاریک ساحل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دادو نے چپو سنبھال رکھے تھے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ کشتی کو چلا رہا تھا۔

دفعۃً ساحل پر دائیں طرف تاریکی میں روشنی چمکتے دیکھ کر رحیم بخش چونک گیا۔ روشنی مخصوص انداز میں جل بجھ رہی تھی۔ رحیم بخش کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ٹارچ سے مخصوص سنگل دیا جا رہا تھا۔ اس نے مڑ کر دادو کو اشارہ کیا۔ دادو نے کشتی کا رخ اسی طرف موڑ دیا اور

طرف روشنی چمکتی ہوئی نظر آئی تھی۔

روشنی غائب ہو چکی تھی۔ رحیم بخش نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوئی ٹارچ سے روشنی کے مخصوص سنگل دیئے۔ جواب میں ساحل پر بھی روشنی چمکتی ہوئی دکھائی

عمر دراز کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔

پک اپ کے پچھلے حصے میں سیٹیں نہیں تھیں۔ یہ لوگ فرش پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ پک اپ چٹانوں کے گرد چکراتی ہوئی چلتی رہی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ کھلی جگہ پر نکل آئی۔ اس وقت مدھم سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ یہ چاروں پیچھے دیکھ رہے تھے۔ تاحد نگاہ ویرانہ ہی ویرانہ قد کہیں کوئی درخت، کوئی پودا یا جھاڑیاں وغیرہ نظر نہیں آ رہی تھیں۔

پک اپ کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی لیکن اس کے باوجود ناہموار راستے پر زور دار جھٹکے لگ رہے تھے۔ وہ بار بار لڑھک کر ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ گئے۔ کتوں نے بھونک کر ان کا استقبال کیا تھا۔ یہ بستی پندرہ بیس گھروں پر مشتمل تھی۔ ایک چھوٹی سی مسجد تھی اور آدمی اس مسجد سے فجر کی نماز پڑھ کر نکل رہے تھے۔

بستی کے تمام مکان کچے تھے۔ چند مکان ایسے تھے جن کی دیواروں میں کچھ پتھر بھی استعمال کئے گئے تھے۔ پک اپ ایک گلی میں گھوم کر ایک مکان کے سامنے رک گئی۔ رحیم بخش اتر کر پچھلے حصے کی طرف آگیا۔

”آ جاؤ واجہ! نیچے اتر آؤ۔“

وہ چاروں نیچے اتر آئے اور رحیم بخش کی رہنمائی میں چلتے ہوئے مکان کے دروازے پر پہنچ گئے۔ لکڑی کا بھاری دروازہ تھا۔ دوسری دہک پر ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک ادھڑ عمر عورت تھی۔ اس نے ان لوگوں کو دیکھ کر حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ غالباً یہاں اس قسم کے بن بلائے مہمان آتے ہی رہتے ہوں گے۔

دروازے کے دوسری طرف وسیع کچا صحن تھا۔ کھجور کے چند درخت تھے اور کافی آگے مکان تھا۔ اس کے سامنے بھی ایک برآمدہ تھا۔ مکان اہل شیب کا تھا۔ ایک طرف ایک کمرہ تھا اور دوسری طرف دو کمرے۔ اس عمارت سے بہت کر ایک اور کمرہ تھا اور اس کے ساتھ ایک دستا شید تھا جس کے نیچے چند بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ بکریاں انہیں دیکھ کر میانے لگیں۔

اس ادھڑ عمر عورت نے ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ چاروں رحیم بخش کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرے میں اندھیرا سا تھا اس لئے دروازہ کھلا رہنے دیا گیا۔ رحیم بخش نے آگے بڑھ کر عقبی سمت کی دونوں کھڑکیاں کھول دیں۔ کھڑکیاں کھلتے ہی نہ صرف کمرے میں روشنی پھیل گئی بلکہ تازہ ہوا بھی آنے لگی۔

شارق دروازے کے قریب ہی کھڑا کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ کمرہ خاصا بڑا تھا۔ پختہ فرش تھا

جس پر وال ٹوال ٹائیلوں کے ٹکٹوں والی خوبصورت چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر لکڑی کی پرانے طرز کی کھونٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار پر سنگل شیٹ والا کینڈر بھی لٹکا ہوا تھا۔ یہ کینڈر پچھلے سال کا تھا اور گوادور کے کسی جنرل اسٹور کا تھا۔ کینڈر پر خانہ کعبہ کی تصویر تھی۔ غالباً اسی لئے اسے دیوار سے اتارا نہیں گیا تھا۔ کمرے میں کوئی پنکھا یا بلب وغیرہ نہیں تھا۔ اس چھوٹی سی بستی میں بجلی نہیں تھی اس لئے بلب یا کھٹکے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

نوکھانے سوٹ کیس ایک دیوار کے قریب رکھ دیا تھا اور خود بھی دیوار سے ٹیک لگا کر چٹائی پر بیٹھ گیا تھا۔ اسی دوران عمر دراز بھی آگیا تھا۔

”واجہ شارق!“ رحیم بخش نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تو ابھی چلا جاؤں گا۔ یہ واجہ عمر دراز آپ لوگوں کے پاس ہے۔ یہ مجھے شہر چھوڑ کر واپس آ جائے گا۔ آپ لوگ ناشتہ کریں۔ آج کا دن ہمیں آرام کریں۔ کل صبح آپ لوگ کراچی چلے جانا۔“

”کل صبح! آج کیوں نہیں۔“ شارق نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہاں سے کراچی کے لئے بسیں صبح سویرے ہی نکل جاتی ہیں۔ کچھ لوگوں نے پہلے ہی ڈرائیوروں سے اپنی اپنی سیٹوں کے لئے کہہ رکھا ہوتا ہے۔ اس لئے جو مسافر عین وقت پر آتے ہیں انہیں مشکل ہی سے سیٹ ملتی ہے۔ یہاں تو بسوں میں مسافر بھیڑ بکریوں کی طرح بھرے جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ چھتوں پر بیٹھ کر سفر کرتے ہیں۔ آج شام عمر دراز بس ڈرائیور سے کہہ دے گا کل صبح آپ لوگ آرام سے بیٹھ کر جائیں۔“ رحیم بخش نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔“ شارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ”تم واپس جاؤ تو ملا بشیر بیچ گوری کا ہماری طرف سے بہت بہت شکریہ ادا کرنا۔ مہمان نوازی کا بھی اور ان تحائف کا بھی!“

”اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں۔“ رحیم بخش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کبھی دوبارہ آؤ تو پھر تم لوگوں کو اپنے علاقے کی سیر کرائیں گے۔ اچھا واجہ، اب اجازت دو۔“ رحیم بخش نے شارق، نوکھا اور ڈی کوٹا سے باقاعدہ مصافحہ کیا۔ ٹیمین کو ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور عمر دراز کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

وہ چاروں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ دروازہ اور کھڑکیاں کھلی ہونے کی وجہ سے تازہ ہوا کمرے میں آ رہی تھی اور گرمی کا احساس بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہی عورت کمرے میں داخل ہوئی جس نے باہر کا دروازہ کھولا تھا۔

”تم لوگ منہ ہاتھ دھو لو۔ میں روٹی اور چائے بناتی ہوں۔“

”پانی کہاں ہے؟“ شارق نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”وہ جدھر بکری بندھا ہوا ہے ادھر پانی کا ڈرم رکھا ہے۔“ اس عورت نے کہا پھر ٹہینے کی طرف دیکھتی ہوئے بولی۔ ”تم میرے ساتھ آ جاؤ بی۔“

وہ تینوں بکریوں والے شیڈ کی طرف چلے گئے اور ٹہینے اس عورت کے ساتھ آگئی۔ دوسری طرف والے کمروں کے پچھلی طرف ایک غسل خانہ سا بنا ہوا تھا۔

”یہ غسل خانہ ہے۔ تم منہ ہاتھ دھو کر بکریوں کے شیڈ کے ساتھ والے کمرے میں آ جاؤ۔ ادھر ہم نے باورچی خانہ بنایا ہوا ہے۔“ وہ عورت کہتی ہوئی چلی گئی۔

تقریباً بیس منٹ بعد ٹہینے بھی اس کمرے میں آگئی۔ کمرہ خاصا بڑا تھا جسے باورچی خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کمرے کی پچھلی طرف بھی دو کھڑکیاں تھیں جن سے روشنی اور ہوا اندر آ رہی تھی۔ کمرے کی دیواریں دھوئیں سے کالی ہو رہی تھیں۔ ایک طرف چولہا بنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دائیں طرف دیوار میں دو الماریاں بنی ہوئی تھیں جن میں برتن وغیرہ بچے ہوئے تھے۔ بائیں طرف والی دیوار کے ساتھ سوکھی لکڑیوں کا انبار لگا ہوا تھا۔

وہ عورت آٹا گوندھ چکی تھی اور چولہے پر توتا رکھ کر آگ جلا رہی تھی۔ ٹہینے کو توتا دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی تھی۔ تقریباً آدھا انچ موٹی پتھر کی ایک چوکور سی سل تھی اسے تو یہ دیکھ کر بھی حیرت ہوئی تھی کہ اس عورت نے آٹا بھی ریگیزین کے ایک ٹکڑے پر گوندھا تھا اور پھر اسے کپڑے میں لپیٹ دیا تھا۔ اور اب وہ ریگیزین پھیلائے اس پر بیڑے بنا بنا کر رکھ رہی تھی۔

روٹیاں بڑی اور موٹی موٹی اور آڑھی ترچھی سی پک رہی تھیں۔ آٹے میں نمک بھی ڈالا گیا تھا۔ ٹہینے نے ایک نوالہ توڑ کر کھایا تو اسے یہ روٹی بہت اچھی لگی اور بعد میں جب بکری کے دودھ کی چائے کے ساتھ یہ روٹی ناشتے میں کھائی گئی تو بڑا مزہ آیا۔

ناشتہ کرنے کے بعد وہ لوگ جو سوئے ہیں تو دوسرے دو بجے سے پہلے کوئی بھی نہیں اٹھ سکا تھا۔ وہ لوگ لانچ میں تقریباً رات بھر جاگے تھے۔ اور اب خوب گہری نیند سوئے تھے اور جب بیدار ہوئے تو بڑی کسمندی محسوس ہو رہی تھی۔ نہانے کے لئے پانی بھی نہیں تھا۔ صرف منہ ہاتھ دھونے پر ہی اکتفا کیا گیا۔ پانی بہت دور سے لانا پڑتا تھا۔

عمر دراز بہت دیر پہلے شہر سے واپس آ چکا تھا۔ کھانے میں لیلیا ذبح کر لیا گیا تھا۔ لیلیا کی ران اور بھنا ہوا گوشت بے حد لذیذ تھا۔ عمر دراز بھی ان کے ساتھ کھانے میں دسترخوان پر موجود تھا۔ کھانے کے بعد وہ پھر لیٹ گئے کیونکہ باہر تیز دھوپ تھی اور کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں بیٹھ کر کچھ وقت گزارا جاتا۔ صبح اور اس وقت کھانے سے پہلے جب وہ کمرے سے باہر نکل کر صحن

میں آئے تھے تو باہر بائیں طرف انہیں کھجور کے درختوں کی چوٹیاں نظر آئی تھیں لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ درخت کسی گھر میں لگے ہوئے تھے یا بستی کے باہر کسی جگہ پر تھے۔ ڈی کوشا اور نوکھا تو فوراً ہی سو گئے تھے۔ ٹہینے بھی اوجھٹنے لگی تھی۔ شارق پر بھی غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔

چھ بجے کے لگ بھگ وہ سب جاگ گئے تھے۔ اس وقت عمر دراز نے انہیں قہوہ پلایا۔ ”چلو.... تم لوگوں کو تھوڑا سیر کروا کے لاؤں.... صبح سے بند پڑے ہو۔“ عمر دراز نے کہا۔ وہ لوگ عمر دراز کے ساتھ مکان سے باہر آ گئے۔ بستی زیادہ بڑی تو نہیں تھی۔ وہ لوگ دائیں طرف گلی سے نکلے تھے۔ گلی کے انتہام پر ایک چھوٹا سا میدان تھا جس میں چند بچے کھیل رہے تھے اور تین چار ادھیڑ عمر آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے اٹھ کر عمر دراز اور شارق وغیرہ سے ہاتھ ملایا۔

میدان کے دوسری طرف بہت دور ایک پہاڑی تھی جو دائیں سے بائیں طرف چلی گئی تھی۔ پہاڑی زیادہ بلند نہیں تھی۔ اس کے دامن میں کھجوروں کے درخت کے جھنڈ کے جھنڈ نظر آ رہے تھے وہ لوگ اسی طرف جا رہے تھے۔ میدان کے دوسری طرف نشیب تھا وہ لوگ جیسے ہی میدان کے دوسری طرف پہنچے انہیں سبزہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔

پہاڑی کے دامن میں دور تک سبزہ ہی سبزہ تھا۔ وہ دراصل کھیت تھے جن میں مختلف اقسام کی فصلیں لکھا رہی تھیں۔ وہ لوگ کھیتوں کے شروع میں پہنچ کر رک گئے جہاں دو تین جگہوں پر گھاس پھونس کے جھوپڑے سے بنے ہوئے تھے۔

”اس پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹا سا چشمہ ہے۔“ عمر دراز نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”یہ سبزہ اسی چشمے کا مریہ منٹ ہے۔ اس طرف کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ اگر پانی ہو تو پہاڑی کے دامن میں میلوں دور تک کاشت ہو سکتی ہے لیکن چشمے سے پانی کے بننے کی رفتار اتنی زیادہ نہیں ہے۔ بہر حال جتنا بھی پانی دستیاب ہے اسے استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ بستی والے پینے کے لئے بھی یہیں سے پانی لے جاتے ہیں۔“

وہ لوگ کھیتوں کے درمیان پگھنڈیوں پر چلتے رہے یہاں سبزے کی وجہ سے ہوا میں خشکی بھی تھی۔ وہ لوگ پہاڑی کے دامن میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں حقارتی چشمہ تھا.... یہ چشمہ قدرے بلندی پر تھا۔ نیچے بہت بڑا تالاب بنایا گیا تھا جس میں چشمے کا پانی جمع ہو رہا تھا۔ اسی تالاب سے کھیتوں کو پانی فراہم کیا جاتا تھا۔ تالاب اس وقت پانی سے بھرا ہوا تھا۔ ٹہینے نے پانی میں ہاتھ ڈال کر دیکھا بے حد ٹھنڈا پانی تھا۔ اس نے چلو بھر پانی پیا، میٹھا پانی تھا، ان سب نے جی بھر کر پانی پیا

رہنے والی ماہی گیری کی کشتیاں صبح منہ اندھیرے واپس آ جاتی تھیں اور بندرگاہ کے علاقے میں بڑی گھماگھی رہتی تھی لاری اڑے پر بھی بڑی رونق رہتی تھی۔ پھلیوں سے لدے ہوئے مخصوص ساخت کے ٹرک صبح منہ اندھیرے ہی کراچی کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔

کراچی جانے کے لئے تین چار بسیں تیار کھڑی تھیں۔ ایک بس آدھا گھنٹہ پہلے جا چکی تھی اور دوسری بس سات بجے روانہ ہونے والی تھی۔ انہیں اسی بس میں جانا تھا۔ بہت سے مسافر بس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ مسافر آ رہے تھے۔ آگے کی دو سیٹیں خالی رکھی گئی تھیں۔ ان چاروں کو ان سیٹوں پر بٹھا دیا گیا۔ سوٹ کیس چھت پر رکھا دیا گیا تھا۔

سات بجے بس روانہ ہوئی تو پوری طرح بھر چکی تھی۔ سیٹوں کے درمیانی راستے پر چھوٹے چھوٹے اسٹول رکھ دیئے گئے تھے۔ ان پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ رحیم بخش نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہاں مسافروں کو بھیڑ بکریوں کی طرح بسوں میں ٹھونسا جاتا ہے۔

جیسے جیسے سورج بلند ہو رہا تھا گرمی کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان کے چاروں طرف دیرانہ تھا۔ کیس کوئی چھوٹی سی بستی بھی نظر آ جاتی۔

حب چوکی پر بس کو چیننگ کے لئے روک لیا گیا۔ مسافروں کے ساتھ کسٹمز اور پولیس والوں کا رویہ ایسا تھا جیسے وہ کسی مفتوحہ قوم کے افراد ہوں۔ لوگوں کے ساتھ پولیس والوں کا رویہ بہت ہنک آمیز تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک چیننگ ہوتی رہی۔ بس پر لدا ہوا تمام سامان اتروا لیا گیا تھا اور بس کو بھی اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھا گیا تھا کہ کسی خفیہ خانے میں کوئی مال تو نہیں چھپایا گیا تھا۔ ان کا سوٹ کیس بھی کھلوا کر دیکھا گیا۔ ایک کسٹمز والا شارق کو ایک طرف لے گیا۔ سوٹ کیس میں صرف وہی چیزیں تھیں جو ملا بشیر پنچ گوری سے خفے میں ملی تھیں۔ ایک ایک دو دو سوٹوں کا کپڑا اور شیشہ کا زیورات کا سیٹ۔ وہ کسٹمز والا شاید شارق سے کوئی سودے بازی کرنا چاہتا تھا لیکن اسی وقت بس کا ڈرائیور وہاں پہنچ گیا۔

”یہ لوگ ملا بشیر پنچ گوری کے مہمان ہیں واجہ۔“ بس ڈرائیور نے کسٹمز والے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ!“ کسٹمز والا چونک گیا پھر شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم لوگ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟“

”ہم لوگ کراچی ہی سے سیر و تفریح کے لئے گئے تھے۔ دو دن رہنے کے بعد واپس آ رہے ہیں۔“ شارق نے جواب دیا۔

اور عمر دراز کے ساتھ کھیتوں کی سیر کرتے رہے۔

عمر دراز بتا رہا تھا کہ یہ بستی سو نیماںی شہر سے تقریباً سات میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس بستی کے سب ہی لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ بہت سیدھے سادھے اور محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ اس کا اندازہ انہیں ہو گیا تھا۔ کھیتوں میں مختلف جگہوں پر چار پانچ آدمی ملے تھے۔ جنہوں نے بڑی محبت اور بڑے خلوص کا مظاہرہ کیا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو وہ لوگ واپس آ گئے۔ یہاں بجلی تو نہیں تھی البتہ پنڈو میکس روشن کر کے رکھ دیا گیا تھا۔

وہ عورت عمر دراز کی بیوی تھی۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ عمر دراز بھی ملا بشیر پنچ گوری کے گروہ سے وابستہ تھا۔ ملا بشیر پنچ گوری سوئے، منشیات اور دیگر چیزوں کے علاوہ انسانوں کی اسمگلنگ بھی کرتا تھا۔ اس کے آدمی ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ غیر قانونی طور پر خلیج کی ریاستوں میں جانے والوں کی کمی نہیں تھی۔ پنچ گوری کے آدمیوں کو ایسے ہی لوگوں کی تلاش تھی۔ اور جب معقول تعداد میں لوگ جمع ہو جاتے تو انہیں لانچ میں بھر کر کسی بھی خلیجی ریاست کے ویران ساحل پر اتار دیا جاتا۔ لانچ پر لے جانے سے پہلے ان لوگوں کو اسی بستی میں عمر دراز ہی کے گھر پر ٹھہرایا جاتا تھا۔

عمر دراز انہیں گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ شیشہ، عمر دراز کی بیوی کے ساتھ مختلف کاموں میں لگ گئی تھی۔ رحیم بخش نے عمر دراز کو اور عمر دراز نے اپنی بیوی کو بتا دیا تھا کہ یہ لوگ وہ نہیں ہیں جنہیں پیسے کے عوض سمندر پار پہنچایا جاتا ہے بلکہ یہ ملا بشیر پنچ گوری کے خاص آدمی ہیں۔ اور غالباً اسی لئے ان کی اتنی خاطر تواضع ہو رہی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد عمر دراز واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ ایک بس ڈرائیور سے اس نے بات کر لی ہے۔ بس صبح سات بجے روانہ ہو گی اور ان کے لئے آگے کی سیٹوں کا بندوبست کر لیا گیا ہے۔

اس چھوٹی سی بستی میں اگرچہ آٹھ بجے کے بعد ہی سناٹا چھا گیا تھا مگر وہ لوگ دیر تک جاگتے رہے۔

رات اسی طرح سوتے جاگتے میں گزر گئی۔ صبح چھ بجے وہ لوگ عمر دراز کے ساتھ اس کی پک اپ پر سوار ہو کر سو نیماںی شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ان کا خیال تھا کہ اتنی صبح شہر کے لوگ سو رہے ہوں گے لیکن یہ کراچی نہیں سو نیماںی تھا۔ ایک ساحلی بستی جس کے باشندوں کی روزی کا انحصار ماہی گیری پر تھا۔ رات بھر گہرے سمندر میں

”میں نے تم لوگوں کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔“ کشنر والے نے کہا۔

”ہم لوگ بس پر ہی گئے تھے ہو سکتا ہے اس وقت تمہاری ڈیوٹی نہ ہو۔“ شارق نے جواب

دیا۔

”سوال جواب کیا کر رہے ہو واجہ!“ ڈرائیور نے کشنر والے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا

تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے کہ یہ بیچ گوری کے مہمان ہیں۔“

”ٹھیک ہے، جاؤ۔“ کشنر والے نے کہا۔

وہ لوگ واپس بس کے قریب آ گئے۔ سامان دوبارہ لاوا جا رہا تھا اور مسافر بھی بس میں بیٹھ رہے تھے۔ ان کا سوٹ کیس بھی اوپر رکھ دیا گیا تھا۔ یہ لوگ بھی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے اور بس روانہ ہو گئی۔

”مجھے رات ہی کو عمر دراز نے تم لوگوں کے بارے میں بتا دیا تھا۔“ ڈرائیور نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہاں ملا بیچ گوری کا نام استعمال نہ کیا جاتا تو یہ کشنر والے تم لوگوں سے دو چار ہزار روپے اینٹھ لیتے یا تم لوگوں کے سامان سے ہیروئن یا کوئی اور ایسی چیز برآمد کر لی جاتی کہ تم لوگوں کو بند کر دیا جاتا۔“

”ملا بیچ گوری کے نام میں بڑی تاثیر ہے۔“ شارق نے کہا۔

”بیچ گوری بڑی اونچی شے ہے۔“ ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تمام ناکوں کے کشنر اور پولیس والے اس کے وظیفہ خوار ہیں۔ وہ اس کے کسی آدمی کو روکنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر کوئی مخبری ہو اور اطلاع بہت اوپر سے ہو تو دوسری بات ہے۔ ایسی صورت میں وہ پوری کارروائی کرتے ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح معاملہ منٹ ہی جاتا ہے۔“

باقی راستہ ڈرائیور سے باتیں کرتے ہی گزرا تھا۔ کراچی سے سوئمائی کا فاصلہ اگرچہ زیادہ نہیں تھا لیکن راستہ خراب ہونے اور جگہ جگہ چیننگ کی وجہ سے بس پانچ بجے کے لگ بھگ کراچی پہنچی تھی۔

بس سے اترنے کے بعد شارق نے محسوس کیا تھا کہ وہاں سادہ لباس میں کچھ ایسے آدمی موجود تھے جو بس سے اترنے والے مسافروں پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی شارق کی نظروں میں بھی آ گیا تھا۔ وہ دور کھڑا بڑی گہری نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ڈی کوشا ایک ٹیکسی والے سے بات کر رہا تھا۔ کچھ دیر کی بحث کے بعد بالا خر ٹیکسی ڈرائیور راضی ہو گیا۔ ڈی کوشا نے شارق وغیرہ کو اشارہ کیا اور وہ لوگ ٹیکسی کے قریب آ گئے۔ ڈرائیور نے اتر کر ڈی کوشا کو سونپ دیا۔ ڈی کوشا آگے بیٹھ گیا اور یہ

تینوں پچھلی سیٹ پر۔ شارق ان دونوں کے بیچ میں سینڈوچ بن کر رہ گیا تھا۔

ٹیکسی ٹاور سے گھومتی ہوئی چند ریگر روڈ، وہاں سے آرام باغ روڈ اور پھر ایم اے جناح روڈ پر آ گئی۔ وہ لوگ پرانی نمائش پر پہنچے ہی تھی کہ ایک اور ٹیکسی نے آگے نکل کر ان کی ٹیکسی کا راستہ روک لیا۔ اس وقت ٹریفک کا ہجوم تھا۔ ان کی وجہ سے ٹریفک جام ہونے لگا۔ گاڑیوں کے ہارنوں کی آوازوں سے فضا گونجنے لگی۔

”اپنی ٹیکسی لے کر ہمارے پیچھے آؤ۔ اگر ادھر ادھر ہونے کی کوشش کی تو بیچ کر نہیں جاسکو گے۔“ اگلی ٹیکسی سے اترنے والے شخص نے شارق کی ٹیکسی کے ڈرائیور سے کہا۔

”کیا بات ہے، کون ہو تم؟“ ڈی کوشا نے اسے گھورا۔

”ٹیکسی ایک طرف لگانے دو۔ پھر بتانا ہوں میں کون ہوں؟“ اس شخص نے کہا اور ڈرائیور کو اشارہ کرتا ہوا اگلی ٹیکسی پر بیٹھ گیا۔

مختلف گاڑیوں کے ہارنوں کی آوازوں سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ اگلی ٹیکسی حرکت میں آئی تو شارق والے ڈرائیور نے بھی گاڑی آگے بڑھا دی۔ دونوں ٹیکسیاں بریڈ روڈ پر مڑ گئیں۔ اس طرف آنے والا ٹریفک بہت کم تھا۔ بریڈ روڈ پر مڑنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اگلی ٹیکسی رک گئی اور وہی آدمی بڑی پھرتی سے نیچے اتر آیا۔ اس نے پچھلی ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ شارق والی ٹیکسی ایک درخت کے نیچے فٹ پاتھ کے کنارے پر رک گئی اسی دوران اگلی ٹیکسی سے ایک آدمی اتر آیا۔ یہ وہی آدمی تھا جسے شارق نے بس کے اڈے پر اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ دونوں سادہ لباس میں تھے اور ان کے حلقے انہیں پولیس والے ہی ظاہر کر رہے تھے۔

”کون ہو تم لوگ اور ہمیں کیوں روکا ہے؟“ شارق نے اس شخص کو گھورا۔

”نیچے آ جاؤ تم لوگ، ابھی بتاتا ہوں کہ ہم کون ہیں۔“ پہلے شخص نے جواب دیا۔

”مگر ہم لوگ کیوں اتریں۔ تم لوگ ہو کون؟“ اس مرتبہ ڈی کوشا بولا۔

”نیچے آتے ہو یا گھٹ کر اُتاروں۔“ اس شخص نے کہتے ہوئے پہلو کی طرف سے قبضہ اوپر اٹھا دی۔ قبضہ کے نیچے ہولٹر میں ریوالور کا دستہ صاف نظر آ گیا تھا اور اس شخص کا قبضہ اٹھانے کا مقصد بھی غالباً یہی تھا کہ وہ انہیں ریوالور دکھانا چاہتا تھا۔

ڈی کوشا نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ٹینڈ دروازے کی طرف بیٹھی ہوئی تھی اس کے چہرے پر ہائیل اڑ رہی تھیں۔ اگر یہ پولیس والے تھے تو یہ کسی مصیبت میں پھنس سکتے تھے۔ شارق نے ڈی کوشا کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر ٹینڈ کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ چاروں نیچے اتر آئے۔ اس سڑک پر سے گزرنے والے موٹر سائیکل سوار اور دوسری گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے لوگ

مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر لوگ صورت حال کو سمجھ چکے تھے۔ پولیس کے بعض اہلکاروں نے، بعض کیا بیشتر اہلکاروں نے پورے محکمہ میں گند پھیلا رکھا تھا۔ ڈیوٹی پر نہ ہوتے ہوئے بھی یہ لوگ سرکاری وردیاں پہن کر یا سادہ لباس میں ایئر پورٹ کے آس پاس کی سڑکوں، ریلوے اسٹیشن اور بسوں کے اڈوں کے آس پاس گھومتے رہتے اور بیرون ملک یا بیرون شہر سے آنے والوں کو روک کر انہیں مختلف حیلوں بہانوں سے ہراساں کرتے اور انہیں لوٹ لیتے۔ اخبارات میں روزانہ ان لوگوں کے خلاف خبریں چھپتی تھیں، مراسلے چھپتے تھے مگر اس قسم کی وارداتوں میں کبھی کی نہیں آئی تھی۔ بلکہ اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ ان کے خلاف کبھی کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ قانون کے محافظ ہی جب لٹیرے اور راہزن بن جائیں تو ان کے خلاف کارروائی کون کرے۔

یہ دونوں بھی پولیس اہلکار ہی تھے، جو ڈیوٹی پر نہیں تھے مگر باہر سے آنے والے لوگوں کو لوٹنے کے لئے بسوں کے اس اڈے کے آس پاس مٹھلا رہے تھے۔ اور شارق وغیرہ ان کی نظروں میں آگئے تھے اور تعاقب کرنے کے بعد یہاں انہیں روک لیا گیا تھا۔

”کون ہو تم لوگ، کیوں روکا ہے ہمیں؟“ شارق نے پوچھا۔

”ہم سی آئی اے کے آدمی ہیں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”تم لوگ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو اور یہ لڑکی کون ہے؟“ وہ ہوس بھری نظروں سے ٹہینے کو دیکھنے لگا۔

”یہ میری بیوی ہے۔ ہم لوگ سوئیانی سے آئے ہیں۔ مگر تم لوگوں نے ہمیں روکا کیوں ہے؟“ شارق نے کہا۔

”ڈی سے سوٹ کیس نکالو۔ ہم چیک کرنا چاہتے ہیں۔“ اس شخص نے کہا۔

”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم اسمگلر ہیں اور....“

”سوٹ کیس نکالو۔“ اس شخص نے شارق کی بات کاٹ دی۔

شارق کے کہنے پر ڈرائیور نے ڈیگ کھول دی اور نوکھانے سوٹ کیس باہر نکال کر فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔

”کھولو اسے۔“ وہ شخص غرایا۔

چالی نوکھانے کے پاس تھی۔ شارق کے اشارے پر اس نے سوٹ کیس کھول دیا۔ اس وقت پیدل چلنے والے دو تین آدمی وہاں رک گئے تھے۔ دوسرے آدمی نے انہیں بھگا دیا۔ پہلا آدمی فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور سوٹ کیس کا ڈھکنا کھول کر سامان چیک کرنے لگا۔ سامان تھا ہی کیا، لیکن وہ شخص اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کی قبض کا دامن سوٹ کیس میں رکھے ہوئے کپڑوں پر پھیل گیا

مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر لوگ صورت حال کو سمجھ چکے تھے۔ پولیس کے بعض اہلکاروں نے، بعض کیا بیشتر اہلکاروں نے پورے محکمہ میں گند پھیلا رکھا تھا۔ ڈیوٹی پر نہ ہوتے ہوئے بھی یہ لوگ سرکاری وردیاں پہن کر یا سادہ لباس میں ایئر پورٹ کے آس پاس کی سڑکوں، ریلوے اسٹیشن اور بسوں کے اڈوں کے آس پاس گھومتے رہتے اور بیرون ملک یا بیرون شہر سے آنے والوں کو روک کر انہیں مختلف حیلوں بہانوں سے ہراساں کرتے اور انہیں لوٹ لیتے۔ اخبارات میں روزانہ ان لوگوں کے خلاف خبریں چھپتی تھیں، مراسلے چھپتے تھے مگر اس قسم کی وارداتوں میں کبھی کی نہیں آئی تھی۔ بلکہ اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ ان کے خلاف کبھی کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ قانون کے محافظ ہی جب لٹیرے اور راہزن بن جائیں تو ان کے خلاف کارروائی کون کرے۔

”یہ... یہ کیا ہے؟“ شارق کے لمبے میں حیرت تھی۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ چاروں حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

”اسے ہیروئن کہتے ہیں ایک پاؤ تو ضرور ہو گی۔“ وہ شخص تھیلی کو ہاتھ میں تولتے ہوئے بلا۔ ”تم لوگوں کو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہو گا۔“

”کیا بکواس ہے۔“ شارق جھنجھلا گیا۔ ”اس پیکٹ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم میں سے وہی بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”پتہ تو تم لوگوں کو تھانے جا کر چلے گا۔“ وہ شخص معنی خیز لمبے میں بولا۔ ”خوبصورت لڑکیوں داسی لئے ساتھ رکھا جاتا ہے کہ دوسروں کو دھوکہ دے سکوں۔ شاید اس حسینہ کی وجہ سے ہی تم ل تمام چیک پوسٹوں سے بچتے ہوئے چلے آئے ہو لیکن اس خوبصورت لڑکی کا جادو ہم پر نہیں

ناکے گا۔“

”یقین کرو ہیروئن کے اس پیکٹ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ شارق بولا۔

”تو کیا یہ پیکٹ میں نے تمہارے سوٹ کیس میں رکھا تھا۔“ وہ شخص غرایا۔

”ہاں... ہاں تم نے رکھا تھا یہ پیکٹ ہمارے سوٹ کیس میں۔“ ٹہینے اچانک ہی چیخی حالانکہ بہت خوفزدہ تھی لیکن اچانک ہی اس نے چیخنا شروع کر دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ انہیں کسی ماموں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ لوگوں کو جمع کر کے انہیں بتانا چاہتی تھی کہ یہ قانون کی آڑ میں ان کے ساتھ دھوکہ کر رہے ہیں۔ اس کے شور مچانے سے پانچ چھ آدمی

مجمع ہو گئے تھے۔

”زبان بند کراؤ اس کی ورنہ اٹنا ٹانگ دوں گا لے جا کر۔“ اس شخص نے خونخوار نظروں سے

”یہ... یہ کیا ہے؟“ شارق کے لمبے میں حیرت تھی۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ چاروں حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

”اسے ہیروئن کہتے ہیں ایک پاؤ تو ضرور ہو گی۔“ وہ شخص تھیلی کو ہاتھ میں تولتے ہوئے بلا۔ ”تم لوگوں کو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہو گا۔“

”کیا بکواس ہے۔“ شارق جھنجھلا گیا۔ ”اس پیکٹ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم میں سے وہی بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”پتہ تو تم لوگوں کو تھانے جا کر چلے گا۔“ وہ شخص معنی خیز لمبے میں بولا۔ ”خوبصورت لڑکیوں داسی لئے ساتھ رکھا جاتا ہے کہ دوسروں کو دھوکہ دے سکوں۔ شاید اس حسینہ کی وجہ سے ہی تم ل تمام چیک پوسٹوں سے بچتے ہوئے چلے آئے ہو لیکن اس خوبصورت لڑکی کا جادو ہم پر نہیں

ناکے گا۔“

”یقین کرو ہیروئن کے اس پیکٹ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ شارق بولا۔

”تو کیا یہ پیکٹ میں نے تمہارے سوٹ کیس میں رکھا تھا۔“ وہ شخص غرایا۔

”ہاں... ہاں تم نے رکھا تھا یہ پیکٹ ہمارے سوٹ کیس میں۔“ ٹہینے اچانک ہی چیخی حالانکہ بہت خوفزدہ تھی لیکن اچانک ہی اس نے چیخنا شروع کر دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ انہیں کسی ماموں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ لوگوں کو جمع کر کے انہیں بتانا چاہتی تھی کہ یہ قانون کی آڑ میں ان کے ساتھ دھوکہ کر رہے ہیں۔ اس کے شور مچانے سے پانچ چھ آدمی

مجمع ہو گئے تھے۔

”زبان بند کراؤ اس کی ورنہ اٹنا ٹانگ دوں گا لے جا کر۔“ اس شخص نے خونخوار نظروں سے

”جائیے.... آپ لوگ بھی چلے جائیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ جعلی پولیس والوں سے بچنے کے بعد پولیس والوں کے ہاتھوں لٹ جائیں۔“ ہجوم میں سے ایک آدمی نے ٹینہ اور شارک کی دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کا مشورہ معقول تھا۔ شارک نے نوکھٹا کو اشارہ کیا اس نے سوٹ کیس بند کر کے ڈگی میں یا۔ اور ڈگی بھی دھڑے بند کر دی۔ وہ چاروں پہلے کی طرح ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور ڈرائیور اسی اشارت کر کے آگے بڑھا دی۔

شارک کو دراصل یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ اگر موبائل واپس آگئی اور پولیس والوں نے ان کے بارے میں جاننے اور ان کے خلاف رپورٹ لکھوانے کے لئے انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہا تو کہیں بات بگڑ نہ جائے۔ ہو سکتا ہے پولیس والے الٹا انہی سے جرح شروع کر رہے ہوں یا باتوں میں کہیں یہ خود نہ پھنس جائیں۔ اسی لئے انہوں نے یہاں سے پھوٹ میں عافیت سمجھی تھی۔

نہیں ہنسی اور لیاقت آباد سے ہوتے ہوئے وہ لوگ فیڈرل بی ایریا میں آ گئے۔ کریم آباد کا بار کرتے ہی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ڈی کوٹا نے ٹیکسی بائیں طرف ایک گلی میں مڑوا لی اور سری گلی میں گھوم کر اس نے ٹیکسی ایک بنگلے کے سامنے رکوا لی۔ یہ وہی بنگلہ تھا جہاں اپنے روانہ ہونے سے پہلے وہ لوگ مقیم تھے۔

اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ دروازہ چوکیدار نے کھولا تھا۔ یہ لوگ کئی روز بعد آئے انہیں دیکھ کر چوکیدار کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

”نہی مراد۔“ ڈی کوٹا نے چوکیدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلے ہمیں چائے پلاؤ اور پھر لے کھانے کا بندوبست کرو۔“

”جی صاحب، میں دودھ لے آؤں تو چائے بناتا ہوں۔“ علی مراد نے جواب دیا۔

ان بنگلے میں تین بیڈ روز تھے۔ ٹینہ اس کمرے میں آگئی جہاں وہ پہلے بھی رہ چکی تھی۔ میں داخل ہوتے ہی وہ بستر پر گر سی گئی۔

نہی چالیس منٹ بعد نوکھٹا دروازے میں نمودار ہوا۔ ٹینہ اس وقت آنکھیں بند کئے بستر پر آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

ہائے تیار ہو گئی ہے ٹینہ بی بی، ڈرائنگ روم میں آ جاؤ۔“ نوکھٹا کہتے ہوئے دروازے کے سے ہٹ گیا۔

ڈرائنگ روم لیتے ہوئی اٹھ گئی۔ اس نے ہاتھ روم میں جا کر کلی کی اور کمرے سے نکل کر

”کیا ہوا بہن.... کیوں چیخ رہی ہو؟“ جمع ہونے والوں میں سے ایک آدمی نے ٹینہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

”یہ.... یہ ڈاکو ہمیں لوٹا چاہتے ہیں۔“ ٹینہ چیخی۔

”کیوں اوئے.... کیا بات ہے؟“ اس آدمی نے ساوہ لباس والے کو گھورا۔

”جاؤ یہاں سے تم لوگ.... چلو بھاگو.... درنہ تم لوگوں کو بھی دھریا جائے گا۔ یہ لوگ اسمگلر ہیں اور ان کا تعلق ایک خطرناک بین الاقوامی گروہ سے ہے۔ یہ دیکھو.... ان کے سامان سے ہیروئن برآمد ہوئی ہے۔“ وہی ساوہ لباس والا بولا۔

”یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس نے یہ پیکٹ خود ہمارے سامان میں رکھا تھا۔“ ٹینہ چیخی۔

”یہ لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ راہ گروہوں کو لوٹتے ہیں۔“ ہجوم سے ایک آواز آئی۔

”تم لوگ جاتے ہو یا....“ اس شخص نے فیض کے نیچے ہولسٹر میں سے ریوالتور نکال لیا۔

”وہ دیکھو.... موبائل جا رہی ہے، بلاؤ انہیں۔“ ایک شخص چیخا۔

پولیس کی ایک موبائل چوراہے سے گردمند کی طرف جا رہی تھی۔ لیکن وہ موبائل ٹریفک کے ہجوم میں پھنسی ہوئی تھی۔ ایک آدمی نے ہونٹوں میں دو انگلیاں دبا کر سینی بجا دی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ موبائل کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے اے ایس آئی نے گردن گھما کر دیکھ لیا۔ سینی بجانے والا ہاتھ سے اشارے کرنے لگا۔

ساوہ لباس والے نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحہ وہ اپنی ٹیکسی کی طرف دوڑے۔ دوڑتے ہوئے دوسرے نے بھی ریوالتور نکال لیا تھا۔ ہجوم میں سے کسی کو ان کو پکڑنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ اگلی ٹیکسی کا ڈرائیور ان کے پیچھے سے پہلے ہی انجن اشارت کر چکا تھا۔ ان کے پیچھے ہی ٹیکسی زور دار جھٹکے سے حرکت میں آ گئی۔

پولیس موبائل کو ٹریفک کے ہجوم سے نکلنے اور مڑ کر اس طرف آنے میں دو منٹ لگ گئے تھے۔ اس دوران وہ ٹیکسی اگلا موڑ پار کر چکی تھی۔

”کیا بات ہے، کیا ہوا؟“ اے ایس آئی فوراً ہی موبائل سے اتر آیا۔ پچھلے حصے سے دو مسلح کانسٹیبل بھی اتر آئے تھے۔

”دو آدمی اپنے آپ کو پولیس والا ظاہر کر کے ہمیں لوٹا چاہتے تھے۔ وہ بھاگ گئے۔ ان کی ٹیکسی چوراہا پار کر کے سیدھی گئی ہے۔“ ڈی کوٹا نے بتایا۔

”چلو.... موبائل میں بیٹھو۔ ہری اپ۔“ اے ایس آئی نے کانسٹیبلوں کو اشارہ کیا اور خود بھی دوڑ کر موبائل میں بیٹھ گیا۔ موبائل تیزی سے حرکت میں آ گئی۔

ڈرائنگ روم میں آگئی۔ ڈی کوشا اور شارق بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ سینئر نیبل پر چائے رکھی ہوئی تھی۔ ٹینے نے ایک کپ اٹھالیا اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”ٹینے نے تو آج کمال ہی کر دیا۔“ ڈی کوشا نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اگر یہ چیخنے چلانے نہ لگتی تو وہ لوگ ہمیں لوٹ کر لے جاتے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس شخص کی نظریں ٹینے کے زیورات والے سیٹ پر تھیں۔ ہمیں چھوڑنے کے بدلے وہ کم از کم اس سیر پر تو قبضہ کر ہی لیتے۔ لیکن تمہیں پتہ کیسے چلا کہ ہیروئن کا پیکٹ اسی نے سوٹ کیس میں رکھا تھا۔“ ڈی کوشا نے چسکی لیتے ہوئے ٹینے کی طرف دیکھا۔

”سیدھی سی بات ہے۔“ ٹینے نے بھی چائے کی چسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہم چاروں میں سے کسی نے بھی سوٹ کیس میں ہیروئن نہیں رکھی تھی۔ راستے میں کئی جگہ چینگ ہوئی تھی لیکن سوٹ کیس میں ہیروئن کی موجودگی کا انکشاف کہیں بھی نہیں ہوا تھا، اور پھر یہاں پہنچ کر ہیروئن برآمد ہونا عجیب سی بات تھی۔ جب اس شخص نے ہیروئن کا پیکٹ نکال کر دکھایا تو مجھے اس وقت شبہ ہوا تھا کہ یہ لوگ دھوکے باز ہیں اور ہمیں لوٹنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ ہیروئن والا ڈرائنگ روم چلتا تو شاید میں بھی یہی سمجھتی کہ ان کا تعلق سی آئی اے سے ہے۔ ایسی صورت میں وہ میرا زیورات کا سیٹ تو کیا پورا سوٹ کیس بھی لے جاتے تو ہم میں سے کوئی بھی کچھ نہ بولتا۔ دھوکہ دہی کا احساس ہوتے ہی میرے ذہن پر طاری خوف زائل ہو گیا اور میں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔“

”یہ کراچی ہے ٹینے بی بی۔“ ڈی کوشا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہاں بڑے بڑے ڈرائنگ روم ہوتے ہیں۔ روزانہ سینکڑوں لوگ اسی طرح لٹتے رہتے ہیں مگر ان لیروں کے خلاف کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔“

”صرف کراچی ہی نہیں، ہمارے ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔“ اس مرتبہ شارق نے کہا۔

وہ لوگ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے چائے پیتے رہے۔ چائے پینے کی بعد بھی وہ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر ٹینے اٹھ گئی۔

”میں تو نمائے جا رہی ہوں۔ دن بھر کے سفر کی مٹی جسم سے چسکی ہوئی ہے۔ بڑی الجھن آ رہی ہے۔“

”نہا کر کپڑے کون سے پہنوں گی۔“ شارق نے کہا۔ ”ہمارا کپڑوں والا سوٹ کیس تو قاسم لاچ میں ہی رہ گیا تھا اور اس دن سے ہم سب لوگ یہی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔“

”یہی کپڑے جھاڑ کر پہن لئے جائیں گے۔ کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ کل بازار سے ایک دو بے خرید لئے جائیں گے۔“ ٹینے نے جواب دیا۔

”یہاں کریم آباد پر چند اچھی دکانیں ہیں۔ تیار ملبوسات وہاں سے بھی مل سکتے ہیں۔ دکانیں تک کھلی رہتی ہیں۔ ابھی تو آٹھ بجے چاہو تو شاپنگ سینٹر کا ایک چکر لگایا جا سکتا ہے۔“ ڈی کوشا نے کہا۔

ٹھیک ہے چلو پہلے شاپنگ سینٹر کا ایک چکر لگا ہی لیا جائے۔“ ٹینے نے کہا۔

شارق اور نوکھا بھی جانے کو تیار ہو گئے انہوں نے اگرچہ منہ ہاتھ دھو لئے مگر بالوں اور بڑوں پر گرد جی ہوئی تھی۔ شارق کے سر پر بندھی ہوئی پٹی بھی بہت گندی ہو رہی تھی لیکن حال ان کے پاس پہننے کے لئے کوئی کپڑا نہیں تھا اس لئے وہ پہلے مارکیٹ کا چکر لگایا چاہتے تھے۔

وہ لوگ بنگلے سے نکل کر اس گلی میں آ گئے جو مین روڈ سے جا ملتی تھی۔ اس گلی کے اختتام مین روڈ کی طرف ایک بہت بڑا پیٹروئل پمپ بھی تھا۔ وہ لوگ سڑک پار کر کے دوسری طرف آئے۔ چوراہے پر کوئی ٹریفک سگنل نہیں تھا جس کی وجہ سے ٹریفک کے سیلاب میں سڑک پار کرنے میں بھی خاصی دشواری پیش آئی تھی۔

دوسری طرف مین بازار کے سامنے بڑی رونق تھی۔ یہ کئی منزلہ عمارت تھی۔ جس کے اوپن فلور پر باہر کی طرف اور اندر بھی سینکڑوں دکانیں تھیں۔ عمارت کی پہلی منزل بھی دکانوں مشتمل تھی، مگر فرسٹ فلور کا یہ شاپنگ سینٹر صرف خواتین کے لئے مخصوص تھا۔ یہاں دکاندار خواتین تھیں اور گاہک بھی۔ مردوں کو اوپر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی شاپنگ سینٹر کی سڑک کا نام ہی مین بازار رکھا گیا تھا۔

”اب ایسا کرتے ہیں کہ تم اوپر چلی جاؤ۔ اور ہم نیچے گھوم پھر کر شاپنگ کر لیتے ہیں۔ رے پاس پیسے تو ہیں نا؟“ شارق نے ٹینے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، میرے پاس کافی رقم ہے۔“ ٹینے نے پتلون کی ہپ پاکٹ پھتہ پاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، ایک گھنٹے بعد ہم یہیں ملیں گے۔ زیادہ دیر مت کرنا۔“ شارق نے کہا۔

ٹینے اوپر مین بازار کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی جہاں ایک باوردی چوکیدار کھڑا تھا۔ ٹینے کے جانے کے بعد شارق وغیرہ نیچے والی دکانوں کے درمیان ایک گلی میں داخل ہو گئے۔

اندر تک سی کئی گلیاں تھیں۔ جن میں چھوٹی چھوٹی لائندہ دکانیں تھیں۔ ان دکانوں پر ہر چیز

دستیاب تھی۔ مارکیٹ کے اندر اچھا خاصا رش تھا۔ زیادہ تر خواتین تھیں۔ تنگ سی گلیوں میں راستہ چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔

وہ تینوں مارکیٹ کے اس سیکشن میں آ گئے جہاں تیار ملبوسات کی دکانیں تھیں۔ بہت سے لوگ مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے حلقے ہی ایسے تھے کہ دوسروں کو اپنی طرز متوجہ کر لیتے تھے۔ وہ مردانہ کپڑوں کی ایک دکان پر رک گئے۔ دکاندار بھی ان کے حلقے دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”شلوار سوٹ دکھاؤ بھئی، ہم تینوں کے لئے۔“ شارق نے کہا۔

”سر! آپ کے سر پر یہ پٹی، خیریت تو ہے جناب؟“ دکاندار نے شارق کے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ کامیاب دکاندار وہی ہوتا ہے جو گاہک کو قابو کر لے۔ گاہک کا قابو کرنے کے بہت سے طریقے ہوتے ہیں اور اس دکاندار نے شارق سے ہمدردی کے اظہار طریقہ اپنایا تھا۔

”ارے بھئی، سیرو تفریح کے لئے کراچی آئے ہیں۔ پہلے بس کا ایکسی ڈنٹ ہوا جس سے میرے سر میں یہ چوٹ لگی پھر جب کراچی پہنچے تو پتہ چلا کہ ہمارا سوٹ کیس بھی غائب ہے۔ غارے میں اترنے والا کوئی مسافر ہمارا سوٹ کیس مال غنیمت سمجھ کر اٹھا لے گیا ہے۔“

”جناب کہاں سے تشریف لائے ہیں۔“ دکاندار نے اس واقعہ پر اظہار افسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

”صادق آباد سے۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”اب آپ ہمیں کپڑے دکھا دیجئے۔“

”ابھی لیجئے۔“ دکاندار نے کہا اور کچھ ہی دیر میں اس نے ان کے سامنے مختلف رنگوں اور مختلف اقسام کے کپڑوں کا انبار لگا دیا۔

ڈی کوسٹا نے اپنے لئے صرف ایک سوٹ پسند کیا تھا۔ کیونکہ اس کا گھر تو کراچی ہی میں تھا اور گھر میں اس کے پاس کپڑوں کی کمی نہیں تھی۔ شارق اور نوکھانے تین تین سوٹ پسند کئے۔ کپڑے خریدنے کے بعد وہ مارکیٹ میں گھوم پھر کر ضرورت کی دیگر چیزیں خریدتے رہے۔ جن میں ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ برش اور شیونگ وغیرہ کا سامان شامل تھا۔

جب وہ لوگ مارکیٹ سے نکل کر مقررہ جگہ پر پہنچے تو ایک گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ تقریباً اسی وقت ٹینے بھی مینا بازار کی میزبیاں اترتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے بھی تین چار شاپنگ بیگ اٹھا رکھے تھے۔ وہ چاروں سڑک پار کر کے دوسری طرف آ گئے اور پھر بیٹگلے تک پہنچے۔

علی مراد بچن میں تھا۔ مرغی فرائی کئے جانے کی خوشبو آ رہی تھی۔ ان چاروں ہی نے باورچی خانے میں جھانکا تھا۔ خوشبو سے ان کی بھوک اور چمک اٹھی تھی۔

”کھانے میں کتنی دیر ہے علی مراد؟“ ٹینے نے پوچھا۔

”پندرہ بیس منٹ تو لگیں گے جی۔“ علی مراد نے جواب دیا۔

وہ لوگ ڈرائنگ روم میں آ گئے اور اپنے اپنے شاپنگ بیگز کھول کر چیزیں چیک کرنے لگے۔ ٹینے لان کا ایک جوڑا اور کچھ دوسری چیزیں لے کر اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کھڑکی کے پردے برابر کر دیئے اور کپڑے اتار کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔ تقریباً پندرہ منٹ تک وہ شاور کے نیچے کھڑی جسم کی مٹی اتارتی رہی اور پھر کمرے میں آ کر س نے لان کا نیا جوڑا پہن لیا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو بہت ہلکی پھلکی اور تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔

اس دوران شارق وغیرہ بھی نما دھو کر اپنے حلقے تبدیل کر چکے تھے۔ دس بجے کے لگ بھگ انہوں نے ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد بھی وہ لوگ دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ بارہ بجے کے لگ بھگ نوکھانا اٹھنے لگا اور وہ وہیں قالین پر ڈھیر ہو لیا کچھ دیر بعد ٹینے بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی اور بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بند کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔

شارق اور ڈی کوسٹا دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر شارق بھی جمائی لیتا ہوا اٹھ گیا۔ ڈی کوسٹا وہیں نوکھانے کے قریب لیٹ گیا تھا۔ شارق دوسرے بیڈ روم کی طرف بڑھا پھر کچھ سوچ کر ٹینے کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ ٹائٹ بلب جل رہا تھا۔ ٹینے پلنگ پر آڑھی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔ شارق کا دل چاہا کہ وہ اندر چلا جائے مگر پھر کچھ نہ کر دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس بیٹگلے میں وہ دونوں اکیلے نہیں تھے۔ دوسرے لوگ موجود تھے اس لئے وہ محتاط ہی رہنا چاہتا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ اور کچھ ہی دیر بعد اس کی آنکھیں بھی بند ہو چکی تھیں۔

اور پھر نجانے رات کا وہ کون سا پھر تھا کہ کھٹکے کی آواز سن کر نوکھانے کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے لیٹے لیٹے اوپر اوپر دیکھا۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ اسی لمحہ باہر سے آہٹ پھر سائی دی۔ نوکھانا سر کو ایک ہلکا سا جھکا دیا۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ سونے کے لئے لیٹا تھا تو ٹینے، ڈی کوسٹا اور ٹی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ڈی کوسٹا اس کے قریب ہی قالین پر سو رہا تھا۔ غالباً شارق اور ٹینے جلتے ہوئے جی بجا دی تھی.... باہر والی جی جل رہی تھی اور اس کی بہت مدھم سی روشنی

کمرے میں بھی پہنچ رہی تھی۔

نولکھا اب پوری طرح حواس میں آچکا تھا اور وہ کوئی آہٹ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ دفنہ آواز پھر سنائی دی۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی دبے قدموں چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دفنہ ایک اور آواز سن کر وہ چونک گیا۔ وہ کسی آدمی کی آواز تھی جو سرگوشی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ لڑ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

نولکھا بڑی احتیاط سے اپنی جگہ سے اٹھ کر دیوار کے ساتھ چلتا ہوا کھڑکی کے قریب آگیا۔ کھڑکی میں گرل لگی ہوئی تھی لیکن پٹ کھلے ہوئے تھے وہ باہر کی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا وہی سرگوشیانہ آواز کہہ رہی تھی۔

”تم سامنے والے دروازے کے قریب کھڑے رہو اور فضل داؤد تم دائیں طرف سے جاؤ اور میں بائیں طرف سے جاتا ہوں۔ چھت تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں ہو گا اور پھر ہم آسانی سے اندر والے صحن میں اتر جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ دوسری آواز سنائی دی۔

”اور قادر.... میں اندر داخل ہوتے ہی دروازہ کھول دوں گا۔ تم بھی اندر آ جانا بظاہر تو لگا ہے کہ ان لوگوں کے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں ہو گا لیکن پھر بھی ہمیں محتاط رہنا ہو گا۔“ پرا آواز نے کہا۔

”تم دونوں کے پاس ریوالور موجود ہیں اور پستول میرے پاس بھی ہے۔ فکر مت کرو۔“

لوگ جاؤ۔ میں دروازے پر موجود ہوں۔“ قادر نے جواب دیا۔

اور اس کے بعد کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دینے لگی۔ نولکھا اپنی جگہ پر کھڑا رہا پھر جب قدموں کی چاپ معدوم ہو گئی تو وہ بڑی احتیاط سے چلتا ہوا ڈکوشا کے قریب قالین پر بیٹھ گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستہ آہستہ ہلانے لگا۔

”کون... کون ہے... کیا ہے؟“ ڈی کوشا گڑبڑا کر اٹھ گیا۔

”خاموش رہو۔“ نولکھا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”میں ہوں نولکھا... کچھ لوگ اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی تعداد تین ہے اور وہ تیز مسلح ہیں۔ ایک دروازے کے باہر کھڑا ہے اور دو چھت کے راستے اندر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”اوہ!“ ڈی کوشا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”کون ہیں وہ لوگ؟“

”چور ڈاکو ہوں گے.... میرے رشتہ دار بہر حال نہیں ہیں۔“ نولکھا نے جواب دیا۔

”شارق اور شبنم کو بتاؤ۔“ ڈی کوشا بولا۔

”اب موقع نہیں ہے۔“ نولکھا نے سرگوشی کی۔ ”اگر ہم اس کمرے سے باہر نکلے تو ہمارے چلنے پھرنے کی آوازیں سن کر وہ لوگ محتاط ہو جائیں گے۔ میرے ذہن میں ایک منصوبہ یہ ہے کہ تم اسی طرح قالین پر لیٹے رہو جیسے سو رہے ہو۔ میں یہاں دروازے کے پیچھے چھپ جاتا ہوں۔ لان میں سے کوئی ایک اس کمرے میں داخل ضرور ہو گا۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ ہمیں گن پوائنٹ پر لینے کی کوشش کرے گا اور میں پیچھے سے اسے گرفت میں لے لوں گا۔“

”اگر اس نے مجھے گن پوائنٹ پر لینے کے بجائے گن چلا دی تو؟“ ڈی کوشا نے کہا۔

”میرا خیال ہے وہ ایسا نہیں کرے گا۔“ نولکھا نے سرگوشی کی۔ ”وہ لوگ چوری کی نیت سے آئے ہیں ہمیں قتل کرنے نہیں کہ دیکھتے ہی گولی چلا دیں۔ ان کی کوشش یہ ہو گی کہ ہم سب کو کسی ایک جگہ جمع کر کے کوئی آدمی ہمیں گن پوائنٹ پر لئے رہے اور اس کے باقی ساتھی قیمتی اشیاء تلاش کرنے یا سمیٹنے لگیں۔ چوروں اور ڈاکوؤں کا طریقہ کار یہی ہوتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ڈی کوشا نے پھر سرگوشی کی پھر ایک آواز سن کر چونک گیا۔ ”میرا خیال ہے کوئی اندر کودا ہے۔ میں قالین پر لیٹ رہا ہوں۔ تم دروازے کے پیچھے جاؤ۔“

نولکھا بڑی تیزی سے حرکت میں آیا اور دروازے کے قریب دیوار سے اس طرح چپک کر کھڑا ہو گیا کہ اگر دروازہ کھلے تو وہ اس کے پیچھے چھپا رہ جائے۔ ڈی کوشا کروٹ کے بل قالین پر لیٹ گیا۔ اس کا چہرہ دروازے کی طرف تھا۔ اس نے ایک بازو موڑ کر تکتے کی طرح سر کے نیچے رکھ لیا تھا اور دوسرا بازو سر کے اوپر تھا۔ اس نے آنکھوں میں ذرا سی جھری پیدا کر رکھی تھی اور وہ اس جھری سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نولکھا نے ڈی کوشا کی طرف دیکھا اور پھر کمرے کے باہر قدموں کی ہلکی سی آواز سن کر چونک گیا۔ آواز دروازے کے سامنے رک گئی۔ پھر باہر سے کسی نے دروازے پر ہاتھ رکھا اور ہینڈل گھمائے جانے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ نولکھا نے اپنا سانس تک روک لیا۔

دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ اور پھر ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ریوالور تھا۔ دروازہ پورا نہیں کھلا تھا لیکن نولکھا اس کی آڑ میں تھا۔ وہ شخص ایک قدم آگے بڑھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر وہ ڈی کوشا سے ایک قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ اس کے پستول کا رخ کوشا کی طرف تھا۔ نولکھا دروازے کی آڑ سے نکلا اور بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا اس شخص کی طرف بڑھنے لگا۔

اس آدمی کی چھٹی حس نے غالباً اسے کسی انجانے طرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ تیزی سے

پیچھے گھوما لیکن اسے دیر ہو گئی تھی۔ نوکھا عقاب کی طرح اس پر جھپٹا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اس شخص کے پستول والے ہاتھ پر اور دوسرا اسی بازو پر کہنی سے ذرا اوپر پڑا تھا۔ اس شخص نے ٹرائیگر دبا دیا۔ ممکن ہے وہ اپنا ہاتھ نوکھا کی گرفت سے چھڑا لیتا لیکن قالین پر لیٹے ہوئے ڈی کوٹھانے اس کی دونوں ٹانگوں کو ٹخنوں کے قریب سے پکڑ کر زور دار جھکا دیا۔ پستول سے نکلنے والی گولی چھت میں لگی تھی۔ پیروں کو جھکا گئے سے وہ شخص پشت کے بل گرا تھا۔ نوکھا نے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔

”ڈکوتا!“ نوکھا چیخا۔ ”تم اسے سنبھالو۔ میں باہر جا رہا ہوں۔“

اسی لمحہ ثینہ کی چیخ سنائی دی نوکھا باہر کی طرف دوڑا اس نے شارق کو اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا لیکن بائیں طرف بیرونی دروازے کے قریب ایک آدمی کو حرکت کرتے دیکھ کر نوکھا چونک گیا۔

”شارق بچو۔“ نوکھا چیخا۔

شارق نے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ اسی لمحہ بیرونی دروازے کی طرف سے فائر ہوا تھا اور گولی ٹھیک اس جگہ پیچھے دیوار میں لگی تھی جہاں کچھ دیر پہلے شارق کھڑا تھا۔ نوکھا نے اس کی طرف فائر جھونک دیا جہاں سے کچھ دیر پہلے شارق پر گولی چلائی گئی تھی۔ شارق پر گولی چلانے والا شخص باہر بھاگ گیا۔ نوکھا اس کے پیچھے دوڑا لیکن اس شخص نے دوڑتے ہوئے دروازہ بند کر دیا تھا۔ نوکھا کو دروازہ کھولنے میں کچھ دیر لگی۔ اسی لمحہ بیرونی گیٹ دھڑ سے بند ہونے کی آواز سنائی دی اور جب نوکھا بیرونی گیٹ کے قریب پہنچا تو گلی میں کسی گاڑی کا انجن اشارت ہونے کی آواز سنائی دی۔ نوکھا نے گیٹ کھول کر باہر نکلتا چاہا لیکن گیٹ کو باہر سے کنڈا لگا دیا گیا تھا۔ نوکھا حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تقریباً آٹھ فٹ اونچی دیوار پر چڑھ گیا۔ اسی وقت ایک ٹیکسی گلی میں دوڑتی ہوئی نظر آئی۔ نوکھا نے گولی چلا دی۔ ٹیکسی کی پچھلی وینڈ اسکرین ٹوٹ گئی لیکن ٹیکسی تیزی سے آگے نکل گئی تھی۔

نوکھا چھلانگ لگا کر نیچے اترا۔ جب وہ ڈرائنگ روم کے دروازے میں آیا تو وہاں کا منظر خاصا تشویش آمیز تھا۔ ڈی کوٹھانے اس شخص کے شخبے میں جکڑا ہوا تھا۔ نوکھا نے آگے بڑھ کر اس شخص کے سر پر ٹھوکر ماری۔ وہ شخص بلبلاتا کر بائیں طرف الٹ گیا۔ نوکھا نے اس کے دو تین ٹھوکریں مار دیں۔ وہ شخص بلبلاتا ہوا پورے ڈرائنگ روم میں لوٹ رہا تھا۔ سینئر نیبل دو کرسیاں اور ایک صوفہ الٹ گیا تھا۔ ثینہ کی چیخ ایک بار پھر سنائی دی۔ نوکھا چونک گیا۔

”بھائی ڈکوتا۔ اب اس کو مت چھوڑنا۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ نوکھا کہتے ہوئے پھر باہر دوڑا۔

وہ ثینہ والے کمرے کی طرف دوڑا۔ یہاں ایک دلچسپ منظر اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ ارق اور وہ آدمی ایک دوسرے سے کھٹکتے تھے اور ثینہ ادھر ادھر اچھلتے ہوئے اس آدمی کو بوکریں مارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی جگہ میں اس کی ایک ٹھوکر شارق کی پسلیوں میں لگی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اس شخص پر سے شارق کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی اور شارق اس شخص کے شخبے میں آ گیا تھا۔ اس سارے منظر میں دلچسپی کی بات یہ تھی کہ ثینہ کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا جو غالباً اس شخص سے چھینا گیا تھا۔

حریف شارق کی پشت پر تھا اور اس نے اپنا دایاں بازو شارق کے گلے پر لپیٹ رکھا تھا۔ وہ ارق کی گردن کو ہلکے ہلکے جھٹکے دے رہا تھا۔ شارق کے چہرے پر بے پناہ اذیت کے تاثرات تھے۔ اس کی آنکھیں باہر کو ابلی پڑ رہی تھیں۔

نوکھا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے ریوالور کو ٹال کی طرف سے پکڑا اور اس شخص کے پیچھے پھینچ کر ریوالور کے دستے سے زور دار ضرب اس شخص کی گردن سے ذرا نیچے ماری۔ ضرب زور دار تھی۔ وہ شخص بلبلاتا اٹھا۔ نوکھا نے دوسری ضرب اس کی کھوپڑی پر لگائی تھی۔ وہ شخص باغ اٹھا مگر اس نے شارق کی گردن نہیں چھوڑی تھی۔ نوکھا نے اس مرتبہ اسکے دائیں کندھے پر ضرب لگائی۔ یہ ضرب کارگر ثابت ہوئی۔ اس شخص نے بلبلاتا کر شارق کو چھوڑ دیا۔

اپنی گلو خلاصی ہوتے ہی شارق اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چند لمحے اپنا گلا سلواتا رہا پھر اس نے مین پر پڑے ہوئے اپنے حریف پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

”بس شارق باؤ۔“ نوکھا نے کہا۔ ”کچھ کام دوسروں کے لئے بھی رہنے دو۔“ شارق رک گیا۔ وہ بری طرح ہانپ گیا تھا۔

”بتی جلاؤ ثینہ۔ ذرا اس کا چہرہ تو دیکھیں۔“ نوکھا نے کہا۔

ثینہ نے ٹیوب لائٹ جلا دی۔ اس شخص کی شکل دیکھتے ہی وہ تینوں چونک گئے۔ یہ وہی بلی ڈرائیور تھا جس کے ساتھ وہ بسوں کے اڈے سے یہاں آئے تھے۔

”اوتے تم....“ نوکھا اچھل پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ جملہ پورا کرتا ڈرائنگ روم سے ڈی کوٹھانے کی چیخ کی آواز سنائی دی۔ ”شارق باؤ، اس کو سنبھالو میں ڈکوتا کو دیکھتا ہوں۔“ نوکھا کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم کی طرف دوڑا۔

ڈی کوٹھانے ایک بار پھر اس شخص کے قابو میں آ گیا تھا۔ نوکھا نے اس پر بھی وہی حربہ آزمایا جو شارق کے حریف پر آزما چکا تھا۔ اس شخص نے ڈی کوٹھانے کو چھوڑ دیا اور دونوں ہاتھوں سے سر کو نہم کر بیٹھ گیا۔ نوکھا نے دیوار کے قریب پہنچ کر بتی جلا دی۔ وہ شخص دونوں ہاتھوں سے سر

ہے۔“

”علیٰ مراد کہاں ہے؟ کیا اس نے فائرنگ کی آواز نہیں سنی۔“ نوکھا بولا۔

”وہ رات کو ہمیں کھانا کھلانے کے بعد ایک دوست کے ہاں چلا گیا تھا۔ صبح سویرے آجائے گا۔“ ڈی کوشا نے ڈرائنگ روم میں کونے میں اسٹینڈ پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”میں پولیس کو اطلاع دیتا ہوں۔“

وہ صوفے کے کنارے پر بیٹھ گیا اور فون کا ریسپور اٹھا کر ایمرجنسی نمبر ڈائل کرنے لگا۔ تین چار مرتبہ کی کوشش کے بعد کال ریسپو ہو سکی تھی۔ ڈی کوشا نے ڈیوٹی آفیسر کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”ان میں سے ایک ڈاکو تو فرار ہو گیا ہے اور دو کو ہم نے گرفت میں لے لیا ہے۔ جی نہیں جانی نقصان کوئی نہیں ہوا۔ اتفاق سے آہٹ سن کر ہماری آنکھ کھل گئی تھی جس سے ہم ہوشیار ہو گئے تھے۔ ٹھیک ہے جناب، ہم انتظار کر رہے ہیں۔“ اس نے فون بند کر دیا اور شارک کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ لوگ مقامی تھانے سے رابطہ کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں کوئی موبائل یہاں پہنچ جائے گی۔“

اور پھر موبائل آدھے گھنٹے بعد گلی میں داخل ہوئی تھی۔ سائرن کی آواز سن کر ڈی کوشا باہر آگیا۔ موبائل دو گھر آگے جا کر رکی تھی۔ ڈی کوشا نے آگے بڑھ کر انہیں بتایا کہ فون اس نے کیا تھا۔

اس پولیس پارٹی کا انچارج ایک نوجوان اے ایس آئی تھا۔ دو کانٹیل رائفلیں سنبھالے گیٹ کے بنگلے کے سامنے کھڑے ہو گئے اور تین کانٹیل اے ایس آئی کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ مختلف گھروں میں بتیاں جل گئی تھیں اور کچھ لوگ کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے۔

”یہ ہیں وہ دونوں ڈاکو۔“ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر ڈی کوشا نے ان دونوں کی طرف اشارہ کیا جو قالین پر بیٹھے ہوئے تھے اور نوکھا اور شارک نے ان پر ریوالور تان رکھے تھے۔

”اور یہ رہے ان کے ریوالور جو ہم نے ان سے چھینے تھے۔“ نوکھا نے اپنا ریوالور اے ایس آئی کی طرف بڑھا دیا۔ شارک نے بھی ریوالور اے ایس آئی کے حوالے کر دیا۔

”میرا نام ڈی کوشا ہے۔ میں صدر میں رہتا ہوں۔“ ڈی کوشا نے جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکل کر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرے دوست ہیں جو سیر و تفریح کے لئے پنجاب سے آئے ہوئے ہیں۔ یہ بنگلے میرے ایک اور دوست کا ہے جو ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔ اپنے گھر میں مناسب جگہ نہ ہونے کی وجہ سے میں نے انہیں یہاں ٹھہرایا ہوا ہے۔ دو تین دن پہلے میں انہیں سیر کرانے کے لئے سوئیڈن لے گیا تھا۔ واپس آئے تو بندر روڈ پر ان لوگوں نے ہماری ٹیکسی روک لی اور

تھامے بیٹھا تھا اس کا چہرہ نیچے کی طرف تھا۔ نوکھا نے آگے بڑھ کر اسے زوردار ٹھوکر ماری اور دائیں طرف الٹ گیا۔ اس کی شکل دیکھ کر نوکھا ایک بار پھر چونک گیا۔ وہ ان دونوں پولیس والوں میں سے ایک تھا جنہوں نے انہیں شام کو راستے میں ہیروئن کے چکر میں پھنسا کر لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ نوکھا کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ فرار ہو جانے والا دوسرا پولیس والا تھا۔

”بہت ہی بے غیرت نکلے تم لوگ تو۔“ نوکھا نے اسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ شام کو تم لوگ پولیس کے ہاتھ نہیں آئے تھے اور اگر پکڑے بھی گئے تھے تو ان پولیس والوں نے تم لوگوں کو اپنا بھائی بند سمجھ کر چھوڑ دیا تھا مگر... اب تم لوگ نہیں بچ سکو گے۔ پکا بندوبست کیا جائے گا تمہارا۔“

نوکھا اس شخص پر ٹھوکروں کی بارش کرتا رہا۔ اور بالآخر اسے چھوڑ کر الگ ہو گیا۔ اس دوران شارک اور ٹیمنے دوسرے آدمی کو بھی ڈرائنگ روم میں لے آئے تھے۔ اس مرتبہ ریوالور ٹیمنے کے بجائے شارک کے ہاتھ میں تھا۔

”اوہ!“ یہ بھی اسی کا ساتھی ہے۔“ شارک اس پولیس والے کو دیکھ کر چونک گیا۔ ”یہ وہی گروپ ہے شارک باؤ۔“ نوکھا نے کہا۔ ”اور یہ ٹیکسی ڈرائیور انہی کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اب میں ساری بات سمجھ گیا ہوں۔ یہ دونوں تو اس وقت بھاگ گئے تھے مگر یہ ٹیکسی ڈرائیور ہمارا گھر دیکھ گیا تھا۔ اور انہوں نے موقع ملنے ہی بلہ بول دیا۔“

”مم... میں بے قصور ہوں جناب۔“ ڈرائیور بولا۔ وہ بنگالی تھا۔ ”انہوں نے مجھے دھمکی دے کر اپنے ساتھ ملایا تھا۔“

”ابھی پتہ چل جاتا ہے پترا۔“ نوکھا نے کہا۔ ”اب میں ساری بات سمجھ گیا ہوں۔ تم ان کے کپے ساتھی ہو۔ اور ان کے حصہ دار ہو۔ مرغا بن جاوے۔“

ڈرائیور منت سہجت کرنے لگا۔ لیکن اسے مرغا تو بننا ہی پڑا تھا۔ وہ جیسے ہی مرغا بنا نوکھا نے اس کی کمر پر بھرپور ٹھوکر ماری۔ بنگالی ڈرائیور چیختا ہوا منہ کے بل ڈھیر ہو گیا۔ نوکھا نے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی پھر ایک طرف کھڑے ہو کر ہانپنے لگا۔

”ان لوگوں کا کیا کیا جائے؟“ شارک نے سوالیہ نگاہوں سے ڈی کوشا کی طرف دیکھا۔ ”پولیس کو اطلاع دی جائے؟“

”پولیس کو اطلاع دینی ہی پڑے گی۔“ ڈی کوشا نے کہا۔ ”اگر فائرنگ نہ ہوتی تو ہم خود ہی ان کا کوئی بندوبست کر لیتے۔ لیکن فائرنگ کی آواز محلے والوں نے بھی سنی ہو گی اور پھر ان کا تیسرا ساتھی بھاگ گیا ہے۔ وہ بھی ہمارے لئے مسئلہ بن سکتا ہے۔ اس لئے پولیس کو اطلاع دینا ضروری

گئے۔ ڈی کوشا انہیں سی آف کرنے کے لئے آیا تھا۔ تیز گام کا وقت تھا اور کینٹ اسٹیشن پر بے پناہ ہجوم تھا۔ آج صبح جب ڈی کوشا ٹکٹ لینے گیا تھا تو اسے بتایا گیا تھا کہ پندرہ دن سے پہلے کسی ٹرین کا ٹکٹ دستیاب نہیں ہے۔ اس نے واپس جا کر شارق کو صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن شارق نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ آج ہی لاہور جائیں گے اور تیز گام ہی سے جائیں گے۔

ہیٹ فارم پر تل رکھنے کو جگہ نہیں تھی۔ لوگ پریشانی میں ادھر ادھر دوڑے پھر رہے تھے۔ جن کی پاس ریزرویشن نہیں تھی وہ کنڈکٹر گارڈ اور ریلوے کے اس اہلکار کے پیچھے پھر رہے تھے جس کے پاس ٹرین کا بنگ چارٹ تھا۔ کچھ لوگ قلیوں کی منت سماجت کرتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے پھر رہے تھے۔

شارق انہیں ایک جگہ چھوڑ کر گیٹ کے قریب پہنچ گیا جہاں بہت سے لوگ ریلوے کے اس اہلکار کو گھیرے کھڑے تھے جس کے پاس بنگ چارٹ تھا۔ شارق ہجوم میں گھس گیا اور اس اہل کار کو بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا۔ ریلوے اہلکار پریشان ہو گیا۔ شارق نے جیب سے پانچ سو کا ایک نوٹ نکال کر اس کی مٹھی میں دبا دیا۔

”یہ تمہارا نذرانہ ہے فرسٹ کلاس کے تین ٹکٹ!“

ریلوے اہلکار نے پہلے مٹھی کھول کر دیکھی پھر شارق کی طرف دیکھ کر بولا۔

”وہڈو سے ٹکٹ لے آئے۔ میں اس بوگی کے سامنے کھڑا ہوں۔“

شارق مسکراتا ہوا گیٹ سے باہر نکل گیا۔ اس نے وہڈو سے تین ٹکٹ خریدے اور اپنے ساتھیوں کو لے کر مذکورہ بوگی کے سامنے آ گیا۔ ریلوے کا اہلکار وہاں کھڑا تھا۔ کچھ لوگ اب بھی اسے گھیرے کھڑے تھے۔ شارق نے آگے بڑھ کر تینوں ٹکٹ اس کے حوالے کر دیئے وہ ٹکٹ لے کر بوگی میں گھس گیا۔ شارق وغیرہ بھی اس کے پیچھے ہی تھے۔ ریلوے اہلکار ایک کمپارٹمنٹ میں گھس گیا۔ یہ چار برتھوں والا کمپارٹمنٹ تھا۔ دو نیچے اور دو اوپر۔۔۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ ریلوے اہلکار نے اس کا ٹکٹ لے کر دیکھا جس پر ریزرویشن نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔

”آپ کا برتھ یہ نہ ہے اوپر والا۔“ ریلوے اہلکار نے اسے ٹکٹ لوٹاتے ہوئے اوپر والے ایک برتھ کی طرف اشارہ کیا اور چارٹ دیکھ کر شارق کے دیئے ہوئے ٹکٹوں پر ریزرویشن نمبر لگانے کے بعد ٹکٹ اس کے حوالے کر دیئے۔ ”یہ تینوں برتھ آپ کے ہیں۔ ذرا نام لکھوا دیجئے۔“

شارق نے اپنا، ٹینے اور نوکھیا کے نام لکھوا دیئے اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹکٹ لے کر جیب میں رکھ لئے۔ ریلوے اہلکار چلا گیا۔ وہ چاروں سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ ڈی کوشا شارق کی

نجانے کس طرح ہمارے سوٹ کیس سے ہیروئن کا پیکٹ برآمد کر کے ہمیں گرفتار کر لینے کی دھمکی دی۔ یہ لوگ اس طرح ہمیں لوٹا چاہتے تھے لیکن اتفاق سے ایک پولیس موبائل اس طرف آگئی اور یہ لوگ وہاں سے بھاگ نکلے۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور ہے۔“ ڈی کوشا نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا۔ ”جو ہمیں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس طرح اس نے ہمارا گھر دیکھ لیا اور یہ لوگ ہم پر چڑھ دوڑے۔ اس شخص کا تعلق پولیس سے ہے۔“ اس نے دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کا دوسرا ساتھی جو بھاگ گیا ہے، اس کا تعلق بھی پولیس ہی سے ہے۔ یہ لوگ پولیس کی دھونس بجا کر وارداتیں کرتے اور لوگوں کو پریشان کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے پولیس کے محکمہ کو بھی بدنام کر رکھا ہے۔“

”اب کم از کم یہ لوگ تو کسی کو پریشان نہیں کریں گے۔“ اے ایس آئی نے کہا۔ پہلے اس نے دونوں کی تلاشی لی۔ پولیس والے کے قبضے سے اس کے محکمہ پولیس کا شناختی کارڈ بھی برآمد ہوا تھا۔ دوسرا بنگالی ڈرائیور ان کا باقاعدہ ساتھی تھا اور یہ لوگ مل کر وارداتیں کرتے تھے اور مال غنیمت میں تینوں برابر کے حصے دار ہوتے تھے۔

اے ایس آئی نے ان دونوں کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ بھاری جوتے ان دونوں کے جسموں کے مختلف حصوں پر پڑ رہے تھے۔ اور وہ ذبح ہوتے ہوئے جانوروں کی طرح بلبلا رہے تھے پھر ان دونوں کو ہتھکڑیاں لگا کر باہر موبائل میں بھیج دیا گیا۔

پولیس پارٹی تقریباً ایک گھنٹہ وہاں رہی۔ ڈی کوشا ہی کی معیت میں رپورٹ لکھوائی گئی تھی۔ اس طرح شارق وغیرہ کے نام نہیں آئے تھے۔

پولیس کے جانے کے بعد وہ لوگ ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے پھر ٹینے جمائی لیتی ہوئی صوفے سے اٹھ کر ایک طرف قالین پر لیٹ گئی۔ اس نے صوفے کا ایک کونہ تنگے کے طور پر سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔

”ٹینڈ آرہی ہے تو اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔“ شارق نے کہا۔

”نہیں“ میں یہیں سوؤں گی۔ مجھے اپنے کمرے میں اکیلے سوتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔ تم

لوگ بھی یہیں سو جانا۔ ایک ہی کمرے میں۔“ ٹینے نے جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ سو چکی تھی۔ رات کا آخری پر تھا۔ گھنٹے بھر میں صبح ہونے والی تھی۔ وہ لوگ بھی باتیں کرتے کرتے اونگھنے لگے اور پھر وہیں ادھر ادھر پڑ کر سو گئے۔

○

تین دن مزید کراچی میں رہنے کے بعد وہ لوگ لاہور جانے کے لئے ریلوے اسٹیشن

جلدی سے پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے زور کا پھندہ لگا اور حلق بن اٹکا ہوا نوالہ باہر آگیا۔ اگر وہ فوراً ہی رخ نہ پھیر لیتی تو منہ کا اٹکا ہوا نوالہ اور پانی کی پھوار کھانے کی ٹبے پر پڑتی۔ وہ اٹھ کر دوسری سیٹ پر جا بیٹھی تھی۔ شارق بھی اٹھ کر اس کے قریب آگیا اور اس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔ پھندہ اس زور کا لگا تھا کہ ٹینے کے منہ سے آواز تک نہیں مل رہی تھی۔ شارق نے اسے دو تین مرتبہ گھونٹ گھونٹ پانی پلایا۔ دو تین منٹ بعد ٹینے کی بات سنبھل سکی تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر انجانا سا خوف بر آیا تھا۔ شارق دوبارہ اپنی سیٹ پر آگیا اور ان کے ساتھ کھانے میں شامل ہو گیا۔

”بڑا زور کا پھندہ لگا ہے۔“ عبدالکریم، ٹینے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے۔“ شارق نے کہا۔ ”ہاں تو آپ کیا کہہ رہے تھے کہ تقریباً چھ ماہ ملے ٹینے کو چورجی کوارٹرز میں دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ٹینے کے الدین مغلیہ میں رہتے ہیں جہاں ان کا آبائی مکان ہے۔ ہماری شادی کو تین سال ہو چکے ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس دوران ہم ایک بار بھی چورجی کوارٹرز نہیں گئے۔ وہاں تو ہمارا کوئی شے وار یا دوست بھی نہیں رہتا۔ نہ میرا نہ ٹینے کا۔ آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“

”ہو سکتا ہے۔“ عبدالکریم نے کہا۔ ”بعض اوقات چہروں میں اتنی مشابہت ہوتی ہے کہ دی دھوکا کھا جاتا ہے۔“

نوکھا ابھی تک خاموش بیٹھا ہوا تھا لیکن معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس نے موضوع لے لیا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد نوکھا ہی نے برتن سمیٹ کر سیٹ کے نیچے رکھ دیئے تھے۔ ٹینے کھڑکی کے قریب بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی۔ تاریکی میں پیچھے کی طرف دوڑتے ہوئے درختوں کے بلے بہت عجیب لگ رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی بستی کی خوابیدہ سی روشنیاں بھی دکھائی دے تھیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ڈائنگ کار کا پیرا برتن لینے کے لئے آیا تو عبدالکریم نے جیب سے پرس لے لیا لیکن شارق نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ہمارے ووٹ زیادہ ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ ترجیح ہمیشہ اکثریت کے فیصلے کو دی جاتی ہے۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ تو آپ زیادتی کر رہے ہیں۔“ عبدالکریم نے کہا۔ ”کھانے کا آرڈر تو میں نے دیا تھا۔“

”اگر آپ پہل نہ کرتے تو یہ آرڈر میں دیتا۔ بہر حال، چوبیس گھنٹے کا ساتھ ہے۔ صبح کا ناشتہ آپ کی طرف سے کریں گے۔“ شارق نے کہتے ہوئے بیرے کو بل دے دیا۔

طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

انجن کے وسل کی آواز سنائی دی تو ڈی کوشا سیٹ سے اٹھ گیا۔ اس نے بڑی گرجبوشی سے نوکھا اور شارق سے مصافحہ کیا۔ ٹینے کی طرف دیکھ کر ہاتھ بلایا اور ٹرین سے اتر گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد ٹرین چل پڑی شارق کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ وہ لوگ کئی روز تک ساتھ رہے تھے۔ وہ جس خطرناک مہم پر گئے تھے اس میں قدم قدم پر موت کا سامنا رہا تھا اور ڈی کوشا نے ہر لمحہ ان کا ساتھ دیا تھا۔ اس نے کسی موقع پر بھی بزدلی نہیں دکھائی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ ایک مخلص دوست اور وفادار ساتھی تھا۔ اس قسم کے کاروبار میں ایسے ہی وفاداروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ لوگ دیر تک اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

ان کے کمپارٹمنٹ کا چوتھا مسافر ایک ادھیڑ عمر مگر صحت مند قسم کا آدمی تھا۔ وہ لاہور کا ایک کاروباری آدمی تھا اور کاروبار کے سلسلے ہی میں چند روز پہلے کراچی آیا تھا اور آج وہ واپس جا رہا تھا۔ اس کا نام عبدالکریم تھا اور وہ اچھرے کا رہنے والا تھا۔ وہ جلد ہی ان لوگوں سے بے تکلف ہو گیا۔

تقریباً آٹھ بجے کے لگ بھگ ڈائنگ کار کے بیروں نے چکر لگانا شروع کر دیئے۔ عبدالکریم نے ایک ویٹر کو اندر بلا لیا اور اس نے سب کے لئے کھانے کا آرڈر دے دیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ویٹر کھانا لے آیا۔ ان سب نے اکٹھے ہی بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران ٹینے اس کے سامنے بیٹھی تھی اور عبدالکریم بار بار اسکی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ غالباً کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔ بالآخر اس کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔

”میں نے غالباً آپ کو کیس دیکھا ہے۔“ اس نے پھر ٹینے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”لاہور میں کیس دیکھا ہو گا۔“ شارق نے کہا۔ ”یہ میری بیوی ہے۔ ہم علامہ اقبال ٹاؤن میں رہتے ہیں۔ اچھرے ہی کی طرف سے آتا جاتا رہتا ہے۔ ممکن ہے راستے میں کیس آتے جاتے نظر پڑ گئی ہو۔“

”نہیں۔ میں نے کیس اور دیکھا ہے۔“ عبدالکریم نے بوتل میں سے گلاس میں پانی اٹیلینے ہوئے کہا پھر جیسے چونک کر بولا۔ ”او ہاں.... یاد آگیا۔ میں نے آپ کو چورجی کوارٹرز میں دیکھا ہے۔ میرا چھوٹا بھائی ایک سرکاری محکمہ میں آفیسر ہے۔ اس کی رہائش چورجی کوارٹرز میں ہے۔ میں کبھی کبھار اس کے ہاں جاتا رہتا ہوں۔ شاید آپ شفاعت علی کی بیٹی ہیں۔ وہ میرے چھوٹے بھائی کے پردوسی ہیں۔ آخری مرتبہ میں نے آپ کو تقریباً چھ ماہ پہلے دیکھا تھا۔“

نوالہ ٹینے کے حلق میں اٹک گیا۔ اسے سینے میں اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا اس نے

”اوہ رحمن تم! شارق اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ ”یہاں کیسے گھوم رہے ہو؟“
 ”تم لوگوں کو لینے کے لئے آیا تھا۔ اگر دو چار منٹ اور لیٹ ہو جاتا تو تم لوگ نکل چکے
 ہوتے۔“ رحمن نے کہا۔
 ”ہمیں لینے کے لئے؟“ شارق کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ ہم آ رہے
 ہیں۔“

”ابھی تو صرف چوبیس گھنٹے ہوئے ہیں اور شاید تم ڈی کوسا کو بھول گئے ہو؟“ رحمن نے
 مسکراتے ہوئے کہا۔

”اوہ! شارق کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ ڈی کوسا کو نہیں بھولا تھا لیکن یہ بات شاید
 اس کے ذہن میں نہیں رہی تھی کہ وہ حاجی عبداللہ کا آدمی تھا اور اس نے حاجی عبداللہ کو ان کی
 رواجی کی اطلاع کر دی ہوگی۔

”میری گاڑی وہاں کھڑی ہے۔“ رحمن نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”حاجی صاحب
 نے کہا ہے کہ تم لوگوں کو ان کے مہمان کی حیثیت سے سمن آباد والے بنگلے میں لے جایا
 جائے۔“

”میرا خیال تھا کہ میں حاجی سے کل ملوں گا۔ لیکن بہر حال....“ شارق خاموش ہو گیا اور
 ٹیکسی ڈرائیور کی طرف دیکھنے لگا جو ان کا سوٹ کیس ٹیکسی کی ڈیگی میں رکھ رہا تھا۔
 ٹیمینہ اور نولکھا چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ رحمن نے ٹیکسی
 ڈرائیور کو آواز دے کر سوٹ کیس اتروا لیا اور جیب سے دس کا ایک نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ
 میں تھما دیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”شکریہ دوست۔ تم کوئی اور سواری تلاش کر لو۔“
 ٹیکسی ڈرائیور نے برا سامنہ بناتے ہوئے نوٹ جھپٹ لیا اور کسی اور سواری کی تلاش میں
 شیش کے برآمدے کی طرف دوڑ گیا۔

”تم لوگ رکو.... میں گاڑی بیسیں لے آتا ہوں۔“ رحمن کہتے ہوئے ایک طرف چلا گیا۔
 ”یہ کون ہے شارق باؤ؟“ نولکھا نے قریب آ کر پوچھا۔

”حاجی عبداللہ کا خاص آدمی۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ڈی کوسا نے ہمارے
 آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ یہ ہمیں لینے کے لئے آیا ہے۔ ہم حاجی عبداللہ کے مہمان کی
 حیثیت سے اس کے بنگلے پر جا رہے ہیں۔“

”چلو، کوئی بات نہیں۔“ نولکھا نے کہا۔ ”ہمارا کون سا کوئی گھر ہے اور کون سے بیوی بچے

”وقت گزاری کے لئے لوڈو کھیلا جائے؟“ عبدالکریم نے ویٹر کے جانے کے بعد کہا۔
 ”لوڈو... آپ نے تو مجھے میرا بچپن یاد دلا دیا۔ امی ابو کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔“ شارق نے کہا
 اور دفعتاً اس کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ اسے واقعی اپنا بچپن یاد آ گیا تھا۔ جب وہ رات کو
 اپنی ماں اور باپ کے ساتھ لوڈو کھیلا کرتا تھا۔

”تو پھر آج وہ یاد تازہ ہو جائے۔“ عبدالکریم نے کہتے ہوئے گتے کے ایک ڈبے میں سے
 لوڈو اور اس کی گولٹیں نکال لیں۔ یہ لوڈو اس نے اپنے بچے کے لئے خریدا تھا۔
 شارق، ٹیمینہ کو بھی اس کی سیٹ سے اٹھا کر لے آیا۔ سیٹ پر چاروں نہیں بیٹھ سکتے تھے۔
 عبدالکریم نے اپنے سلمان میں سے ایک چادر نکال کر فرش پر بچھالی اور وہ چاروں بیٹھ کر لوڈو کھیلنے
 لگے۔

وہ رات کو دیر تک لوڈو کھیلے رہے۔ ٹیمینہ، عبدالکریم کے منہ سے اپنے باپ کا نام سن کر
 خوفزدہ ہو گئی تھی لیکن کھیل میں مشغول ہو کر اس کے ذہن پر طاری یہ خوف بھی زائل ہو گیا۔
 دن کا زیادہ وقت ٹیمینہ کھڑکی کے قریب بیٹھی باہر دیکھتی رہی۔ ٹرین لیٹ ہو گئی تھی اس طرح
 وہ سبہ پہر چار بجے کے لگ بھگ لاہور پہنچے تھے۔ ان کے پاس سلمان کے نام پر وہی ایک سوٹ
 کیس تھا جس میں کراچی سے خریدا جانے والا کچھ سلمان بھر دیا گیا تھا۔ شارق نے گما اور راجہ کے
 لئے بھی چند جوڑے کپڑے اور کچھ دیگر تحائف خرید لئے تھے۔ اس کے علاوہ رضیہ اور ماں جی
 کے لئے بھی کچھ تحائف خریدے گئے تھے۔ اس طرح یہ سوٹ کیس خاصا وزن ہو گیا تھا۔ نولکھا
 نے وہ سوٹ کیس ایک قلی کے حوالے کر دیا اور وہ تینوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے قلی کے پیچھے
 چلے گئے۔

پلیٹ فارم سے باہر وسیع و عریض برآمدے میں آتے ہی کئی ٹیکسی ڈرائیوروں نے انہیں گھیر
 لیا۔ شارق کا خیال یہ تھا کہ پہلے وہ ملتان روڈ والی حویلی ہی جائیں گے۔ گما اور راجہ وہیں ہوں گے
 کل وہ ٹیمینہ کو باغیچہ رضیہ کے پاس چھوڑ دے گا اور خود حاجی عبداللہ سے ملنے چلا جائے گا۔
 ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اس کا سوٹ کیس بھی قبضے میں کر لیا تھا۔ اب وہ اس ٹیکسی ڈرائیور
 کے پیچھے چل رہے تھے۔ ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ کسی نے شارق کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
 اس کے ساتھ ہی ایک آواز شارق کی سماعت سے ٹکرائی۔

”شارق باؤ!“

شارق نے تیزی سے گھوم کر دیکھا اور پھر اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ
 حاجی عبداللہ کا آدمی رحمن تھا۔ وہی نوجوان جو سب سے پہلے شارق کو حاجی کے پاس لے گیا تھا۔

ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ رہنا ہی ہے نا۔۔۔۔۔ کیس بھی رہ لیں گے۔“

تھوڑی ہی دیر بعد رخصت گاڑی لے کر آگیا۔ وہ انجن چلتا چھوڑ کر گاڑی سے اتر آیا ڈکی کھول کر سوٹ کیس اندر رکھا اور دوبارہ اسٹیزنگ کے سامنے آگیا۔ ٹینے اور نوکھا پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے جبکہ شارق اگلی سیٹ پر آگیا تھا۔

”حاجی تم سے بہت خوش ہے۔“ رخصت نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”جہاز کے کپتان نے جو رپورٹ دی تھی اس سے بھی حاجی بہت خوش ہوا تھا۔ دوسرے ایجنٹوں کے ذریعے جو مال بھیجا جاتا تھا ان میں کچھ نہ کچھ ضائع ضرور ہو جاتا تھا لیکن تم نے جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ دوسروں سے بہت ہی مختلف تھا۔“

”مال اپنی منزل پر پہنچ گیا؟“ شارق نے پوچھا۔

”نہیں، جہاز ابھی راستے ہی میں ہے۔ دو چار دن تک پہنچ جائے گا۔“ رخصت نے جواب دیا۔ گاڑی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی چوہدری والی سڑک پر پہنچی تو ٹینے نے بے چینی سے سیٹ پر پہلو بدلا۔ گاڑی جیسے ہی چوہدری کوارٹرز کے گیٹ کے سامنے پہنچی ٹینے ایک دم نیچے جھک گئی۔ گیٹ کے اندر والی سڑک سے اس کا بھائی موٹر سائیکل پر آ رہا تھا اور موٹر سائیکل کو گیٹ سے باہر لانے سے پہلے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ کافی آگے نکل جانے کے بعد ٹینے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

گاڑی سمن آباد موڑ سے بائیں طرف گھوم گئی اور پھر مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی ایک بنگلے کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔ گیٹ بند تھا۔ ہارن کی آواز سن کر اندر کی طرف کھڑے ہوئے ایک آدمی نے اوپر سے باہر جھانکا اور پھر گیٹ کھول دیا۔ گاڑی گیٹ میں داخل ہو کر پورچ میں رک گئی۔ برآمدے میں بھی ایک آدمی کھڑا تھا۔ رخصت انجن بند کر کے نیچے اتر آیا اور ڈکی کھول دی۔

”خادم! یہ سوٹ کیس اٹھا کر کونے والے بیڈ روم میں رکھ دو۔“ رخصت نے برآمدے میں کھڑے ہوئے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ خادم تھا۔ اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ڈکی میں سے سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے چادر کا ایک کونا ڈھلک گیا اور اس کے کندھے پر لگی ہوئی کلاشکوف نظر آنے لگی۔ وہ سوٹ کیس اٹھا کر اندر چلا گیا۔

شارق وغیرہ بھی گاڑی سے اتر آئے تھے۔ وہ رخصت کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

”تم لوگ نما کر کپڑے بدل لو۔۔۔ پھر چائے پر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔“ رخصت نے کہا۔

”ہمارا سوٹ کیس کہاں رکھا ہے؟“ ٹینے نے پوچھا۔

”راہداری میں دائیں طرف آخری کمرے میں۔“ رخصت نے جواب دیا۔ ٹینے ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

تقریباً آٹھ گھنٹے بعد وہ سب ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد خادم نے ان کے سامنے چائے لگا دی۔ چائے کے ساتھ کھانے پینے کے لوازمات بھی تھے۔

”یہ ملا بشریچ گوری کا کیا قصہ تھا؟“ رخصت نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

”لالچ نذر آتش ہو جانے کے بعد جہاز کے کینڈین کپتان نے ہمیں مسقط کے ساحل پر اتار دیا تھا اور ہم اتفاق سے ساحل پر اترنے کے بعد ملا بشریچ گوری کے ڈیرے پر پہنچ گئے تھے۔ یہ تصدیق ہو جانے کے بعد کہ ہم حاجی عبداللہ کے آدمی ہیں اس نے ہماری غامی مدد کی اور ہماری بڑی دیکھ بھال کی۔ لیکن واپس آنے سے دو دن پہلے ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا تھا۔“ شارق نے بتایا۔

”کچھ لوگ ٹینے کو اٹھا کر لے گئے تھے؟“ رخصت نے کہتے ہوئے ٹینے کی طرف دیکھا۔

”اوہ!“ شارق چونک گیا۔ ”تو اس واقعہ کی اطلاع بھی پہنچ گئی۔“

”ہاں۔“ رخصت نے سر ہلایا۔ ”ملا بشریچ گوری نے فون پر بتایا تھا۔ اگرچہ مخالف پارٹی کے تین چار آدمی اڑا دیئے گئے تھے لیکن اس نے اس واقعہ پر بڑی ندامت کا اظہار کیا تھا۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ اس کا اندازہ تم خود بھی لگا سکتے ہو۔“

”ہاں، وہ واقعی بہت اچھا آدمی ہے۔“ شارق نے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ تم لوگ آرام کرو۔ اب میں چلتا ہوں۔“ رخصت کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو دو آدمی یہاں موجود ہیں۔ ان میں سے کسی سے کہہ دینا۔ رات کے کھانے پر حاجی سے ملاقات ہو گی۔ ویسے وہ تمہارے کام سے بہت خوش ہے۔ اسے عرصہ سے تم جیسے آدمی کی تلاش تھی۔“

کچھ دیر بعد رخصت، شارق اور نوکھا سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔ وہ تینوں کچھ دیر ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر گھوم پھر کر کوٹھی دیکھنے لگے۔ شارق ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں آیا تھا لیکن اس روز وہ ڈرائنگ روم تک محدود رہا تھا۔ اور اب وہ ٹینے کے ساتھ آزادی سے کوٹھی میں گھوم رہا تھا۔ بہت بڑی کوٹھی تھی۔ نیچے اوپر کئی بیڈ رومز تھے۔ ضرورت کی ہر چیز یہاں موجود تھی۔

کونے والے بیڈ روم میں آ کر ٹینے نے نوٹ کیا کہ ان لوگوں نے جو میلے کپڑے اتارے تھے وہ غائب تھے۔ شارق نے خادم سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ کپڑے اٹھا کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ صبح لائڈری بھیج دیئے جائیں گے۔

”ڈی کوٹا اچھا آدمی ہے۔“ شارق نے کہا۔

کھانے کے دوران باتیں ہوتی رہیں۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ حاجی چائے کی چسکیاں نہ ہوئے کہہ رہا تھا۔

”آج رات تم لوگ ہمیں آرام کرو۔ کل صبح ناشتے کی بعد تم لوگ میری اقبال ٹاؤن والی ٹرک منتقل ہو جاؤ گے۔ تم لوگوں کا ادھر ادھر گھومنا اور ڈیروں پر رہنا اب مناسب نہیں ہے۔ وہ ٹرک عرصہ سے خالی پڑی تھی۔ میں نے کل ہی نوکروں سے کہہ دیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک کر دیا ہو۔ کل تم لوگ وہاں شفٹ ہو جانا۔“

”اور میرے آدمیوں کا کیا حال ہے؟“ شارق نے پوچھا۔

”گھلا اور راجہ بالکل ٹھیک ہیں۔ کل تم کسی وقت ان سے مل بھی لیتا۔“ حاجی نے کہا اور بے جا جانے کے لئے رخصت ہوا تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

حاجی کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد یہ لوگ بھی سو گئے۔

صبح دس بجے کے لگ بھگ رحمن پہنچ گیا۔ انہیں تیار ہونے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لے تھے۔ یہ لوگ رحمن کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر اقبال ٹاؤن کی طرف روانہ ہو گئے۔ سمن آباد دڑ سے گھوم کر وہ سیدھی سڑک پر چلتے رہے اور تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد رحمن نے گاڑی بائیں طرف ایک گلی میں موڑ لی اور پھر دو تین گلیوں میں گھومنے کے بعد ایک بصورت ڈبل اسٹوری کوٹھی کے سامنے گاڑی روک لی۔ اقبال ٹاؤن کا یہ بلاک مکمل طور پر دیلب نہیں ہوا تھا۔ سڑکیں اور گلیاں کچی تھیں لیکن بیشتر مکان تعمیر ہو چکے تھے، کچھ تعمیر کے ریلے میں تھے۔

رحمن نے بتایا کہ حاجی عبداللہ کی یہ دو منزلہ کوٹھی تقریباً چھ ماہ پہلے مکمل ہوئی تھی اور اس نئے سے خالی پڑی تھی۔ گیٹ کے بالکل سامنے بھی ایک گلی تھی جس کے بائیں طرف کارنر لے دو پلاٹ خالی تھے۔

کوٹھی بہت شاندار تھی۔ اس کے آگے پیچھے بڑے خوبصورت لان تھے۔ کوٹھی کی دیکھ بھال لے لئے ایک ملازم مستقل طور پر یہاں رہائش پذیر تھا۔ کوٹھی کی عقبی دیوار بہت اونچی تھی۔ اس دیوار کے دوسری طرف تقریباً سات آٹھ فٹ زمین تھی اور پھر کئی فٹ گرا نیشب تھا۔۔۔ دور تک رانہ اور نشیبی علاقہ تھا۔ یہ دراصل دریا کے کنارے کا علاقہ تھا جو دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ دریا پر بند بننے سے پہلے یہ علاقہ بھی پانی میں ڈوب جایا کرتا تھا لیکن بند تعمیر ہو جانے کے بعد یہ علاقہ رانہ ہو گیا تھا اور اب آہستہ آہستہ یہاں جدید بستیاں قائم ہو رہی تھیں۔

ٹینس بیڈ روم میں بستر پر لیٹ ٹہنی تھی۔ چوبیس گھنٹوں کے اس سفر نے اسے بری طرح تھکا دیا تھا۔ لیٹنے کے کچھ ہی دیر بعد اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ شارق ڈرائنگ روم میں آگیا۔ نوکھا بھی ایک صوفے پر نیم دراز اونگھ رہا تھا۔ شارق بھی ایک صوفے پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔

رات نو بجے کے قریب حاجی عبداللہ آیا تو کوٹھی میں چل پھل سی محسوس ہونے لگی۔ وہ بڑی گرجوٹی سے شارق سے ملا تھا اور نوکھا سے بھی بڑی گرجوٹی سے ہاتھ ملایا تھا۔

”یہ نوکھا اور ٹینس ہیں۔“ حاجی عبداللہ نے پہلے نوکھا اور پھر ٹینس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں۔۔۔ ان کے بغیر میں اپنے آپ کو بالکل تنہا سمجھتا ہوں۔“ شارق نے جواب دیا۔

”مخلص اور وفادار دوست آج کل مشکل ہی سے ملتے ہیں۔“ حاجی عبداللہ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”جہاز کے کپتان اور ڈی کوٹا نے تم لوگوں کے بارے میں جو رپورٹ دی ہے وہ میرے لئے واقعی بڑی حیرت انگیز ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہارا انتخاب کر کے کوئی غلطی نہیں کی ہے اور جانتے ہو مقصد سے نکلنے کے بعد ملا بشیر بیچ گوری نے خاص طور پر مجھے فون کیا تھا اور تمہارے بارے میں کیا کہا تھا؟“

”میں کیسے جان سکتا ہوں؟“ شارق مسکراتے ہوئے بولا۔

”اس نے کہا تھا یہ بندہ مجھے دے دو۔ اور اس کے بدلے جو چاہو لے لو۔“ حاجی نے کہتے ہوئے شارق کی طرف اشارہ کیا۔

”تو پھر آپ کا کیا خیال ہے؟“ شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ملا بشیر بیچ گوری بہت اچھا آدمی ہے۔“ حاجی بولا۔ ”لیکن جو چیز مشکل سے ملے اسے آسانی سے نہیں کھویا جاسکتا۔“

اسی دوران خادم نے آکر بتایا کہ کھانا تیار ہو چکا ہے۔ وہ لوگ اٹھ کر ڈائنگ روم میں آ گئے۔ میز پر کھانا سجا ہوا تھا۔ اس وقت کوٹھی میں اگرچہ حاجی عبداللہ کا باڈی گارڈ دستہ بھی موجود تھا لیکن کھانے کی میز پر صرف یہی چاروں تھے۔ خادم نے کھانا واقعی بہت لذیذ بنایا تھا۔ حاجی اپنے ہاتھ سے پلیٹیں اٹھا اٹھا کر ان کے سامنے رکھ رہا تھا۔

”اس مہم کے دوران تمہیں جو مشکلات پیش آئیں مجھے اس کا اندازہ ہے۔“ حاجی عبداللہ کہہ رہا تھا۔ ٹیو کی غدار، قاسم کی دھوکہ دہی کی کوشش اور ان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ سب میرے علم میں آچکا ہے۔ ڈی کوٹا کراچی میں میرا بہت پرانا اور وفادار آدمی ہے۔ اس نے تمہاری ایک ایک لمحہ کی نگرانی کی ہے وہ تم سے بہت خوش ہے۔“

نوکھا باہر نکل گیا اور یہ دونوں ٹینے والے کمرے میں آ گئے۔
کچھ ہی دیر بعد نوکھا بھی بریف کیس لے کر اوپر آ گیا۔ ٹینے پلنگ پر پیر لٹکائے بیٹھی ہوئی تھی اور شارق کرسی پر براجمان تھا۔ نوکھا نے بریف کیس ٹینے کے قریب پلنگ پر رکھ دیا اور چابیوں کا گچھا بھی اس کے قریب پھینک دیا اور دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

”بریف کیس کھولو۔۔۔ دیکھیں اس میں کیا ہے۔“ شارق نے ٹینے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
ٹینے پلنگ پر آتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس نے چابیوں کا گچھا اٹھایا، بریف کیس والی چابی انگلیوں میں دبائی اور بریف کیس کا رخ اپنی طرف گھما کر اس کے دونوں لاک کھول دیئے اور پھر پیسے ہی ڈھلکا اٹھایا اچھل پڑی۔

”کیا ہوا؟“ کیا ہے اس میں....؟“ شارق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
ٹینے کے چہرے پر عجب سے تاثرات تھے۔ اس نے کچھ کہنے کے بجائے بریف کیس کا رخ شارق کی طرف گھما دیا۔ بریف کیس میں جو کچھ بھی تھا اسے دیکھ کر شارق کو کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی لیکن نوکھا اچھل پڑا تھا۔

بریف کیس میں ہزار ہزار روپے والے نوٹوں کے بنڈل بھرے ہوئے تھے اور یہ رقم دس لاکھ سے کم کسی طرح نہیں ہوگی۔

”کیا یہ حیرت کی بات نہیں؟“ نوکھا بولا۔ ”دو کنال پر یہ شاندار کوٹھی، نئی ٹیوٹا کار اور یہ نئی بڑی رقم.... اتنی مہربانی....؟“
”تمہیں اندازہ ہے ہم جو مال بحری جہاز پر پہنچا کر آئے تھے اس کی مالیت کیا ہوگی؟“ شارق نے سوالیہ نگاہوں سے نوکھا کی طرف دیکھا۔

”نہیں.... میں ٹھیک سے اندازہ نہیں لگا سکتا۔“ نوکھا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”بین الاقوامی منڈی میں ایک کلو ہیرون کی قیمت ایک کروڑ ڈالر بنتی ہے اور وہ ہیرون پانچ کلو گرام تھی۔ اس طرح تم قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہو۔“ شارق بولا۔

”پانچ سو کروڑ....!!!!“ نوکھا کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”روپے نہیں ڈالر.... اور ایک ڈالر تیس بتیس روپے کا ہوتا ہے۔ اس طرح اربوں روپے

ہیں۔ حاجی عبداللہ بلاوجہ ہی تو ہم پر اتنا مہربان نہیں ہو رہا۔ اگر چالیس پچاس لاکھ روپے وہ ہم فرج کر رہا ہے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ چالیس پچاس بھی نہیں، بلکہ اس نے ہمیں نقد تو یہ رقم دی ہے جو میرے خیال میں دس لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔ مکان اور کار تو ابھی اسی ملکیت ہے اور دس لاکھ کی یہ رقم نہ ہونے کے برابر ہے۔ انہی رقم تو تم جانتے ہو کہ ہم یہاں

یہ کوٹھی دن یونٹ قسم کی تھی۔ اس کا زینہ اندرونی ہال میں تھا۔ اوپر بھی تین بیڈ رومز تھے اور نیچے بھی تین بیڈ روم، ایک ہال کمرہ اور ڈائننگ روم کے علاوہ ڈرائنگ روم بھی تھا۔
”بھئی یہ کمرہ تو میں لے لیتا ہوں۔“ نوکھا نے زینے کے سامنے والا بیڈ روم اپنے لئے منتخب کر لیا۔ اس میں بیڈ بھی لگا ہوا تھا اور بستر بھی بچھا ہوا تھا۔

ٹینے اور شارق نے اوپر دو بیڈ رومز پسند کئے تھے۔ اس کوٹھی میں کھانا وغیرہ پکانے کے لئے ایک اوپن عمر عورت اور ایک چوکیدار اور اوپر کے کاموں کے لئے ایک آدمی موجود تھا۔ عورت کا نام مرادو تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس عمر میں بھی وہ خاصی پرکشش نظر آ رہی تھی۔ جوانی میں تو وہ خاصی حسین رہی ہوگی جبکہ آدمی کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ دسے پتلے جسم اور لمبے قد کا مالک تھا۔ سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ اس کا ہم رنگو تھا۔ ان لوگوں کو غالباً کل رات ہی یا صبح سویرے شارق وغیرہ کے بارے میں اطلاع کر دی گئی تھی۔ مرادو دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔

رحمن انہیں پوری کوٹھی گھماتے کے بعد ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ کوٹھی کے ہر کمرے میں قالین بچھے ہوئے تھے اور قیمتی فرنیچر سے آراستہ تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہاں ٹیلی فون بھی موجود تھا۔ رحمن ڈرائنگ روم کی طرف آتے ہوئے مرادو سے چائے کا کہہ آیا تھا۔ ان کے بیٹھنے کے تھوڑی ہی دیر بعد مرادو چائے لے کر آگئی۔

”تم خوش قسمت ہو شارق۔“ رحمن نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”تم پہلے ٹھہر ہو جو اتنی جلدی حاجی عبداللہ کے اتنا قریب آ گئے ہو۔ اگر چند مہینوں تک تمہاری کارکردگی اوروں کی رہی تو یہ کوٹھی تمہاری ملکیت بن سکتی ہے۔“

”اچھی خوبصورت کوٹھی ہے۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو اب میں چلتا ہوں۔“ رحمن اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پتلون کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ گاڑی کی چابیاں ہیں۔ گاڑی اب تمہارے ہی پاس رہے گی۔“ شارق کے ذہن کو ایک اور ہلکا سا جھٹکا لگا۔ وہ نئے ماڈل کی سفید ٹیوٹا کارولا تھی۔ اس نے نوکھا اور ٹینے کی طرف دیکھا۔

”گاڑی کی ڈیگی میں ایک بریف کیس رکھا ہوا ہے۔ وہ نکال لیتا۔ بریف کیس کی چابی اسی چھتے میں موجود ہے۔“ اس نے چابیوں کے گچھے کی طرف اشارہ کیا۔

رحمن کے جانے کے بعد شارق نے چابیوں کا گچھا نوکھا کی طرف بڑھا دیا۔

”گاڑی میں سے بریف کیس نکال کر اوپر لے آؤ۔“

رہ کر بھی دو چار دن میں کما ہی لیتے ہیں۔“ شارق نے کہا۔

”تو پھر لعنت بھیجو اس حاجی پر۔“ نوکھانے کہا۔ ”اتنے دن تک مصیبتیں اٹھائیں قدم قدم پر پنجہ آزمائی کرتے رہے اور دیا کیا صرف دس لاکھ.... میں تو کہتا ہوں کہ یہ رقم بھی اس کے منہ پر مارو اور اپنے ڈیرے پر چلو۔“

”لیکن میرے خیال میں ہمارے لئے بھی یہ سودا منگنا نہیں ہے۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہ کیسے؟“ اس مرتبہ ثمنہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تجربہ.... بین الاقوامی تعلقات۔ جو کل ہمارے کام آسکتے ہیں۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”تو پھر ٹھیک ہے شارق باؤ.... چند روز حاجی عبداللہ کی روٹیوں پر ہی عیش کرتے ہیں۔“

نوکھانے گمراہ سانس لیتے ہوئے کہا۔

”یہی کرنا پڑے گا۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”ہمیں چند روز اور حاجی کے ساتھ رہنا پڑے گا۔ اس کے بعد ہم اس سے علیحدگی اختیار کر لیں گے۔“

”ٹھیک ہے.... جیسی تمہاری مرضی۔ ویسے مجھے تو اپنا ڈیرہ ہی اچھا لگتا ہے شارق باؤ۔“ نوکھانے نے کہا۔

”ابھی چلتے ہیں ڈیرے پر۔ لو.... پہلے یہ سنبھال لو۔“ شارق نے کہتے ہوئے بریف کیس بند کر کے نوکھانے کی طرف سر کا دیا اور مجھے میں سے چابی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔

”میں کہاں سنبھالوں گا.... اسے اپنے پاس ہی رکھو۔“ نوکھانے کہا۔

”نہیں.... یہ بریف کیس تمہارا ہے۔ میرا یا ثمنہ کا اس پر کوئی دعویٰ نہیں ہے۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو شارق باؤ!“ نوکھانے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ثمنہ نے کہا۔

”اسے اپنے کمرے کی الماری میں رکھ کر الماری کی چابی جیب میں ڈالو اور تیار ہو جاؤ....“

ڈیرہ کا چکر لگا کر آئیں گے۔“

نوکھانے چند لمحے حیرت سے ان دونوں کی طرف دیکھتا رہا پھر نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔

سورج سر پر چمک رہا تھا۔ گرمی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا لیکن ایئر کنڈیشنڈ کار میں گرمی کا احساس بالکل نہیں ہو رہا تھا۔

شارق اسٹیرنگ سنبھالے ہوئے تھا، نوکھانے کے ساتھ پنجر سیٹ پر تھا اور ثمنہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا رکھی تھی اور قدرے نیم دراز پوزیشن میں تھی۔

ملتان روڈ پر یتیم خانے کے چوک سے ذرا آگے ٹریفک جام تھا۔ گاڑیوں کے ہارنوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بعض گاڑیاں بنگلی راستوں سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھیں جس سے اطراف کے راستے بھی بند ہو چکے تھے۔ شارق نے گاڑی روک لی تھی۔

”کیا ہوا بھائی یہاں؟ ٹریفک کیوں جام ہو رہا ہے؟“ نوکھانے اپنی طرف کا شیشہ اتار کر ایک رہڑے والے سے پوچھا۔

”ایکسی ڈنٹ ہو گیا ہے جی!“ رہڑے والے نے بتایا۔ ”سایہ وال سے آنے والی بس نے ادھر سے جانے والی ایک کار کو کچل دیا ہے۔ سنا ہے چھ سات بندے مرے ہیں۔“

نوکھانے شیشہ بند کر دیا اور ادھر ادھر کھڑی ہوئی گاڑیوں کو دیکھنے لگا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ٹریفک میں حرکت پیدا ہوئی۔ گاڑیاں چیونٹی کی رفتار سے ریگنے لگیں۔

اگر کوئی سلیقہ اور طور طریقہ استعمال کیا جاتا تو ٹریفک بہت جلد کلیئر ہو سکتا تھا لیکن ہر شخص پہلے نکلنے کی کوشش میں تھا، بہر حال خدا خدا کر کے انہیں آگے نکلنے کا راستہ ملا۔

وہ نیلے رنگ کی ایک سنی نسان کار تھی جو ایک بس کے سامنے بری طرح پکلی ہوئی پڑی تھی۔ کار کا اگلا حصہ پچکا ہوا تھا جو بس کے نیچے پھنسا ہوا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ بس سامنے سے آنے والی اس کار کو ٹکرا کر بہت دور تک گھسیٹی ہوئی لے آئی تھی۔ سڑک پر دور تک خون پھیلا ہوا تھا۔

بھوم سے کافی آگے نکل آنے کے بعد شارق نے سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے کار روک لی۔ وہاں بھی پانچ چھ آدمی کھڑے تھے۔ شارق نے اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ اتار لیا

اوپر ایک آدمی کو اشارے سے بلا کر پوچھا۔
”یہ ایکسی ڈنٹ کیسے ہوا تھا؟“

”غلطی نہ کار والے کی تھی اور نہ بس ڈرائیور کی۔“ اس شخص نے جواب دیا۔
”تو پھر فکر کیسے ہوئی بھائی میرے؟“ نوکھا بولا۔

”یہ کار والے شاید پکنک کے لئے چھانگا مانگا جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ دو موٹر سائیکل سوار بھی تھے۔ جو اپنی موٹر سائیکلوں کو سڑک پر لہرا رہے تھے۔ کبھی وہ کار کے ساتھ آ جاتے کبھی پیچھے رہ جاتے اور کبھی موٹر سائیکل لہراتے ہوئے آگے نکل جاتے۔ کار کی رفتار بھی خاصی تیز تھی اور سامنے سے بھی تیز رفتار بس آرہی تھی۔ ایک موٹر سائیکل سوار لہراتا ہوا بس کے سامنے آ گیا۔ بس کے ڈرائیور نے موٹر سائیکل کو بچانے کی کوشش کی تو کار اس کے سامنے آ گئی۔ ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور بس اس کار کو پھیل کر گھسیٹی ہوئی دور تک لے گئی۔“

”اور وہ موٹر سائیکل سوار؟“ شارق نے پوچھا۔

”حادثہ ہونے کے بعد وہ ایک لمحہ کو رکے تھے۔ پھر وہ اپنی موٹر سائیکلوں کو شہر کی طرف دوڑا کر لے گئے۔“ اس شخص نے بتایا۔
”تو گویا اس کا یہ مطلب ہوا کہ یہ حادثہ ان موٹر سائیکل سواروں کی وجہ سے ہی پیش آیا ہے۔“ شارق بولا۔

”میں تو یہی کہوں گا جی۔“ اس شخص نے کہا۔ ”وہ دونوں نوجوان بھی کار والوں کے ساتھ ہی تھے۔ میں انہیں راستے بھر اسی طرح بدتمیزیاں کرتے ہوئے دیکھتا آیا ہوں۔“
”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ لڑکے ان کے ساتھ تھے؟“ شارق نے پوچھا۔

”میں بھی اپنی موٹر سائیکل پر آ رہا تھا جی۔“ اس شخص نے درخت کے نیچے کھڑی ہوئی ایک موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں ٹھوکر نیاز بیگ میں رہتا ہوں۔ ایک ضروری کام سے صبح سویرے شہر گیا تھا اور اب واپس آتے ہوئے سمن آباد موڑ سے ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک موٹر سائیکل والا کبھی کار کے ساتھ آ کر کار کی کھڑکی پر ہاتھ رکھ دیتا تھا اور کار میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے باتیں کرنے لگتا تھا۔ یہ تو اتفاق تھا کہ یتیم خانے والے موڑ سے میں ان لوگوں سے ذرا آگے نکل گیا تھا۔ اور پھر میں نے دھماکے کی آواز سنی۔ اللہ معاف کرے جی.... بڑا ہی خوفناک حادثہ تھا۔“

”ہاں بھئی۔ اللہ معاف کرے۔“ شارق نے کہتے ہوئے کھڑکی کا شیشہ چڑھا کر انجن اشارت کر دیا۔

شیمہ اور نوکھا خاموش بیٹھے رہے تھے۔ شارق ہلکی رفتار سے گاڑی چلاتا رہا اور بالاخر اس نے گاڑی دائیں طرف کچے راستے پر موڑ دی اس کے تقریباً پانچ منٹ بعد گاڑی حویلی کے سامنے کھڑی تھی۔ ہارن بجانے پر گیٹ کھلے گاڑی کے سامنے کھولا تھا۔ پہلے تو وہ سفید ٹیوٹا دیکھ کر حیران ہوا اور پھر شارق اور نوکھا کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر رونق سی آ گئی اور اس نے پھانک پوری طرح کھول دیا۔

شارق نے گاڑی اندر لے جا کر درختوں کے نیچے روک دی۔ اور وہ تینوں نیچے اتر آئے۔ شیمہ تو ادھر ادھر ٹپٹنے لگی اور نوکھا قریب ہی بیٹھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔ ”راہو کہاں ہے؟“ شارق نے گامے کی خیر و غایت دریافت کرنے کے بعد ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”راہو دو تین دن سے غائب ہے شارق باؤ۔“ گاما نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر یک دم پریشانی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ ”میں تو خود بھی یہاں قید ہو کر رہ گیا ہوں۔“

”کیا مطلب؟ راہو کہاں غائب ہے؟“ شارق چونک گیا۔
”پتہ نہیں۔ پہلے تو میں سمجھا تھا کہ شاید مانجھے گجر کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ لیکن میں نے مختلف ذرائع سے تصدیق کر لی ہے۔ وہ ماجھا گجریا اس کے کسی آدمی کے ہاتھ نہیں لگا۔“
”تو پھر وہ کہاں غائب ہو سکتا ہے؟“ شارق بولا۔

”یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ گامے نے جواب دیا۔
”اور دھندہ کیسا ہے؟“ شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”دھندہ تو ٹھیک ہے۔“ گامے نے کہا۔ ”میں تو کئی روز سے یہاں سے باہر نہیں گیا۔ پہلے راہو نے کام سنبھال رکھا تھا اور جب سے وہ غائب ہوا ہے مولوی حمید کام سنبھالے ہوئے ہے۔“
”تم یہاں کیوں چھپے بیٹھے ہو؟“ شارق نے پوچھا۔

”مزنگ کا تھانیدار میرے پیچھے لگ گیا ہے۔“ گامے نے بتایا۔ ”پتہ چلا ہے کہ ماجھا گجر نے اسے کچھ چڑھاوا چڑھا دیا تھا۔ وہ ڈیرے میں آتشرنی اور دو آدمیوں کے قتل کے الزام میں مجھے اندر کرنا چاہتا ہے۔“

”کون دو آدمی؟“ شارق نے اسے گھورا۔

”پولیس کے پاس ایسے بہت سے کیس ہوتے ہیں جن کے لئے انہیں مناسب ملازموں کی تلاش ہوتی ہے۔ ایسے ہی کیس ہوں گے جن میں وہ تھانیدار مجھے فٹ کرنا چاہتا ہے۔“ گامے نے بتایا۔

”تم بنے حاجی عبداللہ سے بات نہیں کی تھی؟“ شارق نے کہا۔

”راجو کے غائب ہونے کے بعد میں حاجی عبداللہ کے پاس گیا تھا مگر ملاقات نہیں ہو سکی

تھی۔“ گامے نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ شارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اب میں آگیا ہوں۔ سنبھال لوں گا

سارا معاملہ۔“

”یہ دیکھو..... ہم تمہارے لئے کراچی سے کیا لائے ہیں۔“ نوکھانے کہتے ہوئے ایک شانگ

بیک اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”کراچی کے تحفے ہیں۔ خوش ہو جاؤ گے دیکھ کر اور یہ دوسرا تھیلا

سنبھال کر رکھ لو۔ راجو کے لئے.... وہ آجائے تو اسے دے دیتا۔“

”اور کیا خبریں ہیں؟“ شارق نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”تم لوگوں کے بعد میں کوئی اچھی خبریں جمع نہیں کر سکا۔“ گاما نے کہا۔ ”خاص طور سے

نوکھانے کے لئے میرے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔“

”کھل کر بات کرو۔“ نوکھانے اسے گھورا۔

”تمہارے بہنوئی کا نام ناصر علی ہے نا؟“ گاما نے پوچھا۔

”ہاں.... کیا ہوا اسے؟“ نوکھانے ناصر علی کا نام سن کر چونک گیا۔

”اسے قتل کر دیا گیا ہے۔“ گاما نے کہا۔ ”تم لوگوں کے جانے کے دوسرے دن گلبرگ نہر

سے اس کی لاش ملی تھی۔ پولیس کے کسے کے مطابق اسے کئی روز پہلے تشدد کر کے لاش نہر میں

پھینک دی گئی تھی جو پل کے درمیان والے ستون کے ساتھ انک گئی تھی۔ اس روز نہر میں

نہاتے ہوئے چند لڑکے اس طرف نکل گئے تو لاش کا پتہ چلا۔ لاش بہت بری حالت میں تھی لیکن

پتلون کی جیب سے برآمد ہونے والے شناختی کارڈ سے اسے ناصر علی کی حیثیت سے شناخت کر لیا

گیا۔ شناختی کارڈ پر پتہ بھی چورجی کوارٹرز کا تھا.... یہ سب کچھ اخبار میں چھپا تھا۔ تصویر بھی چھپی

تھی۔ میں نے وہ اخبار سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ ابھی لے کر آتا ہوں۔“

گاما اندر چلا گیا اور نوکھانے گم صم ساکھڑا رہا۔ شارق نے اسے بازو سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھا دیا۔

تھوڑی دیر بعد گاما کمرے سے ایک تہہ کیا ہوا اخبار لے آیا۔ اخبار کئی روز پرانا تھا۔ اس نے اخبار

سیدھا کر کے وہ صفحہ سامنے کر دیا جس پر لاش کے بارے میں خبر اور تصویر چھپی ہوئی تھی۔ یہ

تصویر شناختی کارڈ سے لی گئی تھی اور نوکھانے کو اسے پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ

ناصر علی ہی تھا۔

کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ جو سر جھکائے بیٹھا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”حوصلہ کرو نوکھانے۔“ شارق اس کا کندھا تھپتھاتا ہوا بولا۔

”یہ اس گجر کے سوا کسی اور کا کام نہیں ہو سکتا۔“ نوکھانے ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”حوصلہ کرو نوکھانے۔“ شارق نے پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”یہ کام گجر کا ہو یا کسی

اور کا ہمارے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جاسکے گا۔ ایک دو دن صبر کرو۔ مجھے اس کیس کے بارے

میں معلومات حاصل کر لینے دو۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

”میں بہن کلثوم کو کیا منہ دکھاؤں گا شارق باؤ۔“ نوکھانے روتے ہوئے بولا۔ ”یہ سب کچھ

میری وجہ سے ہوا ہے۔ نہ میں اس رات ٹینے کو لے کر وہاں جاتا اور نہ آج میری بہن کو یہ دن

دیکھنا پڑتا۔“

”قسمت کا لکھا ہو کر رہتا ہے نوکھانے۔ اس میں غلطی میری، تمہاری یا کسی اور کی نہیں۔“

شارق اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”قسمت کا لکھا تو کوئی نہیں ٹال سکتا۔“

”میں ابھی کلثوم کے گھر جانا چاہتا ہوں۔“ نوکھانے کہا۔

”ابھی نہیں۔“ شارق نے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ ٹینے کے باپ نے اس کے اغواء کی

رپورٹ درج کروا رکھی ہے اور پولیس کو تمہاری تلاش ہے اس طرح دن کی روشنی میں دندناتے

ہوئے وہاں جاؤ گے تو دھڑلے جاؤ گے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے دو، چلیں گے۔ میں بھی تمہارے

ساتھ چلوں گا۔“ شارق نے کہا۔

نوکھانے دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

شارق، ٹینے اور گاما اسے تسلی دیتے رہے۔ پھر گاما ٹکے سے پانی کا گلاس بھر کر لے آیا اور نوکھانے کو

زبردستی چند گھونٹ پلا دیئے۔

نوکھانے بڑی مشکل سے اپنی طبیعت پر قابو پاسکا تھا۔ اس وقت دو بج چکے تھے۔ کھانے کا وقت

ہو چکا تھا۔ گاما خود ہی کھانا تیار کیا کرتا تھا لیکن اس وقت کسی کا بھی کھانے کا موڈ نہیں رہا تھا۔

گامے نے چائے بنالی تھی اور کمرے میں سے دو تین کرسیاں بھی نکال لی تھیں۔ وہ درختوں کے

نیچے ہی بیٹھے رہے۔ یہاں تازہ ہوا اچھی لگ رہی تھی۔

ٹینے ان سے قدرے الگ تھلگ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بھی کلثوم اور ناصر علی ہی کے بارے

میں سوچ رہی تھی۔ وہ چند گھنٹے ہی تو ان کے گھر میں رہی تھی۔ لیکن انہی چند گھنٹوں میں ٹینے

نے ان کی فطرت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ دونوں بہت شریف انسان تھے۔ ٹینے کا زیادہ وقت انک

”ایک منٹ۔ میں ذرا ان لوگوں کو فارغ کر لوں پھر تم سے بات کرتا ہوں۔“ تھانیدار کہتے ہوئے وہاں پہلے سے بیٹھے ہوئے دوسرے آدمیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے خواجہ صاحب! اگر آپ لوگ اپنے بچوں کو کنٹرول نہیں کر سکتے تو اس کا خمیازہ تو آپ لوگوں کو بھی بھگتنا ہو گا۔ میرا خیال ہے اب معاملہ عدالت پر ہی چھوڑ دیں۔ بہتر ہو گا کہ آپ ایک دو دن میں کسی اچھے وکیل کا بندوبست کر لیں۔“

”ہم تو چاہتے ہیں کہ بات عدالت تک پہنچنے کی بجائے یہیں پر ختم ہو جائے۔“ خواجہ صاحب نے جواب دیا۔ وہ ایک اویڑ عمر آدمی تھا اور چہرے مہرے سے شریف ہی لگتا تھا۔

”دوسری پارٹی بھی بڑی زور والی ہے خواجہ صاحب!“ تھانیدار نے کہا۔ ”اور پھر اگر کوئی معمولی سا لڑائی جھگڑا ہوتا تو ہم خود ہی لڑکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر معاملہ ختم کر دیتے اور آپ کو بھی یہاں تک آنے کی زحمت نہ کرنی پڑتی۔ لیکن آپ جانتے ہیں معاملہ سنگین ہے۔ گولی دوسرے لڑکے کے پیٹ میں لگی ہے جو ہسپتال میں پڑا ہے۔ اگر وہ ختم ہو جاتا ہے تو کیس مزید سنگین ہو جائے گا۔“

”میں ہسپتال سے ہو کر آیا ہوں انسپکٹر صاحب!“ خواجہ صاحب نے کہا۔ ”ڈاکٹر سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ گولی پیٹ سے نکال لی گئی ہے اور لڑکے کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بلکہ ڈاکٹر نے تو کہا تھا کہ تین چار روز میں اسے ہسپتال سے چھٹی دے دی جائے گی۔ اگر آپ چاہیں تو لڑکے کے باپ بے مل کر معاملہ طے ہو سکتا ہے۔“

”آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ لڑکے کا باپ پہلے ہی ایس پی صاحب تک پہنچ چکا ہے۔“ تھانیدار نے کہا۔ ”اب معاملہ میرے اختیار میں بھی نہیں ہے۔ صبح ہم آپ کے لڑکے کو عدالت میں پیش کر کے رہنمائی لینے کی کوشش کریں گے۔ آپ بھی کسی وکیل سے بات کر لیں۔“

”ٹھیک ہے انسپکٹر صاحب!“ خواجہ صاحب گہرا سانس لیتے ہوئے اٹھ گئے۔ اس کے ساتھ دوسرے دونوں آدمی بھی اٹھ گئے تھے۔ انہوں نے تھانیدار سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گئے۔

”کیا قصہ ہے؟“ شارق نے ان کے جانے کے بعد سوالیہ نگاہوں سے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔

”خواجہ صاحب اسی محلے میں رہتے ہیں۔ آج دوپہر ان کے بیٹے کا کسی دوست سے جھگڑا ہو یا تھا۔ ان کے بیٹے افضل نے جیب سے پستول نکال کر اسے گولی مار دی۔ افضل دسویں کلاس پڑھتا ہے۔ مل باپ اتنے لاپرواہ ہیں کہ بیٹے کی حرکتوں کا علم نہیں۔ اب بھاگے پھر رہے ہیں۔ اتنے روز کہاں غائب رہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”شر سے باہر گیا ہوا تھا۔“ شارق نے کہا۔ ”لیکن تم نے میری عدم موجودگی سے خوب فائدہ

کھٹوم کے ساتھ گزرا تھا اس لئے وہ کھٹوم کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکی تھی۔ ان چند گھنٹوں میں کھٹوم نے ہر لحاظ سے اس کا خیال رکھا تھا۔

شارق بھی اپنی جگہ بیٹھایا سب کچھ سوچ رہا تھا۔ اس رات جب نوکھا ٹینہ کو فیصل آباد سے لے کر آیا تھا وہ ناصر علی کے گھر نہ جاتا تو آج ناصر علی کو بھی اپنی زندگی سے ہاتھ نہ دھونے پڑتے۔ شارق کو یقین تھا کہ ناصر علی، ماجھا گجر ہی کی درندگی کا نشانہ بنا ہو گا۔ وہ انسان نہیں زہریلا ناگ تھا جو اب تک اس کے کئی آدمیوں کو ڈس چکا تھا۔ ماجھا گجر، ٹینہ کے باپ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہ ناصر تک بھی پہنچ گیا ہو گا اسے کسی طرح پتہ چل گیا ہو گا کہ ناصر علی، نوکھا کا رشتہ دار ہے اور وہ نوکھا کے بارے میں ضرور جانتا ہو گا اور ظاہر ہے ناصر، نوکھا کے بارے میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اس طرح ناصر اس کے تشدد کا نشانہ بن کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا، ماجھے گجر نے اس کی لاش نہر میں پھینکوا دی تھی۔ شارق سوچ رہا تھا کہ اگر ان کے جانے سے پہلے ہی ناصر علی کے قتل کا انکشاف ہو جاتا تو وہ ماجھا گجر سے اس کا حساب برابر کر کے ہی جاتا۔ لیکن بہر حال اب اس نے طے کر لیا تھا کہ ماجھا گجر سے ناصر علی کے قتل کا بدلہ ضرور لے گا۔

ٹینہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اندر جا کر چارپائی پر لیٹ گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

شارق، نوکھا اور گاما درختوں کے نیچے ہی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ چھ بجے کے لگ بھگ شارق نے کمرے میں جا کر ٹینہ کو جگا دیا۔ ٹینہ نے باہر آ کر ڈرم میں سے پانی لے کر منہ ہاتھ دھویا لیکن اس کے دماغ میں ابھی تک سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ آج وہ کئی روز بعد دوپہر کے وقت سوئی تھی۔ وہ جب بھی دوپہر کو سو کر اٹھتی تھی اس کے دماغ میں دیر تک اسی طرح سنسناہٹ سی ہوتی رہتی تھی۔

شام کا اندھیرا پھیلنے سے تھوڑی دیر پہلے وہ لوگ حویلی سے نکلے۔ گاما بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ سیدھے مزگ تھانے پہنچے تھے۔ شارق نے کار تھانے سے چند گز پیچھے ہی روک لی تھی۔ وہ ان تینوں کو کار میں چھوڑ کر خود اپنے تانے قدم اٹھتا ہوا تھانے میں داخل ہو گیا۔ تھانیدار موجود تھا دو تین اور آدمی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

”آؤ.... آؤ شارق باؤ.... تم تو عید کا چاند ہی ہو گئے۔“ تھانیدار نے اٹھ کر بڑی گرمجوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”کہاں غائب ہو گئے تھے شارق باؤ۔ کئی روز سے نظر نہیں آئے۔“

”تم جیسے لوگوں کی مہربانی ہے۔ بعض اوقات تو اپنے آپ سے بھی چھپنا پڑتا ہے۔“ شارق کہتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔

باہر اکثر لاہور جاتا رہتا تھا۔ ہمیشہ واپس آنے کے بعد وہ رابعہ کو فلم نگری کے قصے سنایا کرتا۔ اب فلم بینی کی شوقین تھی لیکن باہر کی باتیں سن کر اس کے دل میں فلمی اداکارہ بننے کا ہی ابھرنے لگا۔ باہر اس کے اس جذبے کو ابھارتا رہتا تھا۔ اس نے رابعہ کو باور کروا دیا تھا کہ وہ تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں جو صف اول کی ایک ہیروئن میں ہونی چاہئیں۔ وہ رابعہ کو یہ رہائی کرانے کی کوشش بھی کرتا رہا تھا کہ اگر وہ اس کے ساتھ لاہور چلی چلے تو اس کا ماموں اسے اپنی فلم میں ہیروئن کاسٹ کر لے گا۔ لیکن..... رابعہ ڈرتی تھی۔ اس کا تعلق ایک اور شریف گھرانے سے تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے گھر والے اسے کبھی بھی سڑی کا رخ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ لیکن باہر بھی یہ کب چاہتا تھا کہ وہ ماں باپ بازت لے کر جائے وہ رابعہ کو یہ پٹی پڑھا رہا تھا کہ اگر وہ چپکے سے گھر چھوڑ کر چلی جائے تو کام بن سکتا ہے۔ اس کے ماں باپ کو اس وقت تک اس کا پتہ نہیں چلے گا جب تک اس کا فلم ریلیز نہ ہو جائے گی اور جب اس کے گھر والے یہ دیکھیں گے کہ وہ صف اول کی بن چکی ہے تو ان کی ناراضگی بھی ختم ہو جائے گی۔

رابعہ باہر کی باتوں میں آگئی اور بلاخر ایک روز وہ ماں باپ کی عزت کو پیروں تلے روندتی رہی دہلیز پار کر گئی۔ رابعہ وہ سارا زیور بھی لے آئی تھی جو ماں باپ نے پیسہ پیسہ جوڑ کر، جینز کے لئے تیار کر رکھا تھا۔

لاہور پہنچ کر باہر اسے سمن آباد میں اپنے ایک دوست کے ہاں لے آیا۔ پہلا دن خیریت سے با۔ دوسرے دن دو تین لڑکے اور بھی اس کو خفی میں آ گئے۔ وہ شکل و صورت ہی سے لگ رہے تھے۔ باہر نے بتایا کہ یہ سب فلمی اداکار ہیں۔ اور پھر اسی رات وہ تمام فلمی اداکار مال غنیمت سمجھ کر اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔

رابعہ چڑیا کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ باہر کی محبت کا پول کھل گیا تھا۔ باہر اور اس کے ساتھی تاک تاک رابعہ کو کھلونا سمجھ کر اس سے کھیلتے رہے۔ وہ چوتھی رات تھی جب باہر اور اس کا اٹھی رابعہ کو لے کر بڑی افزائش میں سمن آباد والی اس کو خفی سے فرار ہوا تھا۔ رابعہ کو پتہ چلا تھا کہ پولیس اس کو خفی پر چھاپ مارنے والی تھی اور ان لوگوں کو کسی طرح پتہ چل رہا ہے کہ یہ لوگ رابعہ کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلے تھے۔

سمن آباد سے فرار ہو کر وہ لوگ مغلیہ کے ایک مکان میں آ گئے۔ دو دن بعد وہاں سے بارغ منتقل ہو گئے۔ اب رابعہ ایک ایسے آدمی کے قبضے میں تھی جو شکل ہی سے چھٹا ہوا لگتا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ بھی کئی روز تک رابعہ کو کھلونا سمجھ کر

اٹھایا۔ کیوں میرے آدمیوں کو پریشان کر رہے ہو؟
”تم شاید لگائے کی بات کر رہے ہو؟“ انپکٹر بولا۔

”ہاں۔“ شارق نے کہا۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ اپنے ذمے کو آگ اسی نے لگائی تھی؟ اور تم کے وہ کون سے دو کیس ہیں جن کا پچھندہ تم اس کے گلے میں فٹ کرنا چاہتے ہو؟“

”پرانے کیس ہیں۔“ انپکٹر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
”اور تمہیں اب خیال آیا ہے کہ گاما اس میں فٹ ہو سکتا ہے۔“ شارق نے اسے گھورا۔

”کوئی کیس کسی بھی وقت رخ بدل سکتا ہے۔“ انپکٹر نے کہا۔
”بتر ہے کہ اس کیس کا رخ ایک بار پھر بدل دو۔“ شارق نے اس کے چہرے پر نظریں

جاتے ہوئے کہا۔ ”مانجھے گجر کے پیچھے لگ کر تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ اس کے خلاف قتل کے کتنے کیس ہیں۔ اسی کو اپنے کسی کیس میں فٹ کیوں نہیں کر لیتے۔“

”بات کسی کو کسی کیس میں فٹ کرنے کی نہیں ہے شارق باؤ۔“ انپکٹر نے جواب دیا۔
”قانون کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور.....“

”قانون کے تقاضے۔“ شارق نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ٹھیک ہے۔ گاما باہر گاڑی میں بیٹھ

ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر قانون کے تقاضے پورے کر لو۔ پھر میں بھی رابعہ کو عدالت میں پیش کر کے قانون کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس وقت کوئی اعتراض مت کرنا۔“

”رابعہ!“ یہ نام سنتے ہی انپکٹر کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ ”تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“
”وہ سب کچھ جانتا ہوں جو اس کے ساتھ ہو چکا ہے۔“ شارق نے معنی خیز انداز میں

مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ رابعہ اس وقت کہاں ہے اور اس معاملے میں کون کون ملوث ہے۔“

انپکٹر کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ شارق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ ر کا کیس کراچی جانے سے دو تین روز پہلے ہی اس کی نظروں میں آیا تھا۔ لیکن یہ بات اس نے اپنے سینے میں چھپائے رکھی تھی۔

رابعہ کے ایک کالج کی تھریڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ بیس ایکس سال کی ایک بے حد حسین لڑکی تھی۔ دراز قامت ہونے کی وجہ سے اس کے حسن میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ باہر نامی کار

کے ایک اسٹوڈنٹ سے اس کا معاشرہ چل رہا تھا۔ باہر کا ماموں الطاف لاہور میں ایک فلم کمپنی میں ملازم تھا لیکن باہر نے اپنے دوستوں کو یہ تاثر دے رکھا تھا کہ اس کا ماموں اس فلم کمپنی کا مالک

اس سے کھیلتا رہا۔ کچھ اور لوگ بھی آکر داو عیش دیتے رہے۔ اور پھر راجہ پر یہ سنسنی بڑھنے لگی۔ اس نے اپنے قہرے کا پتہ چلا تھا اور اب وہ انسپکٹر کو اسی راجہ کے حوالے سے بلیک میل کرنے کو شش کر رہا تھا۔

چند روز انٹوری باغ میں رکھنے کے بعد راجہ کو اچھرے کے ایک بد معاش کے ہاتھ میں ہزار روپے فروخت کر دیا گیا۔ راجہ تقریباً پندرہ دن اچھرے کے ایک مکان میں مختلف لوگوں کی ہوس نشاندہی رہی پھر مزنگ میں رہنے والی روپی نامی ایک عورت نے اسے پچیس ہزار میں خرید لیا۔ وہ خود بھی دھندہ کرتی تھی اور بڑے بڑے لوگوں کو لڑکیاں سپلائی کرتی تھی۔

راجہ نے دوسرے دن روپی کے مکان سے بھاگنے کی کوشش کی مگر روپی نے اسے گلی ہی میں پکڑ لیا۔ راجہ نے شور مچا دیا تھا۔ اگرچہ روپی کے آدمی اسے پکڑ کر دوبارہ مکان میں لے گئے۔ لیکن بات لوگوں کی نظروں میں آ گئی تھی۔ اور اس طرح تھانے تک بھی اطلاع پہنچ گئی تھی۔ انسپکٹر نے اپنے چند آدمیوں کے ساتھ مکان پر چھاپہ مارا۔ ایک گھنٹے بعد انسپکٹر جب مکان کے باہر نکلا تو پانچ چھ آدمی مکان کے سامنے گلی میں جمع تھے۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر انسپکٹر سے لڑی کے بارے میں دریافت کیا تو انسپکٹر نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”کوئی معاملہ نہیں ہے۔ تم لوگ تو بات کا پتلا بنا لیتے ہو۔ یہ ان کا گھریلو معاملہ ہے لڑکی کے ہاں مسمان آئی ہوئی ہے۔ اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ یہ لوگ اسے علاج ہی کے یہاں لے کر آئے ہیں۔ ذہنی توازن درست نہ ہونے کی وجہ سے ہی وہ گھر سے نکل گئی تھی۔ لوگ حیرت سے انسپکٹر کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن ظاہر ہے کوئی شخص اس کے مقابلے نہیں آ سکتا تھا۔

لیکن اس روز کے بعد محلے کے لوگوں نے اکثر اس انسپکٹر کو رات کے وقت سادہ کپڑوں میں روپی کے مکان میں آتے دیکھا تھا اور پھر یوں ہوا کہ روپی کا ایک گاہک راجہ کو لے اڑا۔ وہ زمیندار کا بیٹا تھا راجہ اسے پسند آ گئی تھی اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ روپی نے ان غنڈوں کے ذریعے اس زمیندار زادے کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن زمیندار نے دھمکی دی تھی کہ وہ راجہ کو بھول کر خاموش بیٹھے رہیں بصورت دیگر وہ ڈی آئی سے مل کر ان کے خلاف کارروائی کرائے گا۔ اس طرح راجہ والا معاملہ وہیں پر ختم ہو گیا تھا۔

شارق کو یہ سب کچھ سہیل سے معلوم ہوا تھا۔ وہ زمیندار زادہ سہیل کا دوست تھا۔ وہ کو لے کر چند گھنٹے اس کے ریٹورنٹ کے اوپر والے کمرے میں بھی رہا تھا۔ راجہ نے روپی اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ زمیندار زادہ راجہ کو لے کر چلا گیا تھا اور شارق کو

”تم نے تین دن سے اس بیچارے کو نظر بند کر رکھا ہے۔“ شارق نے اس کے چہرے پر یں جملتے ہوئے کہا۔ ”اور وہ بھی ماجھا گجر کے کہنے پر! چھوڑ دو اس بے چارے کو۔“

”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ راجہ.....“

”مھض ایک اندازہ تھا۔ تمہارے اس جملے نے تصدیق کر دی۔“ شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بھابھا گجر جیسے لوگ تمہیں ذلیل کر دیتے ہیں گے۔ ہم سے دوستی رکھو۔۔۔ فائدے میں رہ گے۔۔۔ راجو کو بلاؤ۔ میں اسے ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں۔“

تھانیدار کے منہ سے بے اختیار گمراہ سانس نکل گیا۔ وہ چند لمحے شارق کی طرف دیکھتا رہا پھر ایک کانٹیل کو بلا کر اسے راجو کو لانے کی ہدایت کی۔ اسی لمحہ ایک اور کانٹیل دفتر میں داخل ہوا۔ اس نے پہلے شارق کی طرف دیکھا اور پھر میز کے دوسری طرف جا کر تھانیدار کے کان پر سرگوشی کرنے لگا۔

”مجھے معلوم ہے۔ تم جاؤ۔ اسے چھیننے کی ضرورت نہیں۔“ انسپٹر نے کہا۔ تھوڑی دیر بعد ایک کانٹیل راجو کو لے آیا۔ اس کا حلیہ دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ تیر دن تک اس کی اچھی خاصی خاطر مدارات کی گئی تھی۔

”شکریہ انسپٹر۔“ شارق کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اس تعاون کا بہت بہت شکریہ! میں یقین دلاتا ہوں کہ مجھ سے دوستی کر کے تم گھائے میں نہیں رہو گے۔ چلو راجو۔“ اس نے راجو کا اشارہ کیا۔

وہ دونوں تھانے سے باہر آ گئے۔ جب گاڑی کے قریب پہنچے تو گاما، شارق کے ساتھ راجو کو دیکھ کر چونک گیا۔

”اوئے راجو تم! گاما نے کہا۔“ تم سرکاری مہمان بنے ہوئے تھے اور میں تمہیں پتہ نہیں کہاں کہاں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔“

راجو بھی پچھلی سیٹ پر نوکھا اور گامے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ شارق نے اسٹیرنگ سنبھال لیا اور گاڑی حرکت میں آ گئی۔

ایک جگہ شارق نے گاڑی روک لی اور ٹینے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ٹینے! تم راجو اور گامے کو لے کر اقبال ٹاؤن والے مکان پر چلی جاؤ میں اور نوکھا چورنگی کوارٹرز ہو کر آتے ہیں۔ دیر ہو جائے تو پریشان مت ہونا۔“

وہ تینوں کار سے اتر کر قریب کھڑی ہوئی ایک ٹیکسی پر بیٹھ گئے۔ ٹیکسی روانہ ہونے کے بعد شارق بھی کار کو حرکت میں لے آیا۔ چورنگی کوارٹرز تک پہنچنے میں پچیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ شارق کو اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ اگر ٹینے کے باپ نے اسے دیکھ لیا تو اچھا خاصہ ہنگامہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف یہ خطرہ بھی تھا کہ نوکھا نہ پہچان لیا جائے۔

شارق نے گاڑی ناصر علی کے کوارٹرز کے دروازے کے سامنے روکی تھی۔ اس وقت ساڑھے

نوج رہے تھے۔ گلی میں اندھیرا ہی تھا۔ نوکھا نے کار سے اتر کر مکان کے دروازے کی گھنٹی بجا دی۔ صرف ایک منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ ناصر علی کی نوجوان بھتیجی تھی۔ نوکھا کو دیکھ کر اس نے سلام کیا اور راستے سے ہٹ گئی۔ نوکھا اندر چلا گیا۔

شارق کار میں بیٹھا رہا۔ اس نے کار کی تمام بتیاں بجھا رکھی تھیں۔ نوکھا کے اندر جانے کی بعد کچھ دیر تک اندر سے رونے دھونے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں پھر خاموشی چھا گئی۔

نوکھا تقریباً ایک گھنٹے بعد باہر آیا تھا۔ اس کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں۔ وہ شارق کو لے کر کوارٹر کے پچھلی طرف سے بیٹھک میں آ گیا۔ اندر بہت سے مہمان آئے ہوئے تھے۔ کلثوم بیٹھک میں آ گئی۔ شارق نے پہلے اس سے تعزیت کی پھر صورت حال دریافت کرنے لگا۔ کلثوم نے بتایا کہ کئی روز پہلے رات کے وقت دو تین آدمی آئے تھے۔ انہوں نے ناصر علی کو باہر بلایا اور کار میں ڈال کر لے گئے۔

کلثوم، آدھی رات تک ناصر کا انتظار کرتی رہی پھر پڑوسیوں کو بلا کر اس کے بارے میں بتایا۔ دوسرے دن بھی ناصر علی کو تلاش کیا جاتا رہا۔ پھر تھانے میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دی گئی لیکن ناصر علی کا کوئی پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں غائب ہو گیا تھا اور بالآخر اسے پولیس کے ذریعے اس کی موت کی اطلاع ملی تھی۔

”آپ نے پولیس میں ناصر کی گمشدگی کی رپورٹ کب لکھوائی تھی؟“ شارق نے پوچھا۔

”دوسرے دن شام کو۔“ کلثوم نے جواب دیا۔ ”گھنٹی بجتے پر انہوں نے جا کر دروازہ کھولا۔

کچھ دیر دروازہ پر ہی باتوں کی آواز سنائی دیتی رہی پھر ناصر ان کے ساتھ ہی چلے گئے۔ میں سمجھی کوئی دوست ہوں گے جن کے ساتھ چلے گئے ہیں لیکن آدھی رات گزر گئی تو میں نے پڑوسیوں کو جگایا۔ کالونی ہی میں ناصر کے ایک دو دوستوں کے گھروں میں جا کر معلوم کیا لیکن وہ کسی کے گھر

میں نہیں تھے۔ دوسرے دن بھی انہیں تلاش کرتے رہے۔ مگر کہیں سے کوئی پتہ نہیں چلا تو شام کو پولیس میں رپورٹ درج کروا دی۔“

”اس کا مطلب ہے آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا تھا جو ناصر کو بلانے آئے تھے؟“ شارق نے پوچھا۔

”نہیں، میں تو باہر ہی نہیں گئی تھی۔“ کلثوم نے جواب دیا۔ ”جب بہت دیر گزر گئی تو میں نے باہر جا کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں دروازہ بھڑکے واپس آ گئی۔“

”ٹھیک ہے کلثوم بہن۔“ شارق کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ ”پولیس، بھائی ناصر علی کے قاتلوں کا سراغ نہیں لگا سکے گی اور نہ ہی وہ سراغ لگانا چاہے گی۔ قاتلوں کا سراغ ہم لگائیں گے۔ انہیں

آپ کے قدموں پر لا کر ڈالیں گے اور پھر جو سزا آپ تجویز کریں گی انہیں وہی سزا دی جائے گی۔“

”کیا تم ان کے بارے میں جانتے ہو؟“ کلثوم جلدی سے بولی۔ ”تمہیں معلوم ہے وہ کون لوگ تھے؟“

”پتہ چلا لیں گے۔“ شارق بولا۔ ”دو تین دن میں ان کا پتہ چل جائے گا۔“

”اچھا کلثوم بہن اب میں چلتا ہوں۔ پھر آؤں گا۔“ نوکھانے کہا۔ وہ دونوں کلثوم بہن کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے بیٹھک کے دروازے سے باہر آ گئے۔

وہ دونوں ہلاک کے اوپر سے گھوم کر گاڑی میں آ گئے۔ نوکھا پنجر سیٹ پر بیٹھ گیا اور شارق نے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ کچھ ہی دیر بعد ان کی کار کالونی کے گیٹ سے نکل رہی تھی۔ سڑک پر اس وقت زیادہ ٹریفک نہیں تھا لیکن شارق نے رفتار کم ہی رکھی تھی۔

”تمہارے خیال میں وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں شارق باؤ؟“ نوکھانے پوچھا۔

”ماجھا گجر یا اس کے آدمیوں کے علاوہ اور کون ہو سکتے ہیں۔“ شارق نے جواب دیا۔

”لیکن ماجھا گجر کا ناصر سے کیا تعلق؟“ نوکھانے کہا۔

”ماجھا گجر کا ثینہ کے باپ سے بھی کوئی تعلق نہیں تھا لیکن وہ ان کے گھر پہنچ گیا تھا۔“

شارق نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ نوکھانے اسے گھورا۔

”میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا۔“ شارق نے کہا۔ ”ماجھا گجر بہت خبیث آدمی ہے۔ اس کے

جسم میں کوئی بدروح حلول کر گئی ہے۔ اس نے کسی طرح ثینہ کے گھر والوں کے بارے میں

معلوم کر لیا تھا اور پھر ایک دن وہ اس کے باپ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس سے ہمدردی جتا کر یہ کہا

تھا کہ ثینہ میرے قبضے میں ہے اور یہ کہ میں دنیا کا سب سے بڑا بد معاش ہوں۔ ماجھا گجر نے ثینہ

کے باپ کو یہ لالچ دیا تھا کہ اگر وہ ان لوگوں سے تعاون کرے تو ثینہ کا پتہ چلا جا سکتا ہے۔ ثینہ

کے باپ ہی سے اسے پتہ چلا ہو گا کہ ثینہ نے وہ رات ناصر علی کے گھر میں گزار دی تھی۔ اسے یہ

بھی پتہ چل گیا کہ ثینہ کو وہاں لانے والا نوکھا یعنی تم تھے۔ اسے یہ یقین ہو گیا ہو گا کہ ناصر علی

سے تمہارا کوئی رشتہ ضرور ہے اور ناصر علی تمہارے ٹھکانے کے بارے میں جانتا ہو گا۔ وہ تمہارے

ذریعے مجھ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اور تمہارے بارے میں معلوم کرنے کے لئے اس نے ناصر علی کو

اغواء کیا اور اسے تشدد کا نشانہ بنایا۔ جب تمہارے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تو اسے مار کر

لاش نہر میں پھینک دی۔“

”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ نوکھانے دانت کچکچائے۔

”اسے ہاتھ لگ جانے دو۔ پھر دیکھو اس کا حشر کیا کرتا ہوں۔“ شارق نے کہا۔

چورہتی کوارٹرز سے نکلنے کے بعد وہ سیدھا گوالمنڈی پہنچ گئے۔ حسب معمول چوک پر خاصی

روشن تھی۔ مولوی حمید کی چائے کی دکان کے سامنے بھی فٹ پاتھ پر سارے بچے بھرے ہوئے

تھے۔ مولوی حمید خود اپنے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا تھا اور دو ملازم لڑکے گاہکوں کو چائے دے رہے

تھے۔

شارق نے گاڑی سڑک کے دوسری طرف روکی تھی۔ اس نے گاڑی کے اندر کی بنیاں بجھا

دی تھیں اور انجن بھی بند کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک مولوی حمید کی چائے کی دکان کی طرف دیکھتا

رہا پھر ایک لڑکے کو آواز دے کر قریب بلا لیا۔ مولوی حمید نے یہ لڑکا غائباً بنا ملازم رکھا تھا۔ اور

ظاہر ہے وہ شارق کو نہیں پہچانتا تھا۔

”بی باؤ جی؟“ لڑکے نے قریب آ کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ چائے لے کر آؤ۔۔۔ اچھی سی ملائی والی۔“ شارق نے کہا۔

”ابھی لایا جی۔“ لڑکا تیزی سے واپس چلا گیا۔

لڑکے نے مولوی حمید سے جا کر چائے کے لئے کہا۔ ساتھ ہی اس نے کار کی طرف اشارہ

بھی کیا تھا۔ مولوی حمید نے کار کی طرف دیکھا۔ مگر وہ کار میں اندھیرا ہونے کے وجہ سے شارق کو

نہیں دیکھ سکا۔ ویسے بھی شارق کا رخ اس وقت نوکھا کی طرف تھا۔ کچھ دیر بعد لڑکا دو کپ چائے

لے آیا۔ اوپر موٹی بالائی تیر رہی تھی۔ شارق نے ایک کپ لے کر نوکھا کے ہاتھ میں تھما دیا اور

ایک کپ خود لے لیا۔ اس وقت بھی وہ مولوی حمید کی طرف سے رخ موڑے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ چائے پینے کے بعد شارق نے ایک بار پھر لڑکے کو

آواز دے کر بلا لیا۔ دونوں خالی کپ اس کے حوالے کئے اور پچاس کا نوٹ لڑکے کے ہاتھ میں

تھمتے ہوئے بولا۔

”وہ کاؤنٹر کے پیچھے مولوی کھڑا ہے نا اس سے کہنا باقی پیسے خود لے کر آئے۔“

”اچھا جی۔“ لڑکا کہتے ہوئے چلا گیا۔

لڑکے نے جب مولوی حمید کو پچاس کا نوٹ دیتے ہوئے شارق کی بات کہی تو مولوی حمید نے

چونک کر کار کی طرف دیکھا۔ اس نے پچاس کا نوٹ پٹی میں رکھا اور باقی پیسے لے کر دکان سے

نکل کر کار کی طرف آ گیا۔ شارق کا رخ اس وقت بھی دوسری طرف تھا۔ لیکن شارق نے جیسے ہی

سیٹ پر رخ بدلا مولوی حمید چونک گیا۔

”شارق باؤ تم؟ واپس کب آئے؟“

”کل آیا تھا۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”کو دھندہ کیسا چل رہا ہے؟“

”دھندہ تو ٹھیک ہی ہے لیکن ماجھا گجر بری طرح سے ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔“ مولوی حمید نے کہا۔ ”اسے یہ نہیں پتہ تم شر سے باہر گئے ہو لیکن تم چونکہ سامنے نہیں آ رہے وہ اور بھی شیر ہو گیا ہے۔ راجو تین دن سے غائب ہے اور شاید اسی کے قبضے میں ہے۔ اس نے گائے کے پیچھے بھی پولیس کو لگا دیا ہے۔“

”راجو بھی مل گیا ہے اور پولیس نے بھی گائے کا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔“ شارق نے کہا۔

”کیا واقعی؟“ مولوی حمید چونک گیا۔

”ہاں۔ ہم اس وقت دونوں کو گھر بھیج کر آئے ہیں۔“ شارق نے جواب دیا۔

”مجھے گجر کا کوئی بندوبست کرنا ہی پڑے گا شارق باؤ۔“ مولوی حمید نے کہا۔ ”اس کا ایک

آدی ہر وقت یہاں موجود رہتا ہے۔ ماجھا تھماری تلاش میں پاگل ہو رہا ہے۔ اس وقت بھی اس کا کوئی نہ کوئی آدی یہاں موجود ہو گا۔“

”میں یہیں کھڑا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ کر مجھے بتاؤ کہ وہ کون ہے۔ بلکہ یوں کرو کہ

تقریباً دس منٹ بعد دو چائے اور بھیج دینا۔ دوسرے لڑکے کے ہاتھ سے بتا دینا کہ وہ اس آدی کی نشاندہی کر دے۔ آگے میں منٹ لوں گا۔“ شارق نے کہا۔

مولوی حمید واپس چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ٹھیک دس منٹ بعد اس نے دوسرے لڑکے کے ہاتھ چائے کے دو کپ بھیج دیئے۔

”پان کے کھوکھے کے پرلی طرف دو آدی کھڑے ہیں ان میں جس نے کالے کپڑے پہن

رکھے ہیں وہی آدی ہے۔“ لڑکے نے چائے کے کپ شارق کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ یہ لڑکا

مولوی حمید کا پرانا ملازم تھا اور شارق کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ تھوڑی دیر بعد آ کر کپ لے جانا۔“ شارق نے کہا۔

لڑکے کے جانے کے بعد وہ دونوں چائے پینے لگے۔ چائے پینے کے بعد شارق نے دوسرے

لڑکے کو بلا کر خالی کپ اس کے حوالے کر دیئے اور نوکھاکا طرف دیکھنے لگا۔ نوکھاکا سے اتر گیا

اور ادھر ادھر دیکھے بغیر پان سگریٹ کے کھوکھے کے قریب پہنچ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر

پچاس کا نوٹ نکالا اور گولڈ لیف کا پیکٹ خرید کر باقی پیسے جیب میں رکھتے ہوئے کالے کپڑوں والے

کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے کالا کرتا اور کالا لچہ پہنا ہوا تھا۔ سر پر غنڈوں کی طرح مفلر لپٹا ہوا

تھا۔ اس کا رخ بھی کالی تھی۔ اور کالے لباس کی وجہ سے وہ کوئی بھٹتا ہی لگ رہا تھا۔ ار

نے بھی نوکھاکا کی طرف دیکھا تھا لیکن توجہ نہیں دی تھی۔ وہ یقیناً نوکھاکا کو نہیں پہچانتا تھا۔

”پہلوان جی!“ نوکھاکا اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہاں سے بانسوں والے بازار کا راستہ کس طرف سے نکلتا ہے۔“

کالے کپڑے والے نے ہاتھ اٹھا کر ایک طرف اشارہ کیا اور اسے راستہ سمجھانے لگا۔

”یار میں تو پردہسی ہوں۔ میرے ڈرائیور کو ذرا سمجھا دے۔“ نوکھاکا نے کار کی طرف اشارہ

کیا۔

کالے کپڑوں والا اس کے ساتھ کار کی طرف آگیا اور پھر کھڑکی پر جھک کر جیسے ہی وہ کچھ

کہنے لگا اسٹیرنگ کے سامنے شارق کو دیکھ کر اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

”خاموشی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ جا۔ ورنہ تیری گردن مروڑ دوں گا۔“ نوکھاکا کے حلق سے

ہلکی سی غراہٹ نکلی۔

اس شخص کے منہ سے بے اختیار گھرا سانس نکل گیا۔ اس نے کوئی مزاحمت کرنے کی کوشش

نہیں کی بلکہ پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ نوکھاکا نے بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر دروازہ بند کر

لیا۔ شارق فوراً ہی گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔ نوکھاکا نے بڑی پھرتی سے اس شخص کا لباس

تھمتپا کر قیض کے نیچے چھپا ہوا پستول نکل لیا تھا۔

”ہاں۔ اب بتا راستہ۔ کس طرف جانا ہے ہمیں۔“ نوکھاکا نے پستول اس کے پہلو سے لگاتے

ہوئے کہا۔

”مم۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔ تم لوگ کون ہو اور مجھے اس طرح دھوکے سے کیوں پکڑا ہے۔“ وہ

شخص خوفزدہ لہجے میں بولا۔

”دھوکے باز تو تیرا گرو ہے ماجھا گجر۔“ نوکھاکا نے کہا۔ ”چوروں کی طرح چھپ چھپ کر

دارداتاں کرتا ہے۔ ہم تو کھرے آدی ہیں۔ دیکھ لے تجھے کس طرح بھرے بازار سے اٹھا لائے

ہیں۔ اس میں دھوکے والی تو کوئی بات نہیں ہوئی تہ بہت سے آدمیوں نے ہمیں دیکھا ہے۔“

”مگر تم لوگ ہو کون؟ مجھے اس طرح پکڑ کر کہاں لے جا رہے ہو؟“ وہ شخص بولا۔

”پہلے اپنا نام تو بتا کہ بات کرنے میں آسانی رہے۔“ نوکھاکا نے کہا۔

”مم۔ میرا نام شوکا ہے۔ میرا مطلب ہے شوکت۔ گھر والے مجھے بچپن میں پیار سے شوکا

کہا کرتے تھے۔ اب یہی نام مشہور ہو گیا ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”چلو! کوئی بات نہیں۔ ہم بھی تمہیں پیار سے شوکا ہی پکاریں گے۔ لیکن پہلے یہ بتا کہ اس

میں کوئی گولی شولی بھی ہے یا نہیں۔“ نوکھاکا کہتے ہوئے پستول کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

شاندار کار دیکھ کر بعض لوگوں نے نوکھا کی اس بات پر یقین کر لیا تھا کہ شوکا ان کا گھریلو ملازم تھا اور ان کی کوشی سے نقدی اور زیورات لے کر بھاگا ہوا تھا۔ کیونکہ نوکھا جب شوکے کو کار میں ٹھونس رہا تھا تو اس نے ایک آدمی کو کہتے سنا تھا۔

”جب یہ زیورات اور رقم لے کر بھاگا تھا تو اس وقت اس نے نہیں سوچا تھا کہ ایک دن پکڑا بھی جائے گا۔ ایسے نمک حراموں کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔“

تین چار آدمی کار کے قریب بھی آگئے تھے۔ شارق نے نوکھا اور شوکے کے بیٹھے ہی جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اشارت کیا اور کار جلدی سے آگے بڑھا دی۔

”لوگوں نے کوئی مداخلت تو نہیں کی۔“ شارق نے سامنے لگے ہوئے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں نوکھا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کوئی مائی کا لال آگے نہیں آیا۔“ نوکھا نے جواب دیا۔ ”ایک آدمی نے پوچھا تھا کہ میں اس غریب کو کیوں مار رہا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ یہ ہمارے گھر کا نوکر ہے۔ تین مہینے پہلے لاکھوں روپے کے زیور اور نقد رقم لے کر بھاگ گیا تھا آج پکڑا گیا ہے۔ اس کے بعد کسی نے کچھ نہیں کہا۔“

”میں تو تمہیں زرا گاؤدی سمجھتا تھا۔“ شارق نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”لیکن وقت پڑنے پر تم ایسی ذہانت کا ثبوت دیتے ہو کہ حیرت ہوتی ہے۔“

”وقت ہی سب سے بڑا استاد ہے شارق باؤ۔ سب کچھ سکھا دیتا ہے۔“ نوکھا نے جواب دیا اور پھر شوکے کی گردن پر زور دار گھونہ مارتے ہوئے بولا۔ ”کیوں اوئے بے غیرت! یہ کیا حرکت کی تھی تو نے۔۔۔ کیا تو یہ سمجھتا تھا کہ لوگ تمہیں بچالیں گے۔“

”مم۔۔۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے چھوڑ دو۔“ شوکا گھکیلیا۔

”تمہیں چھوڑ ہی دیں گے۔ ہم نے تمہارا اچار ڈالنا ہے۔“ نوکھا نے کہا۔

شارق نے کار کی رفتار تیز کر دی تھی۔ نوکھا نے جیب سے پستول نکال لیا تھا۔

”اب اگر تم نے پہلے جیسی حرکت کی نا تو اس مرتبہ میں تمہیں پکڑنے کی کوشش نہیں کروں گا بلکہ تمہارے ہی پستول کی گولی تمہارے جسم میں اتار دوں گا۔“

شوکا سٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ خوفزدہ تھا۔ سکیم موڑ کے قریب پہنچ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ نوکھا اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے شوکے کو گردن سے پکڑ کر نیچے کر دیا۔

”نیچے ہو کر بیٹھ اوئے۔“ اس کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ”کسی جاننے والے نے تمہیں

کھش کی مگر اس مرتبہ نوکھا نے اسے چھاپ لیا اور دو چار گھونے اس کی گردن اور پسلیوں پر ٹکا دیئے۔

شوکا بری طرح چیخ رہا تھا۔ ہوٹل کا مالک اور تین چار گاہک دوڑتے ہوئے وہیں پہنچ گئے۔ مگر وہ سب دروازے ہی میں رک گئے تھے۔ اندر گھسنے کی کوشش کسی نے نہیں کی تھی۔

”کیا بات ہے بھئی؟ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کون ہو تم لوگ؟“ ہوٹل کا مالک چیخا۔

”مجھے بچاؤ۔۔۔ خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔۔۔ یہ لوگ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔“ شوکا چیخا۔

”کیا بات ہے پہلوان جی۔ کیوں مار رہے ہو بچارے کو۔ کیا کیا ہے اس نے؟“ کچن کے دروازے پر کھڑے ہوئے ایک آدمی نے پوچھا۔ وہ کوئی گاہک تھا۔

”نوکر ہے ہمارا۔“ نوکھا نے جواب دیا۔ ”تین مہینے پہلے کوشی سے لاکھوں روپے کے زیور اور نقد رقم لے کر بھاگ گیا تھا۔ کہاں کہاں تلاش نہیں کیا ہم نے اس نمک حرام کو۔ آج اتفاق سے نظر آگیا۔“

”یہ۔۔۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ شوکا چیخا۔ ”یہ لوگ مجھے گوانڈی سے اٹھا کر لائے ہیں۔ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔“

”چپ اوئے!“ نوکھا نے اس کے منہ پر زور دار تھپڑ رسید کر دیا۔ اور پھر اسے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹا ہوا کچن سے باہر لے آیا۔

شوکا اب بھی چیخ رہا تھا۔ ہوٹل کے تقریباً سارے ہی گاہک اپنی کرسیاں چھوڑ کر ان کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ کچھ لوگ ہوٹل کے باہر بھی جمع تھے۔

”مجھے بچاؤ۔ خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔ یہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے۔“ شوکا لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

نوکھا نے اسے دو چار ہاتھ اور جڑ دیئے۔ لوگوں میں سے کسی نے آگے آنے کی ہمت نہیں کی تھی ہوٹل کا مالک پریشان کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کچن میں ان دونوں کی دھینگا مشتی سے اچھے خاصے برتن ٹوٹ گئے تھے۔ لیکن اس نے اپنے نقصان پر صبر کر لیا تھا۔ وہ نوکھا کے ڈیل ڈول سے ویسے ہی خائف ہو گیا تھا۔

نوکھا جب شوکے کو گریبان سے پکڑے گھسیٹا ہوا ریٹورنٹ سے باہر نکلا تو شارق بھی کار ایک طرف کھڑی کر کے نیچے اتر آیا تھا۔ شوکا اب بھی لوگوں کی منت سماجت کرتے ہوئے چیخ رہا تھا کہ اسے ان قاتلوں سے بچایا جائے۔ شارق نے بھی آگے بڑھ کر اس کے دو چار ہاتھ جڑ دیئے۔

چلے گا۔

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔“ شوکے نے کہہ

”اگر تم وہ نہیں ہو تو کار سے بھاگے کیوں تھے؟“ نوکھانے اسے گھورا۔

”تم لوگ مجھے زبردستی اٹھا کر لائے ہو۔ پتہ نہیں میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے۔ میں اسی لئے بھاگتا تھا۔“ شوکے نے جواب دیا۔

نوکھانے اچانک ہی اس کے منہ پر زور دار گھونبہ مار دیا۔ گھونبہ شوکے کے منہ پر بالکل سامنے لگا تھا۔ اس کا اوپر کا ایک دانت ٹوٹ گیا۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکری کی طرح ہلبلا اٹھا۔ منہ سے خون بہہ نکلا تھا اور جب اس نے تھوکا تو خون کے ساتھ دانت بھی باہر کر گیا۔

”ابھی تو صرف ایک دانت ٹوٹا ہے۔“ نوکھانے غریبا۔ ”میں تو تمہاری ساری ہڈیاں توڑ دوں گا۔ تم لوگوں نے میرے بہنوئی کو قتل کیا ہے۔ اس کی لاش کئی روز تک نہر میں پڑی سڑتی رہی۔ میں تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایک ایک کو ختم کر دوں گا۔ بتاؤ ماجھا کب تک رہا ہے؟“

”مم۔۔۔ میں کچھ نہیں جانتا۔“ شوکا خون تھوکتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارے بہنوئی کو بھی نہیں جانتا۔ تم مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔“

”تم آسانی سے نہیں مانو گے۔“ نوکھانے کہہ کر وہ چند لمبے خانواری نظروں سے شوکے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس پر ہل پڑا۔

شوکے نے شروع میں اپنے آپ کو بچانے کے لئے کچھ مزاحمت کی تھی۔ لیکن نوکھانے پر تو جنون طاری تھا۔ اس وقت اگر اس کے مقابلے میں دس آدمی بھی ہوتے تو وہ ان کی ہڈیاں توڑ ڈالتا۔

شوکا بچنے ہوئے بری طرح ہلبلا رہا تھا اور جب نوکھانے اس کی دائیں ہڈی کی ہڈی توڑی تو اس طرح چیخا جیسے اس کے گلے پر چھری پھیری جا رہی ہو۔ وہ فرش پر چاروں طرف لوٹ رہا تھا۔ اس کی چیخیں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

”میں تمہارے جسم کی ایک ایک ہڈی توڑ دوں گا۔“ نوکھانے چیخا۔ ”بتاؤ ناصر علی کو گھر سے اغواء کس نے کیا تھا اور اسے قتل کس نے کیا تھا؟“

”مم۔۔۔ میں کچھ نہیں جانتا۔“ شوکے نے روتے ہوئے جواب دیا۔

نوکھانے اس کے سینے پر زور دار ٹھوکر ماری۔ شوکا ایک بار پھر چیخا۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا اور پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا مگر نوکھانے اس طرح چھوڑنے والا نہیں تھا۔ وہ پانی کے چھینٹے دے کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

دیکھ بھی لیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کوئی تمہارے پیچھے نہیں آئے گا۔“

مزید چند منٹ بعد کار حویلی کے پھانک کے سامنے رک گئی۔ شارق نے ڈیش بورڈ کے خانے میں سے چابیوں کا گچھا نکالا اور نیچے اتر کر پھانک کے ذیلی دروازے کا تالہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ نوکھانے شوکے کو لے کر کار سے اتر آیا تھا۔ اس نے شوکے کو پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔ وہ اسے لے کر ذیلی دروازے میں داخل ہو گیا۔ شارق بھی گاڑی اندر لانے کے لئے پھانک کھول رہا تھا۔

”پہلے روٹی کھا لیں شارق باؤ۔ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔“ نوکھانے اندر پہنچ کر کہا۔

شارق نے چارپائی پر ہی دسترخوان بچھا کر وہ تھمبلا کھول دیا تھا جس میں کڑا ہٹی گوشت اور بن وغیرہ لے کر آئے تھے۔

”آ جا بھی شوکے پہلوان۔ تو بھی آ جا۔“ نوکھانے چارپائی پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ شوکے نے جواب دیا۔

”میں تمہاری منتا تر لے تو نہیں کروں گا۔ روٹی نہیں کھانی تو اس دیوار کے ساتھ بیٹھ جا۔ چل جلدی کر۔“ نوکھانے سامنے والی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

شوکا دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ شارق اور نوکھانے اطمینان سے کھانا کھاتے رہے۔ کھانے کے بعد کچی کچی چیزیں نوکھانے تھیلے ہی میں سمیٹ دیں۔

”تم اب جاؤ شارق باؤ۔“ نوکھانے کہا۔ ”وہ لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں جا رہا ہوں۔“ شارق نے جواب دیا۔ ”اس سے معلوم کر لیتا کہ ماجھا کھلا ہے اور ناصر علی کو کس نے قتل کیا تھا۔“

”تم فکر ہی مت کرو شارق باؤ۔ میں ایک ایک بات اس کے حلق سے اگوا لوں گا۔“ نوکھانے نے جواب دیا۔

شارق کے جانے کے بعد نوکھانے شوکے کو گھیر لیا۔

”ہاں بھی لٹو کا پہلوان۔“ وہ اس کے چہرے پر نظریں جلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ حویلی تم نے دیکھ لی۔ اس طرف آنے والا راستہ بھی دیکھ لیا۔ آس پاس کوئی مکان نہیں ہے جہاں تمہاری آواز جاسکے۔ تمہاری آواز تو اس کمرے میں سے بھی نہیں نکل سکے گی۔ تو اب تم بتاؤ کیا پروگرام ہے۔ شرافت سے کچھ بتاؤ گے یا تمہارے ساتھ دو دو ہاتھ کرنا پڑیں گے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھ لو کہ تمہارے ٹوٹے کرنے کے بعد میں حویلی کے صحن میں کسی جگہ دبا دوں گا اور کسی کو پتہ نہیں

شوکا تقریباً پندرہ منٹ بعد ہوش میں آسکا تھا۔ نوکھانے اس کے بالوں سے پکڑ کر سر کو ایک جھکے سے اوپر کیا۔

”بتا لوئے! کس نے قتل کیا تھا ناصر علی کو؟“

”ہپ۔۔۔ پانی۔۔۔“ شوکا کے منہ سے مردہ سی آواز نکلی۔

نوکھانے پانی سے بھرا ہوا گلاس اس کے چہرے کے سامنے کر دیا۔

”بتاؤ ناصر علی کو کس نے قتل کیا تھا؟“

”مم۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔۔۔“ شوکا نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

نوکھانے پانی اس کے منہ پر ایڈیل دیا۔ شوکا ہونٹ چاٹنے لگا۔ نوکھانے خالی گلاس ایک

طرف پھینک دیا اور جیب سے چاقو نکال لیا اور اس کا چمکتا ہوا بلیڈ اس کے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔

”میں تمہارے جسم کی ہونیاں کر کے کتوں کو ڈال دوں گا۔ لیکن۔۔۔ تمہیں مرنے نہیں دوں

گا۔۔۔ اس وقت تک مرنے نہیں دوں گا جب تک تم میرے سوالوں کا جواب نہیں دیتے۔“

”مم۔۔۔ میں کچھ نہیں جانتا۔“ شوکا بمشکل بول سکا تھا۔

نوکھانے اسے کے کرتے کے گریبن پر ہاتھ ڈال کر زور سے جھٹکا دیا۔ کرتا پھٹ گیا۔ شوکے

کا سینہ نکلا ہو گیا۔ نوکھانے چاقو کی نوک اس کے سینے پر عین درمیان میں رکھی اور تقریباً تین انچ لمبی لکیر کھینچ دی۔

شوکے کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی۔ اس کے سینے پر تین انچ لمبی لکیر سے خون رسنے لگا۔ وہ

بری طرح تڑپ رہا تھا۔

”تمہارا گلا میں سب سے آخر میں کاٹوں گا۔“ نوکھانے کہا۔ ”تمہارے جسم پر اس طرح کی

لکیریں اس وقت تک کھینچتا رہوں گا جب تک تم کچھ بتاؤ گے نہیں۔“

”بب۔۔۔ بتاتا ہوں۔۔۔“ شوکا ہکھلایا۔ ”پانی۔۔۔ پہلے پانی دو۔۔۔“

”شاباش!“ نوکھانے کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ”یہ ہوئی نا بتا! پہلے ہی زبان

کھول دیتے تو اتنی تکلیف تو نہ اٹھانی پڑتی۔“ اس نے پانی کا گلاس بھر کر شوکا کے ہونٹوں سے لگا

دیا۔

شوکا غٹغٹ پی گیا۔ کچھ پانی اس کے زخمی ہونٹوں سے گر کر ٹھوڑی اور سینے پر بننے لگا تھا۔

”اور پیو گے؟“ نوکھانے پوچھا۔

”بب۔۔۔ بس۔۔۔“ شوکا زور زور سے سر ہلانے لگا۔

”اب بتاؤ کہ ناصر علی کو کس نے قتل کیا تھا؟“ نوکھانے کہا۔

”مم۔۔۔ ماجھا گجر نے۔“ شوکے نے کہا۔ ”اس کے تین چار آدمی بھی ساتھ تھے۔۔۔ مم۔۔۔ میں

نہیں تھا۔ میں اس کارروائی میں شامل نہیں تھا۔۔۔ مجھے ویسے پتہ چل گیا تھا کہ انہوں نے چورہی

کارروائیوں سے کسی کو اٹھایا ہے۔ وہ اس سے شارق کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے۔“

”ماجھا گجر کے ساتھ اس کارروائی میں اور کون کون تھا؟“ نوکھانے پوچھا۔

شوکا چند لمحے خاموش رہا پھر وہ ان لوگوں کے نام بتانے لگا جو ناصر علی کو قتل کرنے کی

کارروائی میں شریک تھے۔

”ماجھا گجر کہاں ہے۔ نہروالی کو بھی پر؟“

”نہیں۔“ شوکا نے جواب دیا۔ ”ناصر کو قتل کرنے کے بعد وہ کیس اور چلا گیا تھا کیونکہ اسے

شبہ تھا کہ جب تم لوگوں کو ناصر کے قتل کا پتہ چلے گا تو تم لوگ کو بھی پر چڑھ دوؤ گے۔“

”اس کا نسبت روڈ والا اڈا ختم ہو چکا ہے۔ نیا اڈا کہاں بنایا ہے اس نے؟ جہاں سے سارے

شر کو مل سلائی کرتا ہے؟“ نوکھانے پوچھا۔

”قلعہ گوجر سنگھ میں۔“ شوکا نے جواب دیا۔ ”وہاں پہلے ہی سے گوگے کا اڈہ موجود ہے۔ ماجھا

گجر نے اسی کو اپنا مرکز بنالیا ہے۔ وہیں سے پورے شر کو ہیروئن کی سلائی ہو رہی ہے۔“

”گوجر۔“ نوکھانے بولا۔ ”اور ہمارے مزنگ والے اڈے کو آگ لگانے کی کارروائی میں کون کون

شامل تھا؟“

”پانچ آدمی تھے جن میں میں بھی تھا۔“ شوکا نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے شوکا پہلوان۔“ نوکھانے کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”مولوی حمید کے ہوٹل کے

پاس کیوں کھڑے تھے؟“

”نگرانی کے لئے۔“ شوکے نے جواب دیا۔ ”ماجھے گجر کو شبہ ہے کہ شارق مولوی حمید سے

ملنے کے لئے ضرور آتا ہو گا۔ میں اسی لئے وہاں کھڑا نگرانی کر رہا تھا۔“

”تو شارق کو تم نے دیکھ لیا۔“ نوکھانے لہجہ بے حد معنی خیز تھا۔ اس نے چاقو بند کر کے جیب

میں رکھ لیا۔

”مم۔۔۔ مجھے ہسپتال لے چلو۔۔۔“ شوکا کراہا۔ اس کے چہرے پر کرب و اذیت کے بے پناہ

اثرات تھے۔ ”مجھے شدید تکلیف ہو رہی ہے۔ خدا کے لئے مجھے ہسپتال لے چلو۔“

”تمہیں تکلیف ہو رہی ہے نا؟“ نوکھانے اسے گھورا۔

”ہاں۔ خدا کے لئے مجھے ہسپتال لے چلو۔“

”میں تمہیں اس تکلیف سے نجات دلا سکتا ہوں۔“ نو لکھانے معنی خیز لہجے میں کہتے ہوئے جیب سے پستول نکال لیا۔

”یہ کیا۔۔۔“

شو کا کاجزہ مکمل نہیں ہو سکا۔ کمرے میں ڈز کی آواز ابھری۔ پستول سے نکلنے والی گولی شو کے کی پیشانی میں پوست ہو گئی۔

نو لکھا چند لمحوں شو کے کی لاش کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس نے پھلوڑا اٹھایا اور حویلی کی یوار کے قریب گڑھا کھودنے لگا۔



بقیہ واقعات جاننے کے لئے ”دولت کے پجاری“ کے چوتھے حصے کا مطالعہ کریں۔